نمرہ احمد کہتی ہیں

"قراقرم کا تاج محل" میری زندگی کا سب سے مشکل ناول ثابت ہوا۔ مجھے اس میں ایک بہت مشکل موضوع کو بہت عام فہم بنا کر لکھنا تھا۔ یہ تھی بھی ایک سچی کہانی' میرے پاس ردوبدل کی گنجائش بہت کم تھی۔ دوسرا میں ردوبدل کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ میرا خیال ہے جو مزا ایک سچی کہانی کو پڑھنے میں آتا ہے' وہ فرضی داستانوں میں نہیں ہوتا۔ سچی کہانیوں کا لطف ہی اور ہوتا ہے۔ آپ کو وہ کردار اپنے قریب نظر آتے ہیں' بہت اپنائیت ہوتی ہے ان میں۔ مجھے خود بھی سچی کہانیاں لکھنے کا خاصا شوق ہے۔ اس سے پہلے "پہاڑی کا قیدی" لکھی تھی مگر بے حد ردوبدل کے ساتھ۔ اس دفعہ البتہ میں نے نام تک نہیں بدلے' میں اس کو جیسی تھی' ویسی ہی لکھنا چاہتی تھی' شاید اسی لیے میرا یہ خیال تھا کہ میں اسے نہیں لکھ پاؤں گی۔ یہ کہانی پچھلے ڈھائی برس سے میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی مگر میرے اندر سچ پوچھیں تو لکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ پھر اگست میں میں نے جب اسے لکھنا شروع کیا تو روز ایک پیرا لکھ کر چھوڑ دیتی تھی' میرا خیال تھا' یا پھر ڈر تھا کہ میں اسے کبھی بھی لکھ نہیں پاؤں گی۔ مجھے کوئی بھی کام کرنے کے لیے ڈھیر ساری حوصلہ افزائی اور تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ "قراقرم کا تاج محل" کے لیے مجھے تحریک ملی تھی توماز ہیومر سے۔ میں توماز ہیومر کی بہت بڑی پرستار ہوں' پچھلی دفعہ جب وہ پاکستان آیا تھا تو اس کی شوکت عزیز کے ساتھ ایک تصویر چھپی تھی' وہ تصویر میں نے بہت عرصے تک اپنے لیپ ٹاپ کے بیک گراؤنڈ پر لگائے رکھی میں شاید وہ واحد پاکستانی تھی جس نے 2005ء میں توماز کے زندہ بچ جانے کے لیے بہت دعائیں کی تھیں۔ مجھے توماز جیسے حقیقی زندگی کے ہیروز بہت اچھے لگتے ہیں۔ یقین کریں اگر اس سال وہ پاکستان نہ آتا تو شاید مجھے یہ ناول لکھنے کی توانائی اور جذبہ کبھی نہ ملتا۔

اب بات کرتی ہوں اپنے ناول کی۔ بات عادتاً "لمبی ہی کروں گی' کیونکہ مجھے سمندر کو کوزے میں بند کرنا نہیں آتا۔

اس کہانی کو لکھنے سے پہلے میں نے ایک ارادہ کیا تھا۔ مجھے ایک بات بہت دنوں سے کھٹک رہی تھی' مجھے کچھ عرصے سے محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا ڈائجسٹ میں ایک ٹرینڈ بنتا جا رہا ہے۔ "انگریزی کمپلیکس" مطلب جو رائٹر اپنے ناول میں جتنی انگریزی لکھے گی' وہ اتنی ہی تعلیم یافتہ لگے گی۔ دیکھیں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے ہاں رائج ہو چکے ہیں' ایسے الفاظ کی تو خیر ہے' ڈائیلاگ کی بھی خیر ہے کیونکہ یہ تو ایک کردار کی زبان اور لب و لہجے کی عکاسی کرتا ہے' مگر بیانیہ میں غیر ضروری انگریزی الفاظ لکھنا مجھے غلط لگتا ہے۔ خود اگر اردو میں انگریزی لکھ دیتی تو ساتھ امتل کو ایک سو پچاس ایس ایم ایس بھی کرتی تھی کہ اس کو ترجمہ کر کے لکھ دیجئے گا کیونکہ میرے لیے یہ ایک شرم کی بات تھی کہ میرا قاری کیا کہے گا' اس لڑکی کی اردو اتنی خراب ہے؟ مجھے بہت بعد میں جا کر احساس ہوا کہ جس چیز پر میں اتنی شرمندہ ہوتی تھی' وہ ایک ٹرینڈ بن گیا ہے۔ میرا خیال ہے اب اس ٹرینڈ کو ہمیں توڑنا ہوگا کیونکہ ہم رائٹرز کے بارے میں ہی طارق اسمٰعیل ساگر نے لکھا تھا۔

"خواتین رائٹرز جو انفرادیت ظاہر کرنے کے لیے جا بجا انگریزی الفاظ کا استعمال کرتی ہیں۔"

اب اس کے بعد اب آگے کیا رہ جاتا ہے؟

میرا نہیں خیال کہ اگر میں علم رکھتی ہوں تو مجھے اس کا اظہار یوں کرنا چاہیے' یاد رکھیے گا' ہمیشہ خالی برتن ہی سب سے زیادہ شور پیدا کرتے ہیں۔ مجھے اس غلطی کا جیسے ہی احساس ہوا' میں نے اعتراف کر ڈالا کیونکہ میری ہمیشہ سے یہی سوچ رہی ہے کہ اگر میں بھاری بھرکم انگریزی کی اصطلاحات استعمال کروں گی تو انجان لفظ پڑھ کر میرا قاری ایک لمحے کو رکے گا' اٹکے گا... اور جہاں وہ اٹکا اور اس کی محویت ٹوٹ گئی وہاں میں بطور رائٹر ناکام ہو جاؤں گی' نہ کہ میرے علم اور تحقیق کی دھاک بیٹھے گی' مجھے اپنے قاری کو کہانی پڑھانی ہے' اس پر رعب نہیں ڈالنا۔

تو پھر ہوا کچھ یوں کہ میں نے خود سے عہد کیا کہ اسے مکمل اردو میں لکھوں گی (جیسے ظفر محمود کا ناول "تیئس دن" تھا' جس میں کمپیوٹر کے ماؤس کی بھی اردو لکھی تھی) اور الحمدللہ میرا یہ ریکارڈ رہا ہے کہ میں نے جب بھی کوئی عہد کیا ہے' اسے پورا نہیں کیا۔

"مکمل اردو" کے سارے دعوے کرنے کے بعد جب میں نے اس ناول کو لکھنا شروع کیا تو ہوش ٹھکانے آگئے۔

اس موضوع میں اردو کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ہر لفظ انگریزی کا ہے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں میں نے اپنے ٹیچر سے گول گپوں کی انگریزی پوچھی تھی' تو سر نے کئی دن سوچ بچار کے بعد مجھے کہا تھا کہ انگریز گول گپے نہیں کھاتے اس لیے اس کی انگلش نہیں ہوتی۔ اب کی بار میں یہ کہے دیتی ہوں کہ قراقرم اور ہمالیہ کے سروے گوروں نے ہی سب سے پہلے کیے تھے' سو اس فیلڈ میں اردو کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ جیسے ایک لفظ لے لیں Avalanche میں نے ہر بندے سے Avalanche کی اردو پوچھی' مجھے کوئی مناسب جواب نہیں ملا۔ میری کم علمی کہہ لیں یا نالائقی' مجھے اردو میں Avalanche، Crevasse، Corniced Ridge اور Serac جیسے الفاظ کی متبادل ٹرانسلیشن نہیں ملی۔ میں نے ایک بلتی پورٹر سے پوچھا کہ یار تم لوگ ایولانچ کو اردو میں کیا بولتے ہو؟ اس نے بڑا ساجناتی قہقہہ لگایا۔ "باجی آپ کو اتنا بھی نہیں پتا؟ ام اس کو گلشیئر بولتا ہے۔"

دل تو میرا چاہا کہ پوچھوں پھر گلشیئر کو کیا بولتے ہو؟ مگر چلو جانے دو' وہ بے چارہ تو ان پڑھ پورٹر تھا' میں نے نوائے وقت اور ایکسپریس جیسے اخباروں میں اس سال اگست میں جھگوری پر ہونے والے ہولناک حادثے کی خبر دیکھی جو یوں شروع ہوتی تھی۔ "گلشیئر پھٹنے سے....." مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ یہ خبر دراصل جھگوری کی تاریخ کے اس بدترین ایولانچ کی تھی جو غالباً "۳ اگست کو وہاں آیا تھا۔ پاکستان میں لوگ آج بھی ایولانچ کو گلشیئر بولتے ہیں۔ اب اگر میں تھوڑا بہت کمپرومائز کر لیتی ہوں' ایک دو انگریزی کے الفاظ لکھ بھی دیتی ہوں' تو اس میں میرا قصور نہیں ہے۔

ناول حاضر ہے۔ کوئی غلطی ہو تو معاف کر دیجئے گا۔ گو کہ ہمارے ہاں یہ رواج تو نہیں' مگر پھر بھی.....

جیسے میں نے پہلے بھی ذکر کیا' یہ ایک سچی کہانی ہے' اور میں نے زیادہ ردوبدل نہیں کیا۔ چند کرداروں کے نام نہیں بدلے اور جن کے بدلنے چاہیے تھے' ان کے بدل دیے۔ ہاجرہ نے اعتراض کیا کہ تم نے شروع اور آخر میں ایک غیر ضروری کردار کو بہت پروجیکشن دی ہے۔ میں نے ہاجرہ کو یہی کہا' کہ جیسے تم دوست ہو' ویسے وہ بھی دوست ہے۔ دوستوں کو ہائی لائٹ کرنا پڑتا ہے' نہ کرو تو وہ چھوڑتے نہیں ہیں۔

ناموں کے علاوہ چند باتیں جیسے ناول کی سیٹنگ میں نے بالکل مختلف کر دی' یہ میرے لیے ضروری تھا کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ کسی کو اس سے تکلیف ہو۔ آپ لفظ بہ لفظ سچ تو نہیں لکھ سکتے نا۔ بہت سی باتیں آپ کو چھپانی بھی پڑتی ہیں۔ جیسے اس پروجیکٹ سے متعلق ایک بہت اہم تفصیل — میں نے پاکستان آرمی سے مانگی' انہوں نے بہت کوشش کی' مگر انہیں نہیں ملی۔ دو تین ماہ تک انہوں نے ہر جگہ سے ڈھونڈنے کی کوشش کی' پرانی فائلز کھولیں' ایرا اور NDMA کو ریفر کیا' آئی ایس پی آر کی فائلز چیک کیں اور آخر میں خاصے تاسف سے مجھے بتایا کہ وہ فائل نہیں ملی' مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں یہی دیکھنا چاہ رہی تھی کہ اگر پاک آرمی کو نہیں ملتی تو پھر تو کسی کو نہیں ملے گی۔ میرا کام زیادہ آسان ہو گیا۔ میں نے کہا نا' کچھ نہ کچھ چھپانا پڑتا ہے۔

بہرحال میں نے "قراقرم کا تاج محل" لکھتے ہوئے' اس کے لیے ریسرچ کرتے ہوئے' اس کے لیے "سفر" کرتے ہوئے (اردو والا بھی' انگریزی والا بھی) بہت انجوائے کیا۔ اس موضوع پر خواتین ڈائجسٹ اور شعاع میں آج تک نہیں لکھا گیا' اردو ادب میں سوائے سفرناموں کے' شاید ہی کچھ لکھا گیا ہو۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔

لپائن کلب آف پاکستان کا شکریہ! اگر مجھے ان کی مکمل سپورٹ نہ ہوتی تو میں شاید یہ ناول نہ لکھ سکتی۔

(مجھے یہ کمنٹ بھی ملا کہ "نمرہ' اللہ کے فضل سے تم خود بھی پاگل ہو' اور کسی بھی دوسرے کو پاگل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔")

جانے سے پہلے میں اناتولی بوکریف جیسے اپنے فیورٹ' ریئل لائف ہیرو کے الفاظ دہراؤں گی۔

"پہاڑوں میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ ہمیں اپنی راجدھانی میں کھینچ لائیں' جہاں ہمارے وہ دوست ابد تک کے لیے ہوتے ہیں' جن کی روحیں کبھی ان بلندیوں تک جانے کے لیے مچلا کرتی تھیں۔ ان کوہ پیماؤں کو مت بھلانا' جو چوٹیوں سے لوٹ کر نہیں آتے۔"

نمرہ احمد

قراقرم کا تاج محل

نوائے وقت' منگل 16 اگست 2005ء' 11 رجب 1426ھ

"راکاپوشی پر گلیشئر پھٹنے سے کوہ پیما لڑکی گر کر ہلاک"

ہنزہ (اے ایف پی) راکاپوشی سر کرنے والی ٹیم کی ایک لڑکی گلیشئر پھٹنے سے کئی فٹ گہرے شگاف میں گر کر ہلاک ہو گئی۔ غیر ملکی خبر رساں ایجنسی کے مطابق گزشتہ روز صبح تین سے چار بجے کے درمیان پاک ترک برٹش ایکسپیڈیشن کی ایک کوہ پیما چڑھائی کے دوران برف پھٹنے سے نیچے کریوس میں گر گئی۔ ایکسپیڈیشن ٹیم نے لڑکی کی فوری ہلاکت کی تصدیق کر دی ہے۔ مزید تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔

مکمل ناول

☼ ☼ ☼
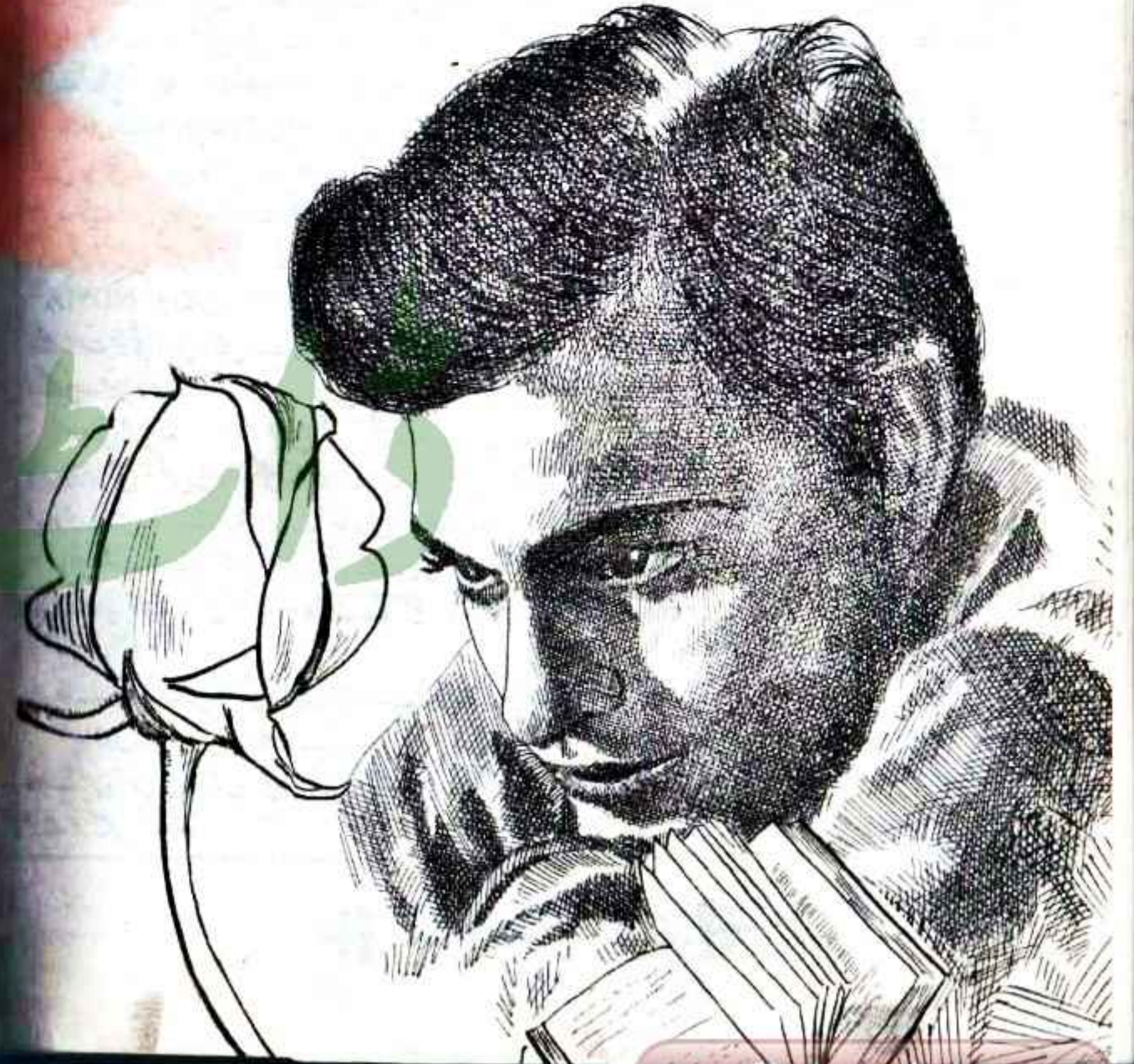
بدھ' 20 جولائی' 2005ء... ایک ماہ قبل....

سفید گیٹ عبور کر کے اس نے چند لمحے رک کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ گیٹ سے آگے سفید پتھروں سے بنا خوب صورت اور طویل ڈرائیو وے تھا' دائیں طرف کھلا سا لان' اس کے دہانے پر بنے جدید طرز کے برآمدے میں بچھی چار کرسیوں میں سے ایک پر نشاء بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صبح کا اخبار تھا جو وہ عادتاً شام کے وقت ہی پڑھا کرتی تھی۔

نشاء کو سامنے پا کر' وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ڈرائیو وے عبور کر کے برآمدے تک آئی۔ اس سے پہلے کہ نشاء اس کے استقبال کے لیے اٹھتی' وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھے اور ابرو چڑھائے' ماتھے پر بل ڈالے' پوچھنے لگی۔

"یہ لڑکا کون تھا؟"

"کون سا لڑکا؟" اس نے اخبار تہہ کر کے میز پر رکھ دیا' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہی جو باہر کھڑا تھا۔"

"باہر کھڑا تھا؟" نشاء حیران سی کھڑی ہو گئی' ایک نظر اس نے پریشے کے چہرے کے بگڑے زاویوں اور تھانے دارانہ انداز میں کھڑے ہونے کے انداز کو دیکھا۔ "کس کی بات کر رہی ہو؟"

"وہی جو باہر حبیب کے ساتھ کھڑا تھا۔"

"اوہ وہ؟ وہ حبیب کا دوست ہے ملنے آیا تھا اور اب تو واپس جا رہا تھا۔ کیوں' خیریت؟"

"خیریت؟ مجھے دیکھ کر اس بدتمیز لڑکے نے سیٹی بجائی

شرم تو آتی نہیں ہے آج کل کے لڑکوں کو۔ آنے دو حبیب کو' ابھی پوچھتی ہوں کہ کس قسم کے واہیات لوگوں سے دوستی ہے اس کی!"

"کم آن' پری!" نشاء نے واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے' مسکراہٹ دبائے ایک نظر اسے دیکھا۔

سادہ گلابی شلوار قمیص میں ملبوس' اپنے' سیدھے اور بے حد سیاہ بالوں کو اونچی پونی ٹیل میں مقید کیے' پاؤں میں سفید اور ہلکے گلابی رنگ کے جوگرز پہنے' وہ بہت خفگی سے نشاء کو دیکھ رہی تھی۔

"بھئی سیٹی بجادی تو کیا ہوا' بچہ ہے۔"

"ہاں' چھ فٹ کا بچہ ہے؟"

"بھئی حبیب کا کلاس فیلو ہے' یعنی ہو گا کوئی سترہ اٹھارہ سال کا' مطلب عمر میں ہم سے کم از کم بھی آٹھ سال چھوٹا۔ بچہ ہی ہوا نا!" وہ اپنی کزن کی بہ نسبت ہمیشہ زیادہ لاپروا رہی تھی" اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"لو' مری کیوں جارہی ہو؟ تمہارے لیے ہی ہے' بیف چلی بنایا تھا' سوچا کچھ تمہیں بھی دے آؤں۔" اس نے ڈونگا نشاء کو تھمایا تھا' اس کا موڈ سخت خراب تھا۔

"واؤ' بیف چلی ممی کو بہت پسند ہے۔" نشاء کا اس کے موڈ کو خاطر میں لانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"ہاں تو ممانی کے لیے ہی لائی ہوں' کون سا تمہارے لیے بنایا ہے؟"

"نشاء آپی! دراصل پری آپا ہمیں بیمار کرکے اپنے ڈاکٹری چمکانا چاہتی ہیں۔" اپنے دوست کو رخصت کرکے حبیب بھی ادھر آگیا تھا۔

"تمہارے لیے نہیں ہے' منہ دھو رکھو۔"

"شیروں کے منہ دھلے ہوئے ہوتے ہیں آپا!"

"ہاں' یاد آیا۔ تمہیں تو ماموں اور ممانی چڑیا گھر سے لائے تھے نا؟"

"کم آن!" وہ ہنسنے لگا۔ "ویسے ابھی کس لوفر لفنگے کی بات ہو رہی تھی؟"

"وہی جس کے ساتھ تم باہر گیٹ پر کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ بدتمیز لڑکا مجھے دیکھ کر سیٹی بجا رہا تھا۔ کیسے لڑکوں سے دوستی ہے تمہاری؟"

"ارے وہ' وہ میرا دوست ہے بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اور وہ آپ کو دیکھ کر سیٹی نہیں بجا رہا تھا' وہ تو بس اس کی عادت ہے۔ نیور مائنڈ' وہ تھوڑا سا اسپائلڈ چائلڈ ہے۔" اپنے دوست کا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ حبیب جھک کر بڑے ڈونگے میں سے بیف کے چٹ پٹے ٹکڑے انگلیوں سے اٹھا کر کھا رہا تھا۔ "اور سنبھل کر آپا' اس کا باپ صدر پاکستان کا دوست ہے!"

جواب میں پریشے بڑبڑا کر رہ گئی۔ پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کدھر جارہی ہو؟ ممی کو سلام تو کرلو!"

"پچاس گز کے فاصلے پر میرا گھر ہے۔ پھر آجاؤں گی' ابھی تو مجھے جانا ہے۔"

"بھئی بریکنگ نیوز تو سنتی جاؤ' حبیب اور اس کے چار دوست راکاپوشی بیس کیمپ کا ٹریک کر رہے ہیں۔"

"تو کرتے رہیں۔" اپنے تئیں نشاء نے پریشے کو چونکا دینے والی خبر سنائی تھی مگر اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا دیے۔

"پری آپا! یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہیں کہ وہ جیلس نہیں ہو رہیں۔" حبیب اس کا انداز دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔

"میں ہو بھی نہیں رہی۔" وہ کھٹ سے کہہ کر گیٹ کی طرف تیز قدموں سے بڑھ گئی۔

"سنو تو تمہارے کپڑے آئے پڑے ہیں ٹیلر سے' وہ لیتی جاؤ۔" نشاء بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے آئی تھی۔

"تم رات کو دے جانا۔ ابھی میں جلدی میں ہوں۔" وہ گیٹ کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے ایک لمحے کو مڑی تھی۔

"کیوں؟ کیا جلدی ہے؟"

"وہ... " گیٹ پر رکھا اس کا ہاتھ یکدم ڈھیلا پڑا' وہ قدرے ہچکچائی۔ "وہ... ابھی پھپھو اور ندا آپا آئی ہوئی ہیں نا!"

اب کی بار نشاء کا موڈ خراب ہوا تھا۔ "کیا مطلب' ان کو اپنے گھر چین نہیں ہے؟ ہر دوسری شام تو وہ تمہاری طرف ہوتی ہیں اور وہ ندا آپا کے شیطان بچے' اتنا ... بھی کوئی ہو گا؟ جاؤ' جلدی گھر جاؤ' وہ درجن بھر ... چکے ہوں گے۔"

تھوڑی دیر پہلے کے تاثرات پریشے کے چہرے سے غائب ہو چکے تھے' وہ بے بسی سے لب کاٹ کر رہ گئی۔

"ویسے رات کا کھانا بھی یقیناً" وہ تمہاری طرف کھائیں گی نا؟ سیف بھائی بھی رات کو ہی آئیں ... یقیناً" کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ حد ہوتی ہے روز روز ...

... کے گھر کھانے کی' لیکن پھپھو۔ اور معذرت کے ساتھ' سیف بھائی کی وہی مثال ہے کہ نیت سیر نہ ہو تو...!"

"چلو کچھ نہیں ہوتا۔ پاپا کی ایک ہی بہن ہیں' ان کے آنے سے پاپا ہی خوش ہو جاتے ہیں۔"

"مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی ڈاکٹر پریشے جہانزیب! تم اتنی کمزور اور جذباتی قسم کی دلیلیں کیوں دیتی ہو؟ اتنی اچھی طرح جانتی ہو سیف بھائی کو' پھر بھی تم نے ان سے منگنی سے انکار نہیں کیا؟"

سیف سے منگنی کے ان تین برسوں میں نشاء نے کوئی ایک ہزار دفعہ یہ بات کہی تھی۔

"یہ پاپا کی خواہش تھی نشاء! اب اس بات کو بار بار دہرانے سے کیا حاصل؟ اور پھر میں انکار کس کے لیے کرتی؟" جواباً" نشاء چپ رہی تو وہ گیٹ کھول کر باہر نکل آئی۔

"اس کے لیے کر دیتی انکار!" پیچھے سے بہت آہستہ سے نشاء نے کہا تھا۔ اس کے قدم ایک لمحے کو زنجیر ہوئے تھے۔

"تمہیں وہ احمقانہ بات ابھی تک یاد ہے نشاء؟" وہ اداسی سے مسکرائی اور سر جھٹکتے ہوئے اپنے بنگلے کے گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو پھپھو اور ندا آپا ایک ہی صوفے پر بیٹھی' سر جوڑے سرگوشی میں کوئی بات کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر فوراً" سیدھی ہو گئیں۔

"تم کدھر گئی تھیں؟" ندا آپا اور پھپھو نے اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا' کیونکہ وہ کچن کے پچھلے دروازے سے باہر گئی تھی۔

"وہ نشاء کی طرف گئی تھی' اس کے کچھ برتن رہتے تھے۔" اس نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ برتنوں میں بیف چلی بھی تھا۔

"سنو پری! یہ زیادہ میل جول نہ رکھا کرو ان لوگوں سے۔ برا مت ماننا مگر تمہارے ماموں کی لڑکی بڑی چلتر ہے' ماں بھی ایسی ہی ہے اس کی۔ دیکھنے میں ان سے معصوم کوئی نہیں لگتا' اور اندر سے پوری ہیں یہ۔"

"اور وہ نشاء تو جب بھی ملاقات ہو' سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔"

وہ نشاء اور ممانی جان کے بارے میں اس قسم کی گفتگو نہ سنتی' اگر وہ اس کے سسرال والے نہ ہوتے۔

"میں ذرا چائے لے آؤں۔" وہ آہستگی سے کہہ کر کچن میں چلی آئی۔ وحید ٹرالی سیٹ کر رہا تھا' وہ ٹرالی کو دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔

وہ جانتی تھی' پھپھو' نشاء اور اس کے ماموں' ممانی کے متعلق ایسی باتیں کیوں کرتی تھیں' انہیں ڈر تھا کہ کہیں ماموں اور ممانی' جہانزیب صاحب پر دباؤ ڈال کر سیف اور پریشے کی منگنی ختم نہ کرا دیں۔ کیونکہ اول تو ماموں اور ممانی اس کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے اور اگر دیتے بھی تو صرف اور صرف پریشے کے کہنے پر' اس کی مرضی کے خلاف وہ کبھی بھی جہانزیب صاحب سے کوئی بات نہ کرتے اور اس معاملے میں بولنے کا حق اگر اس نے ماموں ممانی کو دینا ہوتا تو تین برس پہلے ہی دے چکی ہوتی۔

پھپھو کو نشاء لوگوں سے دوسرا خوف یہ تھا کہ کہیں نشاء پریشے کو ان کے خلاف بھڑکا نہ دے' کیونکہ نشاء اور ممانی خاصی صاف گو واقع ہوئی تھیں۔ بقول پھپھو کے منہ پھٹ' بدلحاظ اور بدتمیز حالانکہ پریشے کا خیال تھا کہ جتنی سویٹ اور کیئرنگ ممانی تھیں اور جس طرح اس کی مما کی وفات کے بعد انہوں نے اس کا خیال رکھا تھا' کوئی سگی خالہ بھی نہ رکھ سکتی۔

"باجی! یہ لے جائیں۔" وحید کی شرمیلی سی آواز اس کو خیالات کے بھنور سے باہر نکال لائی۔ اس نے قدرے چونک کر اسے دیکھا' پھر سر جھٹک کر ٹرالی تھام لی۔

"اے ہے پری بیٹا! یہ کیا لڑکوں کی طرح جوگرز پہنے پھرتی ہو؟ کوئی سینڈل' یا ہیل والی جوتی پہنا کرو۔" چائے کے ساتھ موجود دیگر لوازمات اپنی پلیٹ میں بھرتے ہوئے پھپھو نے ہر بار کی طرح اس کے جوگرز پر اعتراض کیا۔

"اور کیا۔ وہ پرپل والی سینڈل ہی پہن لیتیں جو تمہیں سیف بھائی نے لے کر دی تھی۔" ندا آپا اپنے بچوں کو کیک کھلاتے ہوئے بولیں۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ سیف کی پسند اس سے بہت مختلف تھی' وہ شوخ رنگ اور ظاہری چمک دمک کو دیکھتا تھا' جبکہ وہ سوفٹ کلرز اور کوالٹی کو ترجیح دیتی تھی۔

"جی بہتر۔" وہ سر جھکاتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھ گئی' اسے علم تھا کہ وہ دونوں جب تک بیٹھی رہیں گی' ان کے اعتراضات ختم نہیں ہوں گے۔

آٹھ بجے تک جہانزیب صاحب بھی آگئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ان لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے' روشان اور سنی کو خوب پیار کیا' کہ ان کی زندگی میں ساری رونق ان ہی

لوگوں سے تھی۔ ان کے سامنے ان کی ٹون بدل جایا کرتی تھی۔

"پری! وحید کو کہہ کر اچھا سا کھانا بنوانا۔ کڑاہی، بریانی کچھ اور بھی ایڈ کر لینا۔" انھوں نے آہستہ سے پریشے کو ہدایت دی۔ اس کا دل چاہا کہ کہہ دے۔

"پاپا! یہ لوگ روز تو یہاں کھانا کھاتے ہیں، پھر ہر روز کا اہتمام کیوں؟" مگر وہ جانتی تھی، پاپا ان لوگوں کو کتنا عزیز رکھتے ہیں سو وہ ان کو باتیں کرتا چھوڑ کر خود کچن میں آگئی۔

پھپھو کی فیملی ہر دوسری شام یہیں ہوتی تھی اور اسے کبھی بھی اتنی کوفت نہیں ہوئی تھی جتنی آج ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ آج نشاء نے اسے برسوں پرانی ایک بھولی بسری بات یاد دلا دی تھی۔

پرانی یادیں ـــ ٹوٹے خواب، بکھرے سپنے ہر انسان کو تھکا دیتے ہیں، اس پر بھی عجیب سی تھکن اور بیزاری طاری ہو رہی تھی۔

"ماما! میں یہ کھالوں؟" نو سالہ روشان نے فریج کا دروازہ کھول کر پی نٹ بٹر کا جار نکال کر دور سے ماں کو آواز دی۔

"ہاں کھالو بیٹا! تمہارے نانا کا گھر ہے۔" ندا آپا نے لاپروائی سے کہا اور وہ، جس نے ملائیشین چکن بنانے کے لیے اتنا بڑا جار منگوایا تھا، بے بسی سے مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔ وہ روشان اور سنی کو ٹوک بھی نہیں سکتی تھی۔

سنی پورے گھر میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ اسے کوفت ہو رہی تھی مگر وہ خاموش رہی۔ پھر چند منٹ بعد جب وہ چاولوں کو دم دے رہی تھی، اسے بلی کی وحشیانہ میاؤں میاؤں کی آواز آئی۔

"یا اللہ!" اس نے گھبرا کر کفگیر میز پر رکھا اور بھاگتی ہوئی کچن سے باہر نکلی، باہر زمین پر اس کی پالتو بلی کو روشان نے پکڑ رکھا تھا جبکہ سنی اس کی دم کو ماچس کی تیلی سے آگ لگا رہا تھا۔ بلی تڑپتی ہوئی چیخ رہی تھی۔

"ہٹو تم دونوں۔" اس نے زور سے سنی کے ماچس والے ہاتھ پر تھپڑ مارا، بلی کو روشان سے کھینچا اور ماچس کی ڈبی اٹھا کر اپنے قبضے میں کرلی۔ "یہ کیا کر رہے تھے تم لوگ؟"

"آپ کو کیا مسئلہ ہے، جو بھی کر رہے تھے، ہماری مرضی۔ ہمارے نانا کا گھر ہے۔ آپ کون ہوتی ہیں پوچھنے والی؟" سنی کو تھپڑ لگا تھا، جس کا جواب اس نے بے حد بدتمیزی سے دیا تھا۔

پورے دن کی کوفت، بے زاری، نشاء کی آخری بات، پھپھو اور ندا آپا کے طنز اور طعنے، ان دونوں کی بدتمیزیاں اس نے سب کچھ برداشت کر لیا تھا مگر سنی کی بدتمیزی پر اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس نے رکھ کر دو تھپڑ سنی اور دو روشان کو لگائے۔

"دفع ہو جاؤ ادھر سے تم دونوں۔" چیختی، روتی بلی کو اپنی آغوش میں سہلاتے ہوئے، اس نے غصے سے کہا اور واپس کچن میں آگئی۔

وہ دونوں حلق پھاڑ کر روتے ہوئے ندا آپا کے پاس چلے گئے۔ عین اسی وقت سیف بھی آگیا۔ وہ آفس سے سیدھا ادھر ہی آیا تھا اور اس کا کوٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ گھر اس لیے نہیں گیا تھا کہ اسے علم تھا، گھر میں کھانا نہیں بنا ہوگا۔

"کیا ہوا ہے؟ کس نے مارا ہے؟" ندا آپا نے ان دونوں کو روتے دیکھ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ تمام ڈرامے کی آوازیں کچن میں بخوبی سن سکتی تھی، اس کی کوفت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"پری آپا نے مارا ہے۔ بال بھی کھینچے ہیں اور منہ پر بھی مارا ہے۔" روشان چلاتے ہوئے بتا رہا تھا۔ وہ تیزی سے کچن سے نکلی، بلی اس کی آغوش سے چھلانگ لگا کر کودی اور بھاگتی ہوئی کچن سے باہر چلی گئی۔

"ہائے اللہ، پری! تم نے میرے معصوم بچوں کو کیوں پیٹ ڈالا؟ ماموں! میں نے تو کبھی ان کو زور سے جھڑکا تک نہیں ہے۔" ندا آپا اس کو دیکھتے ہی اونچی آواز میں رونے لگیں۔ "ہائے میرے معصوم بچے!"

"یہ دونوں اس بلی کو آگ لگا کر مار رہے تھے۔ میں نے روکا تو سنی نے مجھ سے بدتمیزی کی، میں نے صرف تھپڑ مارا تھا، بال نہیں نوچے تھے۔" کسی مجرم کی طرح کھڑی وہ صفائیاں دے رہی تھی۔

"لو! اتنے چھوٹے بچے بلی کو آگ لگا سکتے ہیں؟ انہیں تو ماچس بھی جلانا نہیں آتی۔" پھپھو چمک کر بولی تھیں۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی پھپھو! یہ دونوں اس بلی کو اذیت دے رہے تھے۔"

"تمہیں اپنے بھانجوں سے زیادہ کسی جانور سے پیار ہے؟ یہ بچے ہیں، کچھ کر بھی دیا تو آرام سے بھی ٹوکا جا سکتا ہے پری!"

اب کے سیف بولا تھا۔ سیف اس کی حمایت کرنے کے بجائے

اس نے تو اس کا یقین تک نہیں کیا تھا کہ اس نے روشان اور سنی کے بال نہیں نوچے تھے۔

"اچھا پری! اب سوری کر لو ان دونوں سے۔" یہ پاپا تھے، اس نے بے حد شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔ کسی کو بھی اس کی بات کا یقین نہ تھا۔

"پاپا! میں بڑی ہوں، میں نے کچھ کہہ بھی دیا تو آپ سب لوگ اس طرح کیوں ری ایکٹ کر رہے ہیں؟"

"پری! تم بچوں اور ندا آپا سے سوری کرو۔ دیکھو، آپا ابھی تک رو رہی ہیں۔" سیف نے بہت سنجیدگی اور خفگی سے اسے مخاطب کیا۔

اس کا دل چاہا، وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر رونا شروع کر دے مگر اسے ضبط کرنا تھا، خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا تھا۔

"میری کوئی غلطی نہیں، پھر بھی ندا آپا سوری!"

ندا آپا نے منہ پھیر لیا، یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ ابھی تک خفا تھیں۔

"میں کھانا لگواتی ہوں۔" وہ وہاں سے چلی آئی، وحید کو کھانا لگانے کا کہا اور خود کچن میں بیٹھی رہی۔ جب تک وہ لوگ چلے نہ گئے، وہ باہر نہیں نکلی۔ اسے اپنے بے عزتی پر شکوہ ان لوگوں سے نہیں، پاپا سے تھا۔ پتا نہیں پھپھو نے پاپا کو کیا گھول کر پلا دیا تھا کہ وہ کبھی ان کے خلاف کچھ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

"کیا میں اپنی پوری زندگی ان لوگوں کے درمیان گزار سکتی ہوں؟ اف ـــ یہ کتنا کٹھن ہو گا!" یہ تکلیف دہ خیال اس کے ذہن سے بار بار ٹکرا رہا تھا۔

"کدھر گم ہو؟" نشاء نے کچن کے دروازے میں سے سر نکال کر جھانکا تو وہ چونکی، پھر زبردستی مسکرا دی۔

"میں تو یہیں ہوں۔ تم کہو، میرے کپڑے لے آئی ہو؟"

"ہاں، تمہارے کمرے میں رکھ دیے ہیں۔ مہمان چلے گئے تمہارے؟" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پریشے کھڑی ہو گئی۔

"ہاں چلے گئے، آؤ باہر بیٹھتے ہیں۔" نشاء کو دیکھ کر اس کا ڈپریشن قدرے کم ہوا تھا۔ وہ دونوں ان کپڑوں کے متعلق باتیں کرتی لاؤنج میں آئیں تو جہاں زیب صاحب کو وہیں بیٹھے پایا۔

"انکل! امی کہہ رہی تھیں کہ سیف بھائی کی امی شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آئیں گی، کب آئیں گی وہ؟" نشاء

کی ان سے بہت بے تکلفی تھی اور وہ تھی بھی بہت بولڈ ..... ہربات پوچھ لیا کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا آج پھپھو اسی لیے آئی تھیں پھر بھی اس نے پوچھا۔ پریشے کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بیٹا! ڈیٹ تو تقریباً" فکس ہو گئی ہے۔ عید نومبر کے پہلے ہفتے میں آرہی ہے تو ہم یہ سوچ رہے تھے کہ عید کے تیسرے دن مہندی رکھ لیں گے۔" وہ خوش دلی سے بتا رہے تھے۔ اس کو اپنی گردن کے گرد پھندا تنگ ہوتا محسوس ہو رہا تھا ایک دم کمرے میں اتنی گھٹن ہو گئی تھی کہ اس کا سانس رکنے لگا۔

"نشاء!" اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ "حسیب اور اس کے دوست ہنزہ جا رہے ہیں نا؟ تم نے آج کچھ بتایا تھا؟"

"ہاں وہ راکاپوشی بیس کیمپ کا ٹریک کر رہے ہیں۔"

"کون کہاں جا رہا ہے؟" ان کی سرگوشیاں وہ ٹھیک سے سن نہیں سکے تھے۔

"پاپا! وہ..... نشاء کے ایک کزن کی اپنی ٹور کمپنی ہے مری میں' نشاء نے ان سے نا: رن اریاز کے ٹورز کا پتا کیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جلد ہی ان کا کوئی ٹور جائے گا نا درن اریاز تو پاپا! میں نشاء کے ساتھ چلی جاؤں؟ بس تین چار دن کے لیے؟"

"مگر ندا تو ہفتہ بھر کے لیے میکے تمہاری وجہ سے آئی ہے۔ اس کی نند کا کوئی مسئلہ تھا تو اس کی ساس اور شوہر چند دنوں کے لیے سیالکوٹ گئے ہیں۔ وہ اگلا پورا ہفتہ ادھر آگئی کہ تمہارے ساتھ مل کر شادی کی شاپنگ کرلے گی۔"

وہ سوچ رہی تھی کہ چند دنوں تک کسی دور دراز پر فضا مقام پر چلی جائے' مگر جیسے ہی پاپا نے ندا آپا کی ایک ہفتے کی چھٹی کا بتایا' اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ جلد ہی اسلام آباد سے پورے ہفتے کے لیے غائب ہو جائے گی۔ وہ کسی کے ساتھ بھی شاپنگ کر سکتی تھی' مگر ندا آپا کے ساتھ نہیں۔

"پاپا..... ندا آپا کی چوائس بہت اچھی ہے' وہ خود ہی شاپنگ کر لیں گی۔ میں بس پانچ چھ روز میں واپس آجاؤں گی۔" اس نے بہت منت اور لجاجت سے کہا۔

"آ..... اچھا مگر کس جگہ جانا چاہتی ہو تم؟" وہ نیم رضا مند تھے۔ وہ جواباً" کہنا چاہتی تھی کہ ہنزہ' گلگت' اسکردو' مگر اسے معلوم تھا کہ ان علاقوں کا نام سن کر پاپا سختی سے انکار کریں گے۔

"پشاور' سوات' کالام..... اسی سائیڈ پر جائیں گے۔"

اس نے سوات کا ذکر اس لیے کیا کہ وہاں کوئی ڈھائی ہزار فٹ بلند پہاڑ نہ تھا' اور یہ سب سے بڑی وجہ تھی کہ پاپا نے اگلے ہی لمحے اسے اجازت دے دی۔

اس نے بے اختیار ایک چور نگاہ اپنے بائیں کندھے پر ڈالی۔ صرف اس کندھے کی وجہ سے وہ اسکردو سائیڈ پر ہمالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں میں نہیں جا سکتی تھی۔

جہانزیب صاحب اٹھ کر اندر چلے گئے تو نشاء تیزی سے اس کی طرف مڑی۔ "میں نے کب پتہ کیا تھا زوار بھائی کی ٹور کمپنی سے؟"

"نہیں کیا تو اب کر لینا۔" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے ندا آپا پلس فیملی کی آمد کے باعث چند لمحے پہلے تک اس کے سر میں جو درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں' وہ اب غائب ہو چکی تھیں۔

"تم اسلام آباد کی کسی ٹور کمپنی کا نام نہیں لے سکتی تھیں؟ اب خوامخواہ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے مری جانا پڑے گا اور اگر تمہیں اتنا ہی شوق ہو رہا ہے سیر سپاٹے کا تو حسیب اور اس کے فرینڈز کے ساتھ راکاپوشی چلے جاتے ہیں۔"

"جس کی اجازت پاپا مجھے کبھی نہیں دیں گے اور حسیب کے دوست؟" اس کی نگاہوں کے سامنے شام والا وہ لڑکا آ گیا۔ جس نے اس کو دیکھ کر بے اختیار سیٹی بجائی تھی۔ اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔ "میں حسیب کے دوستوں کا سر پھاڑ سکتی ہوں' ان کے ساتھ چار دن پیدل راکاپوشی کا ٹریک نہیں کر سکتی۔" اس کو وہ لڑکا بہت ہی برا لگا تھا نشاء خاموش ہو گئی۔

نشاء کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے کمرے کی ترتیب ایسی تھی کہ دروازہ کھلتے ہی سامنے پلنگ نظر آتا تھا جس کے سرہانے دیوار پر "توماز ہیومر" کا بہت بڑا پوسٹر چسپاں تھا۔ کمرے کی باقی تین دیواروں میں سے دو پر "میسنر" اور چند جاپانی کوہ پیماؤں کے پوسٹرز آویزاں تھے۔ ان تصویروں کو دیکھتے ہی ایک اداس مسکان نے اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

"پریشے جہاں زیب' جس کے نام کا آخری حصہ "شے" ہٹا کر سب اس کو "پری" کہا کرتے تھے۔ بچپن سے ہی ایک آئیڈیلسٹ تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی کہ جن کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا' جن کو چیلنجز کا سامنا کرنے میں مزا آتا ہے۔ سیف سے منگنی سے پہلے تک وہ واقعی بہت پر جوش تھی' مگر ان گزرے چار برسوں میں بہت کچھ بدلا تھا۔

اس کو بچپن سے پہاڑ سر کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے پاپا اور مما کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث خاصی لاڈلی تھی۔ ان کے لاڈ پیار نے اس کو بگاڑا نہیں' بلکہ بہت بہادر' مضبوط اور پر اعتماد بنا دیا تھا۔ اس کی مما کو اس کا کوہ پیمائی کا شوق بہت عزیز تھا اور یہ سب سے بڑی وجہ تھی جس کے باعث مما اس کو 1995ء میں اپنے ساتھ انگلینڈ لے گئی تھیں۔ پاپا نے اس کی وجہ سے اپنے بزنس بھی ادھر ہی منتقل کر دیا تھا' مگر وہ لندن میں ہوتے تھے اور مما اور پریشے لیک ڈسٹرکٹ میں۔

وہ چار برس لیک ڈسٹرکٹ میں رہی' وہاں اس نے بہت کچھ سیکھا' درمیان میں صرف دو دفعہ وہ پاکستان آئی تھی۔ وہ بھی سردیوں کی چھٹیوں میں۔ کیونکہ گرمیوں کی چھٹیاں وہ کہاں گزارتی تھی' یہ اس کا ایک ٹین ایج سیکرٹ تھا' جس کی بھنک اگر پاپا کو پڑ جاتی تو وہ بہت خفا ہوتے۔ (البتہ مما واقف تھیں) اور ان دونوں بار اسے اپنے سے آٹھ نو سال بڑا سیف الملوک بہت برا لگا تھا۔ وہ اس کے پاپا سے بہت لاڈ اٹھوا تا تھا' اور اس کو بڑی عجیب نگاہوں سے تکتا تھا' اسے نہ اس کی نگاہیں اچھی لگتی تھیں' نہ باتیں۔ اس نے دو ایک دفعہ پریشے سے جب یہ کہا "تم بہت خوب صورت ہو۔" تو اس نے سیف کو بری طرح جھڑک دیا تھا۔

چھ سال پہلے زندگی کسی حد تک بدل گئی۔ جب مما کی وفات ہو گئی اور پھپھو کے بے حد اصرار پر پاپا اسے اسلام آباد لے آئے' تب پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ —— ماں اس کی کیسی بڑی اور مضبوط ڈھال تھیں' جس کے نہ ہونے سے پاپا پر اور لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

وہ بزنس پڑھنا چاہتی تھی' مگر پھپھو نے پاپا کو مجبور کیا کہ وہ پریشے کو ڈاکٹر بنائیں۔ یوں اس کا ایک سال ضائع ہو گیا مگر وہ میڈیکل میں پہنچ ہی گئی۔

پھر 2001ء کے جولائی میں کچھ ایسا ہوا کہ اس کا کوہ پیمائی کا کیریر ختم ہو گیا۔ سپانتک کے ناقابل فراموش حادثے کے بعد پاپا نے اس کی کوہ پیمائی پر پابندی لگا دی' تو اس نے خاموشی سے ان کا فیصلہ مان لیا۔ اگلے سال پاپا نے اسے بتایا کہ انہوں نے اس کا رشتہ سیف سے طے کر دیا ہے "اسے کوئی اعتراض تو نہیں" تب بھی اس نے خاموشی سے سر جھکا دیا' ہاں تب اس نے ایک دفعہ اس کے متعلق ضرور سوچا تھا' جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا۔

لیک ڈسٹرکٹ جانے سے پہلے وہ ایک خوابوں میں رہنے والی کم عمر' لاپروا سی لڑکی تھی۔ جس کے "آئیڈیلزم" نے اسے ایک زندگی بھر پھانس کی طرح چبھنے والا خواب دیا تھا۔ اس اجنبی کا' جس کا انتظار ہر لڑکی کرتی ہے۔

اس نے برسوں پہلے نشاء کو بتایا تھا۔

"تمہیں یاد ہے' ہم فیری ٹیلز میں پرستان کی ایک پری کا قصہ پڑھا کرتے تھے' جس کو ظالم دیو نے قید کر رکھا تھا اور پھر' اسے چھڑانے ایک شہزادہ آیا تھا۔ سفید گھوڑے پر سوار' بھورے بالوں اور شہد رنگ آنکھوں والا گھڑ سوار' وہ دیس دیس کی خاک چھانتا پرستان کی خوب صورت وادیوں کے قصے سن کر اس طرف آنکلا تھا' پری کی قید کا سنا تو وہ بہادر شہزادہ اسے ظالم دیو کے پاس سے چھڑا کر خوب صورت وادیوں' چشموں اور پہاڑوں میں اپنے ہمراہ لے گیا اور پھر دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔" اس نے ایک گہری سانس بھر کر نشاء کو دیکھا تھا۔ "کاش میرے لیے بھی ایک ایسا ہی شخص آئے' شہزادوں کی سی آن بان رکھنے والا' بہادر اور مضبوط' ظاہریت کے پجاریوں جیسا نہ ہو....."

یہ کوئی کچی عمر کا سپنا نہیں تھا' ایک امید تھی' ایک وجدان تھا کہ کوئی ہے' جسے اس کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ جو دیس دیس کی خاک چھانتا کسی روز اس کے پرستان میں آ نکلے گا' جس کو دیکھ کر اس کا دل کہے گا کہ ہاں ظالم دیو کی قید میں موجود اس پری نے صدیوں اسی کا تو انتظار کیا تھا..... ہاں یہی تو ہے' جس سے اس نے روح سے وجود میں آنے سے قبل عشق کیا تھا' جو اس کی ذات کا ٹوٹ کر بکھرنے والا ایک گمشدہ حصہ تھا۔

اور ہاں' وہ یہ بھی تو کہتی تھی کہ "اگر میں پریوں کی ہی طرح حسین ہوں' تو یونہی کسی سے شادی نہیں کروں گی بلکہ وہ جیسے پریاں اور شہزادیاں شرائط رکھا کرتی تھیں نا' سات سوالوں کی شرط' سامری جادوگر کے منکے کی شرط' ویسی ہی شرط رکھوں گی۔" تو نشاء نے بے حد تجسس سے پوچھا تھا کہ "کیسی شرط؟"

تب وہ کھلکھلا کر بولی تھی۔ "میں صرف اس کا ہاتھ تھاموں گی جو میرے لیے دنیا کا سب سے خوب صورت پہاڑ' راکاپوشی سر کرے گا۔"

کتنے ہی برس گزرتے گئے' وہ خوابوں کا شہزادہ نہ آیا' یہاں تک کہ وہ تمام خواب پریشے کو بچکانہ اور احمقانہ لگنے لگے' اور وہ اب نشاء کے ساتھ ان پر خوب ہنستی تھی۔ پھر سیف سے منگنی کے بعد اس نے ان پر ہنسنا بھی چھوڑ دیا۔

آج' اتنے عرصے بعد نشاء نے اسے وہ بات یاد دلا دی تھی۔ وہ احمقانہ اور بچکانہ بات۔

ہاں' وہ بچکانہ خواب ہی تو تھے کہ اب پریشے جہانزیب کو سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ کوئی پری نہیں۔ ہاں خوب صورت سہی' مگر ایک عام سی لڑکی ہے' اور عام سی لڑکیوں کے لیے شہزادے نہیں آیا کرتے۔

☼ ☼ ☼

23 جولائی 2005ء

"چودہ ہزار فی کس کا پیکیج ہے۔ آٹھ دن کا ٹور' تمام انتظامات کمپنی کے ذمے..... واؤ یار زبردست۔"

"لگتا ہے بارش ہونے والی ہے۔" مال روڈ کے کنارے بہت آہستہ چلتے ہوئے پریشے نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ وہ دن کے تین بجے کا عمل تھا' مگر سیاہ بادلوں سے ڈھکے آسمان نے جولائی کی دوپہر کو ٹھنڈی شام میں تبدیل کر دیا تھا۔

وہ ورکنگ ڈے تھا' شاید اسی لیے مال روڈ پر رش نہ ہونے کے برابر تھا' ورنہ مری جیسے اوور پاپولیٹڈ علاقے میں مال روڈ پر ادھر ادھر بس اکا دکا لوگوں کا پھرنا خاصی غیر معمولی بات تھی۔

پریشے اور نشاء باتیں کرتے ہوئے' ساتھ ساتھ بلند ہوتی روڈ پر چل رہی تھیں۔ وہ جس جگہ پر تھیں' وہاں نشیب تھا' سڑک ان کے سامنے اوپر بلند ہوتی ہوئی اس حد تک چلی جاتی تھی کہ مخالف سمت سے آنے والے کا پہلے سر اور آہستہ آہستہ دھڑ نمایاں ہوتا تھا۔ وہ دراصل کسی پہاڑی کی چوٹی تھی جس کو کاٹ کر سڑک بنادی گئی تھی۔

سڑک کے دائیں جانب کھائی تھی جس سے بچنے کے لیے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے بلاکس کی ایک باڑ سی بنی تھی' دونوں ان سفید بلاکس کے ساتھ چل رہی تھیں۔

"تھک گئی ہو؟" نشاء نے اسے چونے سے ڈھکے پتھر کے اس سفید بلاک پر کھائی کی جانب پشت کر کے بیٹھتے دیکھا تو پوچھ لیا۔

"نہیں..... بس یونہی۔"

وہ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے' ہتھیلی ٹھوڑی کے نیچے جمائے بلند ہوتی سڑک کو گردن اونچی کر کے بہت اداسی سے دیکھنے لگی۔ بارش سے چند لمحے پہلے کا موسم اسے ہمیشہ افسردہ اور بوجھل کر دیا کرتا تھا۔

"کہیں اور بیٹھ جاؤ پری! یہاں سے ذرا پیچھے ہوئیں تو گر پڑو گی۔" نشاء نے بہت فکر مندی سے اسے یوں اتنی خطرناک جگہ پر بیٹھے دیکھ کر کہا تھا۔ اس کا ہلکا پنک اور سفید امتزاج والا لان کا سوٹ پتھر کے سفید بلاک کا حصہ لگ رہا تھا۔

"نہیں گرتی۔" وہ لاپروائی سے گردن موڑ کر پیچھے دکھائی دینے والی سرسبز پہاڑیاں دیکھنے لگی۔ مارگلہ کی پہاڑیوں پر اس روز بادل اترے ہوئے تھے' پانی سے لدے بھاری' سرمئی بادل اور پھر یکایک انہوں نے اپنا بوجھ بارش کے قطروں کی صورت نیچے گرانا شروع کر دیا۔

پریشے نے بے اختیار اپنی دونوں بانہیں سامنے پھیلا دیں' بارش کے ننھے ننھے قطرے اس کی ہتھیلیاں بھگونے لگے تھے' اسی لمحے اس کی سماعتوں میں کسی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز گونجی۔

اس نے ہتھیلیاں نیچے گرا دیں اور کسی خواب کی سی کیفیت میں سر اٹھا کر بلند ہوتی سڑک کو دیکھا۔ اس بلندی سے پیچھے کا منظر اس کی نگاہوں سے اوجھل تھا' ٹاپوں کی آواز وہیں سے آرہی تھی' وہ یک ٹک سڑک کی بلندی کو دیکھے گئی' پہاڑی کی دوسری جانب سے کوئی گھوڑا دوڑتا ہوا اس طرف آرہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی۔ اسے لگا وہ سڑک کے بلند حصے سے نگاہیں ہٹا نہیں سکے گی' وقت جیسے وہیں ٹھہر سا گیا تھا' لمحے تھم گئے تھے' بارش کے قطرے فضا میں رک گئے تھے' ہر طرف خاموشی تھی۔

آنے والے کا سر پہلے نمایاں ہوا تھا' وہ گھوڑے کی باگ تھامے اسے بہت مہارت سے سڑک پر دوڑاتا نشیب کی سمت آرہا تھا۔ اس کا گھوڑا سفید تھا' چونے کے پتھر کے بلاکس سے بھی زیادہ سفید اور چمکدار..... وہ اسی طرف آرہا تھا۔ اس کی نظریں اپنے گھوڑے پر تھیں۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے گئی۔

اتنی دور سے بھی وہ دیکھ سکتی تھی کہ گھڑ سوار کی آنکھوں کا رنگ ہلکا تھا' ہلکا اور بہت چمکدار۔ اس کی رنگت سنہری مائل سرخ و سفید تھی' ناک کھڑی اور یونانی طرز کی تھی'

مغرور بے حد مغرور ناک۔ اس نے آدھی آستینوں والی نیلی شرٹ کے اوپر بغیر بازوؤں والی سفید لیدر جیکٹ جس کی بہت ساری جیبیں تھیں' پہن رکھی تھی۔ گردن کے گرد خوب صورت سرخ رنگ کا مفلر بندھا تھا' جیکٹ اور مفلر ہلکے میٹریل کے تھے جن کا مقصد سردی روکنا نہیں بلکہ یونہی فیشن اور اسٹائل تھا۔ برستی بارش میں اس کے بھورے بال ماتھے پر چپکے ہوئے تھے' مگر وہ جیسے ہر چیز سے بے نیاز اپنے سفید گھوڑے کی جانب متوجہ تھا۔

اس نے اپنا گھوڑا ان دونوں کے قریب سفید بلاکس کے ساتھ روک دیا' اور گردن ترچھی کر کے عقب میں موجود پہاڑیوں کو دیکھنے لگا۔ وہ پیچھے والے منظر سے جیسے غیر مطمئن سا تھا' اسے شاید گھوڑا کھڑا کرنے کی کوئی صحیح جگہ نہیں مل رہی تھی۔

بارش رک چکی تھی' ٹھنڈی ہوا پھر سے چلنے لگی تھی' پری کے کھلے بال اس کے چہرے پر پھر سے آنے لگے تھے' مگر وہ تو اس شخص سے نگاہیں ہٹا ہی نہ پا رہی تھی۔

وہ اب ایک جگہ گھوڑا کھڑا کر کے مطمئن سا ہو گیا تھا' تب ہی گردن میں لٹکتے کور سے کیمرہ باہر نکالا اور چہرے کا رخ ان دونوں کی جانب کیا۔

"بات سنو!" اس نے پریشے کو براہ راست مخاطب کیا تھا اس پل جیسے کوئی طلسم سا ٹوٹا تھا۔ وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔ سحر' خواب' خیال' سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ وہ جیسے اب ہوش میں آئی تھی۔

"جی؟" اس نے اپنے ازلی پر اعتماد انداز میں سنجیدگی سے جواب دیا۔ اسے خود پر حیرت ہوئی تھی کہ وہ اتنی بے خود اور مسحور کیوں ہو گئی تھی؟

گھڑ سوار نے اپنا کیمرہ اس کی جانب بڑھایا۔ "کیا تم میری ایک تصویر اتار سکتی ہو؟" وہ شستہ انگریزی میں اس سے مخاطب تھا۔ اس کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا' اس نے کیمرہ تھام لیا۔

"سنو' تصویر یوں کھینچنا کہ یہ گھوڑا اور پیچھے والے پہاڑ اچھی طرح آئیں۔" وہ جو اتنی دیر سے غالباً اس تصویر کے لیے ہی گھوڑا مناسب جگہ پر کھڑا کر رہا تھا' اب بہت مہذب انداز میں اسے ہدایت دیتے ہوئے بولا۔

اس نے کیمرے کو دیکھا' بالکل ویسا ہی اولمپکس کا ڈیجیٹل کیمرہ وہ بھی استعمال کرتی تھی' اس نے کیمرہ چہرے کے سامنے لا کر اس کی ایل ای ڈی اسکرین کو دیکھا اور پھر ریڈی کہے بغیر تصویر کھینچ لی۔

"تمہارا شکریہ۔ مگر کیا یہ پہاڑ آئے تھے؟" بغیر ریڈی کہے تصویر کھینچنے پر اس اجنبی گھڑ سوار کو قدرے بے چینی ہوئی تھی۔" اس نے ایک نظر اس کی شہد رنگ آنکھوں میں دیکھا اور پھر سر ہلا دیا۔

"ہاں' بہت خوب صورت تصویر آئی ہے۔" نشاء نے پریشے کے ہاتھ میں پکڑے کیمرے کی اسکرین پر موجود تصویر کو دیکھ کر کہا تو اسے خیال آیا کہ نشاء بھی وہاں موجود تھی۔

"ویسے یہ تمہارا گھوڑا ہے؟" نشاء نے ہی اگلی بات کی۔

"نہیں' یہ میں نے کرائے پر لیا ہے اصولاً" اس کو گھوڑے کی باگ تھامے میرے ہمراہ چلنا چاہیے تھا' مگر میں اس کو بھگا کر یہاں لے آیا۔" وہ شکل سے بہت مغرور لگتا تھا' مگر اس وقت بہت بے تکلف انداز میں انگریزی میں کہہ رہا تھا۔

انگریزی؟ پری نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ انگریزی کیوں بول رہا تھا؟ اسے غور سے دیکھنے پر احساس ہوا کہ گھوڑے پر سوار وہ بھورے بالوں اور گوری رنگت والا خوب صورت مرد پاکستانی نہیں' کوئی غیر ملکی تھا۔ وہ اس کی شناخت کے متعلق صحیح اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔

"تم دونوں ایک منٹ ٹھہرو' میں اس آدمی کو اس کا گھوڑا واپس کر آؤں۔" اس نے پھرتی اور مہارت سے گھوڑا موڑا اور اسے بلند ہوتی سڑک کی طرف بھگا کر لے گیا۔

"کتنا گڈ لکنگ تھا یار!" نشاء اس کے جاتے ہی بے حد ستائشی انداز میں بولی۔

"پتا نہیں۔" وہ سر جھٹک کر دائیں جانب کھڑے اونچے پہاڑوں کو دیکھنے لگی۔ بادل اب غائب ہو رہے تھے۔

"اوہ نشاء! وہ اپنا کیمرہ مجھے دے گیا ہے۔" ایک دم اسے ہاتھ میں پکڑے کیمرے کا خیال آیا' وہ پریشان سی ہو گئی۔

"واپس آئے تو دے دینا۔"

حالانکہ وہ اس کے واپس آنے سے پہلے پہلے نکلنا چاہتی تھی' مگر ہاتھ میں پکڑا کیمرہ اسے اس کا انتظار کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

چند منٹ بعد ہی وہ انہیں بل کھاتی سڑک پر سے نیچے اترتے ہوئے اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ گھوڑے پر سوار ہونے کی وجہ سے اس کا قد کاٹھ انہیں ٹھیک سے نظر نہیں

آیا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ ان کے قریب آیا‘ اسے احساس ہوا کہ وہ اس سے خاصا لمبا تھا۔

”وہ سمجھ رہا تھا‘ میں اس کا گھوڑا لے کر بھاگ گیا ہوں۔“ ان کے قریب آکر وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ ہنستے ہوئے اس کی شہد رنگ آنکھیں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔ وہ اندازہ نہ کر سکی کہ وہ ہنستے ہوئے زیادہ پرکشش لگتا ہے کہ لب بھینچے۔

”تم اتنے خطرناک طریقے سے رائیڈنگ کیوں کر رہے تھے؟“ نشاء کو بزرگی جھاڑنے کا شوق تھا سو اس کو اس لاپروائی پر ڈانٹنا اس نے اپنا فرض سمجھا۔

”میڈم! میں پانچ سال کی عمر سے رائیڈنگ کر رہا ہوں اور گھوڑوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سر جھکا۔ وہ اور نشاء سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ واک کرنے لگے‘ پریشے وہیں کھڑی رہی۔ دفعتاً اسے کیمرے کا خیال آیا۔

”سنو!“ ان دونوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

”تمہارا کیمرہ!“ اس نے قدرے زور سے کیمرہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

”شکریہ!“

”سنو‘ تمہیں یوں اپنا اتنا قیمتی کیمرہ دے کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں اگر لے کر بھاگ جاتی تو؟“

وہ پھر مسکرایا۔ ”مجھے پتہ تھا تم ایسا نہ کرتیں۔“ سینے پر ہاتھ باندھے وہ اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا۔

”اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہارا کیمرہ لے کر بھاگ چکا ہوتا۔“

”تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں کیمرہ ہرگز نہ دیتا۔“ وہ مسکراہٹ دبائے‘ بہت سنجیدگی سے بولا۔

”ہونہہ!“ وہ اس کے اس انداز پر سر جھٹک کر دوسری جانب مال پر پھیلی دکانوں کی قطار کو دیکھنے لگی۔ وہاں رش اب بڑھتا جا رہا تھا۔

نشاء نے اس ”بدتمیزی“ پر اسے گھورا بھی‘ مگر وہ تو اس کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

گھڑسوار نے گردن جھکا کر کیمرے کی اسکرین پر نگاہ ڈالی اور زیر لب مسکرایا۔

”اچھی تصویر کھینچنے کا شکریہ۔“ تصویر دیکھ کر اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا اور کیمرہ کور میں ڈال دیا۔ وہ پھر مغرور نظر آنے کی اداکاری کرتی جواب دیے بنا دکانوں کو دیکھتی رہی۔

”تم اس تصویر کا کیا کرو گے؟“ اس کے انداز کی تلخی کو کم کرنے کے لیے نشاء نے بہت دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔

”میں بیس برس بعد ایک سفرنامہ لکھوں گا‘ اس کے فرنٹ پر یہ تصویر لگاؤں گا۔“

”اور اس تصویر کا کیپشن کیا ہوگا؟“ نشاء نے دلچسپی سے پوچھا۔

”میں اس کے نیچے لکھوں گا“ اس کوہ پیما کی تصویر‘ جو راکاپوشی سر کرنے جا رہا تھا۔“ وہ فخر سے بتا رہا تھا۔

پریشے نے تیزی سے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ اسے شاک سا لگا تھا۔ ”تم‘ تم راکاپوشی سر کرنے جا رہے ہو؟“ بے اختیار پوچھ لینے کے بعد اسے یاد آیا کہ..... اس کو تو خود کولا تعلق ظاہر کرنا تھا‘ اسے پچھتاوا سا ہوا۔

”ہاں.....!“ پریشے کی بے ساختگی پر اس نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

”خیر راکاپوشی سر کرنا کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ ایورسٹ یا کے ٹو سر کرنا اصل کامیابی ہے۔“ کہہ کر وہ پھر سے دکانوں کو دیکھنے لگی۔

”ویسے کل ہم لوگ ایک ٹور کمپنی کے ساتھ کالام جا رہے ہیں۔“

نشاء کے بتانے پر اس نے آنکھیں سکوڑ کر مال روڈ کی طرف دیکھا۔ سن شائن ٹریولز کا دفتر سامنے ہی تھا۔ اس نے جیسے ایک لمحے کو سوچا‘ پھر بولا۔

”میں بھی کل کالام جا رہا ہوں‘ سن شائن ٹریولز کے ساتھ تم کس کے ساتھ جا رہی ہو؟“

”واقعی؟ تم تو ہمارے ساتھ جا رہے ہو!“ نشاء کو اس ”اتفاق“ سے از حد خوشی ہوئی تھی۔ پریشے کو کچھ شک سا ہوا تھا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے تمہاری دوست بھی جا رہی ہے کیا؟“ مسکراہٹ لبوں تلے دبائے‘ اس نے بہت معصومیت سے پوچھا۔ پریشے نے رخ قدرے مزید موڑ لیا۔

”ہاں‘ مگر تمہیں کیسے پتہ یہ میری دوست ہے؟“

”بہت آسان..... وہ خوب صورت ہے۔“ اس کے سنجیدہ انداز پر نشاء ہنس پڑی‘ جبکہ پریشے کے ماتھے پر ناگواری کی شکن ابھری تھی۔

”میں نشاء ہوں۔ نشاء سعید اور یہ میری کزن کم دوست ہے‘ ڈاکٹر پریشے جہانزیب۔“

”پاری شے؟“ اس نے اپنے یورپین لب و لہجے میں اس کا نام دہرایا۔

”پاری شے نہیں‘ پری..... شے۔“

”میرے نام کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو نشاء؟“ خود کو یوں موضوع بنتے دیکھ کر وہ تنگ کر اردو میں بولی۔

”یہ مینرز کے خلاف ہے۔ تم دونوں کو میری موجودگی میں اپنی زبان میں بات نہیں کرنی چاہیے۔“ وہ مسلسل پریشے کو دیکھ رہا تھا۔ ایک تو کمبخت بلا کا ہینڈسم تھا‘ اور سے اتنے خوب صورت انداز میں آنکھیں سکیڑ کر دیکھتا تھا‘ وہ خوامخواہ کنفیوژ ہونے لگی۔

”مطلب کیا ہوا تمہاری کزن کے نام کا؟“

”پری چہرہ لڑکی۔ یہ ایران کی ایک شہزادی کا نام تھا۔ اس لیے تو میں اس کو پری کہتی ہوں۔“

”تمہاری کزن پر سوٹ بھی کرتا ہے۔ پری مطلب فیری؛ ہماری زبان میں بھی فیری کو پری کہا جاتا ہے۔“

”تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“

”اوہ سوری! میں افق ارسلان ہوں۔ ترکی سے آیا ہوں۔ ویسے پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہوں مگر ساتھ ساتھ ایک تجربہ کار کلائمبر بھی ہوں۔ تمہارے پاکستان میں دنیا کے سب سے خوب صورت پہاڑ‘ راکاپوشی کے لیے آیا ہوں۔“ اس نے جھک کر اپنا تعارف کروایا۔ ”اور تم لوگ کیا کرتی ہو؟“

”نشاء! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ میں گاڑی کی طرف جا رہی ہوں‘ تم نے چلنا ہے تو چلو۔“ قدرے غصے سے کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی گاڑی کی طرف آگئی۔ عجلت میں افق ارسلان کو خدا حافظ کہہ کر نشاء دوڑتے قدموں کے ساتھ اس تک پہنچی تھی۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے نشی؟ نہ جان نہ پہچان‘ خوامخواہ کسی اجنبی وہ بھی گورے کے ساتھ یوں سرراہ گپیں لگانے کا مقصد؟“ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ نشاء پر برس پڑی تھی۔ چند گز کے فاصلے پر وہ ترک سیاح ان سفید چوکور بلاکس کے ساتھ ابھی تک کھڑا تھا۔ دفعتاً اس نے پری کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا‘ جسے اس نے نظر انداز کر دیا۔

”بھئی میرا مسلمان بھائی ہے‘ ایک برادر اسلامی ملک سے آیا ہے‘ ہمارا مہمان ہے‘ میرا اسلامی فریضہ ہے کہ میں میزبانی نبھاؤں۔“

”اچھی طرح جانتی ہوں میں تمہیں۔ مسلمان لڑکی!“ گاڑی واپس اسلام آباد کے رستے پر ڈالتے ہوئے اس نے دانت پیسے تھے۔ ”کیا ہم اب کسی اور ٹور کمپنی کے ساتھ نہ چلے جائیں؟“

”اس بات کا تو ذکر ہی مت کرنا۔ اگر ہم اس ٹور کمپنی کے ساتھ نہیں جائیں گے تو پھر بالکل نہیں جائیں گے!“ نشاء نے بڑے اطمینان سے فیصلہ سنا دیا۔ وہ خاموش سی ڈرائیونگ کرتی رہی۔ آٹھ دن ندا آپا کے ساتھ یا آٹھ دن اس ترک سیاح کے ساتھ؟ اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچا تھا کیونکہ ندا آپا کے ساتھ آٹھ دن گزارنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ نشاء کو ڈراپ کر کے گھر آئی تو فون بج رہا تھا۔ اس نے کریڈل پر دھرا ریسیور اٹھایا۔ ”ہیلو؟“

”تم اپنی کزن کے ساتھ کہاں جا رہی ہو؟“ ناگواری بھرا بازپرس کرنے والا لہجہ تھا سیف کا۔

”کالام۔ اور بھی لوگ جا رہے ہیں۔“

”ماموں نے مجھ سے پوچھے بغیر تمہیں کیسے اکیلے جانے کی اجازت دے دی؟ کیا اب ہمارے خاندان کی لڑکیاں دور افتادہ علاقوں میں باپ بھائی کے بغیر سڑکیں ناپتی پھریں گی؟“ وہ اس سے واضح طور پر ناراض تھا۔

”بابا نے مجھے اجازت دے دی ہے سیف!“ ایک نیا مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے‘ اس خیال نے اسے تھکا دیا تھا۔

”مگر میں کہہ رہا ہوں کہ تم یوں نہیں جاؤ گی۔ تم اپنی کزن کو منع کر دو۔“ تحکم بھرا انداز۔ وہ بے بسی سے لب کاٹ کر رہ گئی۔

”ہم اسکول میں بھی تو ٹورز کے ساتھ چلے جاتے تھے‘ ایک قابل اعتماد ٹریول ایجنسی کے ساتھ.....“

”یہ یو کے نہیں ہے پریشے!“ اس کا انداز دو ٹوک تھا۔ ”بس تم اپنی کزن کو منع کر دو۔“

”اچھا۔“ پریشے نے فون رکھ دیا۔ چند لمحے آزردگی سے اسے دیکھتی رہی پھر نشاء کا نمبر ملایا۔

”میری آواز سنے بغیر چین نہیں آ رہا جو گھر پہنچتے ہی فون کھڑکا رہی ہو؟“

”نشاء! میں کالام نہ جاؤں تو؟“

نشاء ایک لمحے کو چپ سی ہو گئی۔ ”پری! وہ کچھ دیر بعد

"مگر میں کرنا چاہتی ہوں۔" نشاء بضد تھی۔

"ٹھیک ہے' پھر جا کر اسی کے پاس بیٹھ جاؤ۔"

بقیہ سارا راستہ خاموشی سے کٹا' دن چڑھے بس پشاور کی حدود میں داخل ہوئی سڑکوں پر خاصا رش تھا۔ اوپر سے اپنے جوبن پر چمکتا سورج شہر کو جھلسا رہا تھا۔

"کتنی گرمی ہے یہاں حالانکہ پشاور پہاڑوں پر واقع ہے۔ یار اس سے ٹھنڈا تو ہمارا اسلام آباد تھا۔" نشاء کو اپنا شہر یاد آیا۔

ایک متوسط درجے کے ہوٹل میں ان کی بکنگ ٹور کمپنی نے پہلے سے کروا رکھی تھی۔ اس ہوٹل کے باہر تنگ سی سڑک پر بے تحاشا رش تھا۔ سڑک کے اچھے خاصے حصے پر ریڑھی والوں کا قبضہ تھا۔ گاڑی ایک ڈھلوان پر چڑھ کر ہوٹل کے پارکنگ ایریا تک آئی۔ وہاں گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تھی۔

"ناٹ بیڈ!" بس سے نکل کر نشاء نے تبصرہ کیا۔ پری ہوٹل کی بلند عمارت کو دیکھنے کے بجائے اس سکون کو محسوس کر رہی تھی جو اتنی دیر ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے کے بعد کھڑے ہو کر اس کی ٹانگوں کو ملا تھا۔

ترک سیاہ ان دونوں سے فاصلے پر کھڑا سفید جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے' آنکھیں سکیڑے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا اس کو اپنی طرف متوجہ پا کر مسکرایا' پریشے نے نگاہوں کا رخ پھیر لیا۔

"ہیلو گرلز' کیسی ہو تم دونوں؟" وہ ان کے قریب چلا آیا۔

"اوہ تو آپ ہمیں پہچانتے ہیں؟" نشاء کو اس کا پورا راستہ ان کو لفٹ نہ دینا بہت کھلا تھا' سو طنز کیے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ جواباً" ہنس پڑا۔

"میں نے سوچا صبح صبح نیند سے بے حال ہوتے لوگوں کو نہ جگایا جائے' ذرا کہیں پہنچ جائیں تو آرام سے گپ شپ کرتے رہیں گے۔" وہ مسکراہٹ دبائے سنجیدگی سے بولا۔

پریشے ان دونوں کو چھوڑ کر اس ٹین ایج لڑکی کے پیچھے چلتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

246 نمبر کمرے میں پہنچ کر ظفر نے چابی اس کے حوالے کی۔ وہ ٹرپل بیڈ روم اس کو نشاء اور اس لڑکی کے ساتھ شیئر کرنا تھا۔

"اوکے' شام کو ملاقات ہوگی۔" افق ان دونوں سے کہہ کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ میاں بیوی سامنے والے کمرے میں چلے گئے۔

"میں ڈاکٹر پریشے جہاں زیب ہوں۔" کمرے میں آکر اپنے لبوں پہ مسکراہٹ سجا کر اس نے اس لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں ارسہ بخاری ہوں۔ ویسے آپ کا نام بہت پیارا ہے پریشے!" وہ رکی اور تصحیح کرنے والے انداز میں بولی۔ "پریشے آپی!"

"آپی؟" ان دونوں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"دراصل میں پاکستانی کزنز کو اگر بغیر آپی باجی کہے بلاؤں تو وہ اردو "انگریز" کہہ کر ٹوکتی ہیں' سو میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کسی پاکستانی لڑکی کو آپی باجی کہے بغیر نہیں بلانا۔"

وہ دونوں ہنس پڑیں۔

کھانا انہوں نے ساتھ ہی کھایا تب تک تعارف کا سلسلہ مکمل ہو چکا تھا۔

ارسہ کا تعلق لاہور سے تھا' مگر وہ پلی بڑھی انگلینڈ میں تھی۔ اردو لکھ اور پڑھ لیتی تھی مگر بولتی بہت مشکل سے تھی۔ اس کے پاس اس کم عمری میں بھی ایک اچھا Alpine ریکارڈ تھا۔ زیادہ تر وہ یورپین Alps سر کر چکی تھی' اس کے علاوہ تبت میں اس نے shishapangma اور cho oyu کو سر کیا تھا۔

"تو تم افق کے ساتھ راکاپوشی جا رہی ہو؟" نشاء کو وہ معصوم اور ذہین سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔

"ہاں!" اس نے سر ہلا دیا۔ "راکاپوشی میرے ناول کی سیٹنگ ہے۔ اوہ میں بتانا بھول گئی' میں رائٹر بھی ہوں۔ دو ناول لکھ چکی ہوں' یہ میرا تیسرا ناول ہے۔"

"اتنی سی عمر میں دو ناول؟" پریشے کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ ارسہ ہنس پڑی۔ "محمد بن قاسم نے سترہ سال کی عمر میں سندھ فتح کیا تھا' میں نے تو اس عمر میں صرف پہلا ناول لکھا تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

"اچھا تو تمہارے ناول کی اسٹوری کیا ہے؟" اس کو دلچسپی ہوئی۔

"ایک کوہ پیما ہیرو اور ایک کوہ پیما ہیروئن کی راکاپوشی سر کرنے کی رومینٹک داستان۔" وہ مزے سے بولی۔ نشاء سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔

"اینڈ ہیپی کرو گی یا ٹریجک؟"

"ٹریجک۔ کیونکہ ٹریجک اینڈ یادگار ہوتا ہے۔"

ویسے آپ نہیں آئیں گی راکاپوشی؟ آپ بتا رہی تھیں کہ آپ بھی کلائمبر ہیں۔"

"ہاں' میں نے کمبریا کے ٹو اسکول' لیک ڈسٹرکٹ سے سات ہفتے کے کورسز کیے تھے' مگر میں راکاپوشی نہیں آؤں گی کہ مجھے اپنے فادر کی پرمیشن نہیں ہے۔"

"کمبریا کے ٹو سے؟ واؤ' آئی ایم امپریسڈ!"

"اور سوئس Alps کے علاوہ میں نے spantik کو بھی سر کر رکھا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگی۔

"اوہ ویسے آپ آتیں تو مزا آتا۔ افق بھائی بہت اچھے ہیں۔ میری ان سے ملاقات فلائٹ کے دوران ہوئی تھی۔ وہ مصر سے آرہے تھے اور میں انگلینڈ سے۔"

"اب سوتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ "افق نامہ" شروع کرتی پریشے نے اس کی بات کاٹ دی۔ ارسہ تابعداری سے بستر پر لیٹ گئی۔

نشاء اور ارسہ اس کی ہی باتیں کرتی تھیں۔

جلد ہی اسے نیند نے آن گھیرا۔ پھر وہ شام تک سوتی رہی۔ ارسہ اور نشاء جلدی اٹھ گئی تھیں' اور با آواز بلند گپیں ہانکتے ہوئے انہوں نے اسے بھی جگا ڈالا تھا۔ مگر وہ آنکھوں پر بازو رکھے سوتی بنی رہی۔

دفعتاً" دروازے پر دستک ہوئی پریشے کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ اس نے آنکھوں پر سے بازو نہیں ہٹایا مگر وہ جانتی تھی کہ باہر کون تھا۔ وہ دستک نہیں' افق ارسلان کی خوشبو پہچانتی تھی۔

"اندر آ سکتا ہوں اچھی لڑکیو؟" اس کا شرارت سے کھنکتا لہجہ پریشے کی سماعت سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں پر بازو نہ ہوتا تو وہ شاید اس کی پلکوں کا ارتعاش دیکھ لیتا۔

"لگتا ہے اچھی لڑکیوں کے بغیر دل نہیں لگ رہا۔ آؤ بیٹھو۔" وہ اتنا مہذب' شائستہ اور ہنس مکھ تھا کہ نشاء اور ارسہ فوراً" اس کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے کرسی آفر کی۔

"یونہی سمجھ لو۔" وہ پریشے کے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی اور بیڈ کی پائنتی کے درمیان فاصلہ خاصا کم تھا' جگہ تنگ تھی' وہ بیٹھ تو گیا مگر اس کے جوگرز بیڈ کے سرے کو چھو رہے تھے۔

"میں اس سفر کو یادگار بنانا چاہتا ہوں اور بطور ایک اچھے سیاح' میں کوئی لمحہ فارغ نہیں بیٹھنا چاہتا۔ سو پھر تم لوگ بتاؤ شام کا پروگرام ہے؟" اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ بولتے ہوئے بھی بھٹک بھٹک کر افق کی نگاہیں اسی کے چہرے پر پڑ رہی تھیں جو اس نے آدھا سفید بازو کی اوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ کمبل بھی گردن تک لے رکھا تھا' صرف چہرے کا نچلا حصہ نمایاں تھا۔

"پری اٹھ جائے تو کوئی پروگرام بناتے ہیں۔"

"تمہاری دوست بہت زیادہ سوتی ہے کیا؟" اس کے انداز سے پریشے کو لگا' وہ جان گیا ہے کہ وہ سو نہیں رہی۔

"نہیں آج بس ذرا تھک گئی ہے۔ تم اپنا پروگرام بتاؤ۔"

"میں آج تمہارے پشاور کے بازار' یعنی کینٹ اور صدر وغیرہ کھنگالنے کا سوچ رہا ہوں۔ باقی ٹورسٹ اٹریکشنز کل دیکھوں گا۔"

"تو پھر ہم تینوں بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں افق بھائی! احمر صاحب اور افتخار فیملی کی مرضی وہ جہاں بھی جائیں۔ یا پھر ان سے پوچھ لیں؟" ارسہ متذبذب تھی۔

"وہ کپل بہت ریزرو ہے' وہ یقیناً" ہم سے گھلنا ملنا پسند نہیں کریں گے۔ احمر صاحب تو آدھا گھنٹہ ہوا کہیں چلے بھی گئے ہیں۔ پھر ہم چاروں ساتھ چلتے ہیں' مگر....." وہ ایک لمحے کو رکا' پری کے کان کھڑے ہو گئے۔

"مگر کیا؟"

"مگر ہو سکتا ہے تمہاری دوست کو کوئی اعتراض ہو۔"

"ارے نہیں۔ وہ بہت نائس اور سوئٹ ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"ویسے نشاء! مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ جب تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری دوست میری بہت تعریف کر رہی تھی۔"

پریشے نے ایک جھٹکے سے کمبل اتارا اور تیزی سے سیدھی ہوئی۔

"میں نے کب ایسا کہا تھا؟"

افق کا قہقہہ بے اختیار بلند ہوا تھا۔ اسے اپنی حماقت پر شرمندگی ہوئی۔ نشا اور ارسہ قدرے حیران تھیں' انہیں ابھی "لطیفہ" سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"تم اٹھ گئیں؟ میں سمجھی سو رہی ہو۔"

"میرے سر پر جو تم لوگ گول میز کانفرنس کر رہے ہو' میں بھلا کیسے سکون سے سو سکتی تھی۔" اپنی شرمندگی چھپانے کو اس نے غصے کا سہارا لیا اور بستر سے نیچے اتر گئی۔

"مگر میں کرنا چاہتی ہوں۔" نشاء بضد تھی۔

"ٹھیک ہے' پھر جا کر اسی کے پاس بیٹھ جاؤ۔"

بقیہ سارا راستہ خاموشی سے کٹا' دن چڑھے بس پشاور کی حدود میں داخل ہوئی سڑکوں پر خاصا رش تھا۔ اوپر سے اپنے جوبن پر چمکتا سورج شہر کو جھلسا رہا تھا۔

"کتنی گرمی ہے یہاں حالانکہ پشاور پہاڑوں پر واقع ہے۔ یار اس سے ٹھنڈا تو ہمارا اسلام آباد تھا۔" نشاء کو اپنا شہر یاد آیا۔

ایک متوسط درجے کے ہوٹل میں ان کی بکنگ ٹور کمپنی نے پہلے سے کروا رکھی تھی۔ اس ہوٹل کے باہر تنگ سی سڑک پر بے تحاشا رش تھا۔ سڑک کے اچھے خاصے حصے پر ریڑھی والوں کا قبضہ تھا۔ گاڑی ایک ڈھلوان پر چڑھ کر ہوٹل کے پارکنگ ایریا تک آئی۔ وہاں گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تھی۔

"ناٹ بیڈ!" بس سے نکل کر نشاء نے تبصرہ کیا۔ پری ہوٹل کی بلند عمارت کو دیکھنے کے بجائے اس سکون کو محسوس کر رہی تھی جو اتنی دیر ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے کے بعد کھڑے ہو کر اس کی ٹانگوں کو ملا تھا۔

ترک سیاہ ان دونوں سے فاصلے پر کھڑا سفید جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے' آنکھیں سکیڑے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا اس کو اپنی طرف متوجہ پا کر مسکرایا' پریشے نے نگاہوں کا رخ پھیر لیا۔

"ہیلو گرلز' کیسی ہو تم دونوں؟" وہ ان کے قریب چلا آیا۔

"اوہ تو آپ ہمیں پہچانتے ہیں؟" نشاء کو اس کا پورا راستہ ان کو لفٹ نہ دینا بہت کھلا تھا' سو طنز کیے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ جواباً" ہنس پڑا۔

"میں نے سوچا صبح صبح نیند سے بے حال ہوتے لوگوں کو نہ جگایا جائے' ذرا کہیں پہنچ جائیں تو آرام سے گپ شپ کرتے رہیں گے۔" وہ مسکراہٹ دبائے سنجیدگی سے بولا۔

پریشے ان دونوں کو چھوڑ کر اس ٹین ایج لڑکی کے پیچھے چلتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

246 نمبر کمرے میں پہنچ کر ظفر نے چابی اس کے حوالے کی۔ وہ ٹرپل بیڈ روم اس کو نشاء اور اس لڑکی کے ساتھ شیئر کرنا تھا۔

"اوکے' شام کو ملاقات ہو گی۔" افق ان دونوں سے کہہ کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ میاں بیوی سامنے والے کمرے میں چلے گئے۔

"میں ڈاکٹر پریشے جہاں زیب ہوں۔" کمرے میں آ کر اپنے لبوں پہ مسکراہٹ سجا کر اس نے اس لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھا۔

"میں ارسہ بخاری ہوں۔ ویسے آپ کا نام بہت پیارا ہے پریشے !" وہ رکی اور تصحیح کرنے والے انداز میں بولی۔ "پریشے آپی!"

"آپی؟" ان دونوں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"دراصل میں پاکستانی کزنز کو اگر بغیر آپی باجی کہے بلاؤں تو وہ "انگریز" کہہ کر ٹوکتی ہیں' سو میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کسی پاکستانی لڑکی کو آپی باجی کہے بغیر نہیں بلانا۔"

وہ دونوں ہنس پڑیں۔

کھانا انہوں نے ساتھ ہی کھایا تب تک تعارف کا سلسلہ مکمل ہو چکا تھا۔

ارسہ کا تعلق لاہور سے تھا' مگر وہ پلی بڑھی انگلینڈ میں تھی۔ اردو لکھ اور پڑھ لیتی تھی مگر بولتی بہت مشکل سے تھی۔ اس کے پاس اس کم عمری میں بھی ایک اچھا Alpine ریکارڈ تھا۔ زیادہ تر وہ یورپین Alps سر کر چکی تھی' اس کے علاوہ تبت میں اس نے shishapangma اور cho oyu کو سر کیا تھا۔

"تو تم افق کے ساتھ راکاپوشی جا رہی ہو؟" نشاء کو وہ معصوم اور ذہین سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔

"ہاں!" اس نے سر ہلا دیا۔ "راکاپوشی میرے ناول کی سیٹنگ ہے۔ اوہ میں بتانا بھول گئی میں رائٹر بھی ہوں۔ دو ناول لکھ چکی ہوں' یہ میرا تیسرا ناول ہے۔"

"اتنی سی عمر میں دو ناول؟" پریشے کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ ارسہ ہنس پڑی۔ "محمد بن قاسم نے سترہ سال کی عمر میں سندھ فتح کیا تھا' میں نے تو اس عمر میں صرف پہلا ناول لکھا تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

"اچھا تو تمہارے ناول کی اسٹوری کیا ہے؟" اس کو دلچسپی ہوئی۔

"ایک کوہ پیما ہیرو اور ایک کوہ پیما ہیروئن کی راکاپوشی سر کرنے کی رومینٹک داستان۔" وہ مزے سے بولی۔ نشاء سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔

"اینڈ ہیپی کرو گی یا ٹریجک؟"

"ٹریجک۔ کیونکہ ٹریجک اینڈ یادگار ہوتا ہے۔

ویسے آپ نہیں آئیں گی راکاپوشی؟ آپ بتا رہی تھیں کہ آپ بھی کلائمبر ہیں۔"

"ہاں' میں نے کمبریا کے ٹو اسکول' لیک ڈسٹرکٹ سے سات ہفتے کے کورسز کیے تھے' مگر میں راکاپوشی نہیں آؤں گی کہ مجھے اپنے فادر کی پرمیشن نہیں ہے۔"

"کمبریا کے ٹو سے؟ واؤ' آئی ایم امپریسڈ!"

"اور سوئس Alps کے علاوہ میں نے spantik کو بھی سر کر رکھا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگی۔

"اوہ ویسے آپ آتیں تو مزا آتا۔ افق بھائی بہت اچھے ہیں۔ میری ان سے ملاقات فلائٹ کے دوران ہوئی تھی۔ وہ مصر سے آ رہے تھے اور میں انگلینڈ سے۔"

"اب سوتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ "افق نامہ" شروع کرتی پریشے نے اس کی بات کاٹ دی۔ ارسہ تابعداری سے بستر پر لیٹ گئی۔

نشاء اور ارسہ اس کی ہی باتیں کرتی تھیں۔

جلد ہی اسے نیند نے آن گھیرا۔ پھر وہ شام تک سوتی رہی۔ ارسہ اور نشاء جلدی اٹھ گئی تھیں' اور با آواز بلند گپیں ہانکتے ہوئے انہوں نے اسے بھی جگا ڈالا تھا۔ مگر وہ آنکھوں پر بازو رکھے سوتی بنی رہی۔

دفعتاً" دروازے پر دستک ہوئی پریشے کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ اس نے آنکھوں پر سے بازو نہیں ہٹایا مگر وہ جانتی تھی کہ باہر کون تھا۔ وہ دستک نہیں' افق ارسلان کی خوشبو پہچانتی تھی۔

"اندر آ سکتا ہوں اچھی لڑکیو؟" اس کا شرارت سے کھنکتا لہجہ پریشے کی سماعت سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں پر بازو نہ ہوتا تو وہ شاید اس کی پلکوں کا ارتعاش دیکھ لیتا۔

"لگتا ہے اچھی لڑکیوں کے بغیر دل نہیں لگ رہا۔ آؤ بیٹھو۔" وہ اتنا مہذب' شائستہ اور ہنس مکھ تھا کہ نشاء اور ارسہ فوراً" اس کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے کرسی آفر کی۔

"یونہی سمجھ لو۔" وہ پریشے کے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی اور بیڈ کی پائنتی کے درمیان فاصلہ خاصا کم تھا' جگہ تنگ تھی' وہ بیٹھ تو گیا مگر اس کے جوگرز بیڈ کے سرے کو چھو رہے تھے۔

"میں اس سفر کو یادگار بنانا چاہتا ہوں اور بطور ایک اچھے سیاح' میں کوئی لمحہ فارغ نہیں بیٹھنا چاہتا۔ سو پھر تم لوگ بتاؤ شام کا پروگرام ہے؟" اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ بولتے ہوئے بھی بھٹک بھٹک کر افق کی نگاہیں اسی کے چہرے پر پڑ رہی تھیں جو اس نے آدھا سفید بازو کی اوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ کمبل بھی گردن تک لے رکھا تھا' صرف چہرے کا نچلا حصہ نمایاں تھا۔

"پری اٹھ جائے تو کوئی پروگرام بناتے ہیں۔"

"تمہاری دوست بہت زیادہ سوتی ہے کیا؟" اس کے انداز سے پریشے کو لگا' وہ جان گیا ہے کہ وہ سو نہیں رہی۔

"نہیں آج بس ذرا تھک گئی ہے۔ تم اپنا پروگرام بتاؤ۔"

"میں آج تمہارے پشاور کے بازار' پی کینٹ اور صدر وغیرہ کھنگالنے کا سوچ رہا ہوں۔ باقی ٹورسٹ اٹریکشنز کل دیکھوں گا۔"

"تو پھر ہم تینوں بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں افق بھائی! احمر صاحب اور افتخار فیملی کی مرضی وہ جہاں بھی جائیں۔ یا پھر ان سے پوچھ لیں؟" ارسہ متذبذب تھی۔

"وہ کپل بہت ریزرو ہے' وہ یقیناً" ہم سے گھلنا ملنا پسند نہیں کریں گے۔ احمر صاحب تو آدھا گھنٹہ ہوا کہیں چلے بھی گئے ہیں۔ پھر ہم چاروں ساتھ چلتے ہیں' مگر۔۔۔" وہ ایک لمحے کو رکا' پری کے کان کھڑے ہو گئے۔

"مگر کیا؟"

"مگر ہو سکتا ہے تمہاری دوست کو کوئی اعتراض ہو۔"

"ارے نہیں۔ وہ بہت نائس اور سویٹ ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"ویسے نشاء! مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ جب تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری دوست میری بہت تعریف کر رہی تھی۔"

پریشے نے ایک جھٹکے سے کمبل اتارا اور تیزی سے سیدھی ہوئی۔

"میں نے کب ایسا کہا تھا؟"

افق کا قہقہہ بے اختیار بلند ہوا تھا۔ اسے اپنی حماقت پر شرمندگی ہوئی۔ نشا اور ارسہ قدرے حیران تھیں' انہیں ابھی "لطیفہ" سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"تم اٹھ گئیں؟ میں سمجھی سو رہی ہو۔"

"میرے سر پر جو تم لوگ گول میز کانفرنس کر رہے ہو' میں بھلا کیسے سکون سے سو سکتی تھی۔" اپنی شرمندگی چھپانے کو اس نے غصے کا سہارا لیا اور بستر سے نیچے اتر گئی۔

ڈریسنگ روم تک جانے کے راستے میں افق کی لمبی ٹانگیں حائل تھیں۔ اسے قریب آتا دیکھ کر اس نے پیر سمیٹ لیے۔ وہ پیر پٹختے ہوئے اس تنگ جگہ سے گزری۔

"سوری پری! میں مذاق کر رہا تھا۔" وہ بمشکل ہنسی کنٹرول کرتے معذرت کرنے لگا مگر وہ جھنجلاتی ہوئی' زور زور سے الماری کے پٹ کھول بند کرتی رہی۔

"اچھی لڑکیو! تیار ہو کر لابی میں آجاؤ۔ تمہارے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو پری نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح شرٹ کی آستینیں آدھی مگر رنگ سیاہ تھا اور اوپر سفید ٹورسٹ جیکٹ گردن کے گرد بندھا بلڈ ریڈ مفلر۔

"رائٹ باس!" ارسہ نے تابعداری دکھائی' وہ مسکراتے ہوئے ایک نگاہ خود کو دیکھتی پریشے پر ڈال کر باہر نکل گیا۔ وہ "اف" کہتے ہوئے کلس کر رہ گئی۔

ان پندرہ منٹ میں پریشے نے کوئی دو سو دفعہ ان دونوں کو "ضرور پروگرام بنانا تھا تم نے اس کے ساتھ؟" سنایا تھا۔ نشاء ڈھیٹ بنی سنتی رہی' ارسہ کو البتہ حیرت ہوئی تھی۔

"یہ پریشے آپی کی کوئی لڑائی ہوئی ہے افق بھائی سے؟ وہ تو اتنے کیئرنگ اور سوئٹ ہیں۔"

"یہ صدیوں کی داستان ہے' تمہیں ایک شام میں نہیں سمجھ آسکتی۔" نشا نے آہ بھر کر کہا تھا' ہیئر برش کرتے پریشے کے ہاتھ ایک لمحے کو تھمے تھے۔ وہ اندر سے کانپ کر رہ گئی تھی۔ پلٹ کر ایک شاکی نظر نشاء پر ڈالی اور دوسری اپنی انگلی میں موجود ایمرلڈ رنگ پر۔ نشاء نے لاپروائی سے کندھے اچکا دیے۔ ارسہ کے سر کے اوپر سے سب کچھ گزر گیا تھا۔

وہ پیر پٹخ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ نشاء کی بات وہ عموماً مانا نہیں کرتی تھی مگر اب اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ نشاء اور ارسہ چلی جاتیں تو اس نے بھلا کیا قصور کیا تھا جو وہ اکیلی اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھی رہتی؟ یوں بھی افق کے ساتھ مارکیٹ جانا اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ البتہ یہ ظاہر کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔

پارکنگ ایریا میں کھڑی ٹور کمپنی کی بس کے ساتھ افق ٹیک لگائے کھڑا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کو دیکھ کر سیدھا ہو گیا۔ ایک استقبالیہ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا تھا۔ پی کیپ اب بھی اس کے سر پر تھی۔

"کینٹ چلتے ہیں' یہاں سے بہت قریب ہے۔" ان کو لیڈ کرتے ہوئے وہ ہوٹل کے پارکنگ ایریا سے نیچے سڑک تک جاتی ڈھلوان سے اتر رہا تھا۔

"تم ترکی سے آئے ہو یا صوبہ سرحد سے؟" نشاء کو اس کی پشاور اور اردگرد کے متعلق معلومات حیران کرتی تھیں۔

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ "بس پچھلی دفعہ ادھر آیا تھا تو خاصے دن یہاں گزارے تھے۔ اس لیے آئیڈیا ہو گیا ہے۔"

"پچھلی دفعہ کب آئے تھے؟"

"دو سال پہلے۔" وہ لوگ ڈھلوان اتر کر نیچے سڑک پر آ چکے تھے۔ سڑک اچھی خاصی کھلی تھی مگر پھلوں کی ریڑھیوں اور خوانچہ فروشوں کے باہمی تعاون سے اب بہت تنگ ہو چکی تھی۔ اس جگہ ہوٹلز تھے یا پی سی او۔

"دو سال پہلے کیا سیر و سیاحت کے لیے آئے تھے؟" ریڑھیوں سے دونوں اطراف میں گھری سڑک پر راستہ بنا کر چلنا بہت مشکل تھا' پھر بھی وہ بہت دھیان سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ "ہاں سیر و سیاحت کے لیے اور ....." بولتے بولتے وہ یکدم خاموش ہو گیا۔

"اور..... بس کچھ کام تھا۔" وہ صاف ٹال گیا تھا۔ نشاء میں اتنے تو مینرز تھے ہی کہ اگر وہ ٹال رہا تھا تو وہ اس کام کی تفصیل نہ پوچھتی۔

افق نے ٹیکسی روکی' ٹیکسی والا انگریزی سے نابلد تھا' کرایہ کا معاملہ نشاء نے ہی طے کیا۔

کینٹ کی خوب صورت دکانوں کے باہر آہستگی سے چلتے ہوئے وہ چاروں خاصی دیر تک ونڈو شاپنگ کرتے رہے' پھر ارسہ ان کو چھوڑ کر سعید بک بینک کی طرف چلی گئی۔ وہ تینوں ایک جیولری شاپ میں داخل ہو گئے۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ جب نشاء مختلف ایئر رنگز دیکھ رہی تھی تو اپنی ڈھیلی پونی کو کستے ہوئے پریشے کے بالوں کو جکڑا ربر بینڈ ٹوٹ گیا۔ اس کے بال کسی آبشار کی طرح کمر پر گر گئے۔

"نشی! تمہارے پاس کوئی کیچر ہے؟" اپنے لمبے لیئرز میں کٹے بالوں کو سنبھالتی وہ پریشانی سے نشاء سے بولی۔

"اپنا خریدتے ہوئے تمہیں موت پڑتی ہے؟" وہ بہت مصروف تھی' سو کھٹ سے بولی۔

"دفع ہو جاؤ۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے سامنے شوکیس پر

پڑی باسکٹ میں رکھے کیچرز اور پونیاں دیکھنے لگی۔

"یہ کیسا ہے؟"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ افق ہاتھ میں ایک کیچر لیے اسے دکھا رہا تھا۔ اس نے نظریں جھکا کر کیچر کو دیکھا۔ وہ سلور کلر کا تھا' اس کے نیچے ایک طرف گول بڑا سا فیروزی رنگ کا پتھر جبکہ دوسری طرف سبز اور نیلا دو رنگا پتھر جڑا تھا۔

"اچھا ہے۔" اس نے خوب صورت کیچر لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا' افق نے وہ اس کی ہتھیلی پر رکھنا چاہا' پکڑتے پکڑتے وہ زمین پر گر پڑا۔ وہ گھبرا کر جھکی اور کیچر اٹھا لیا۔ اس کے دو رنگے پتھر کے درمیان ضرب لگنے سے ایک ہلکی سی سیدھی لکیر پڑ گئی تھی۔

"ٹوٹ تو نہیں گیا؟" وہ پوچھ رہا تھا' اس نے نفی میں گردن کو جنبش دی۔ پھر اسے نظرانداز کر کے سیلزمین سے قیمت پوچھی۔

"دو سو پچاس روپے۔"

افق نے پیسے دکان دار کی طرف بڑھائے۔

"سوری' یہ میں خود خریدوں گی۔" اس نے دبی آواز میں اسے ٹوکا۔

"میں اس لالچ میں تمہیں یہ گفٹ کر رہا ہوں کہ کل کو تم بھی مجھے کوئی چیز گفٹ کرو گی۔"

"میں گفٹس نہ لیتی ہوں نہ دیتی ہوں۔ اس نے پرس میں سے پیسے نکالے۔" مگر میں دیتا بھی ہوں اور لینا بھی پسند کرتا ہوں۔" وہ بضد تھا۔ اس نے نظرانداز کر کے پیسے سیلزمین کو تھمائے' خاکی لفافے میں پیک کیا گیا کیچر نکال کر بالوں میں لگایا اور نشاء کی طرف آگئی۔

ارسہ کے آنے اور نشاء کی شاپنگ مکمل ہو جانے کے بعد وہ لوگ باہر نکل آئے۔ باہر اندھیرا اچھل رہا تھا' شاپس کے اندر اور باہر روشنیاں جگمگانے لگی تھیں' اسٹریٹ لائٹس اور سائن بورڈز بھی جل اٹھے تھے۔

"رات کے کھانے کے لیے میں تم لوگوں کو پشاور کے بہترین ریسٹورنٹ لے چلوں؟" وہ ان کے دائیں طرف' جیبوں میں ہاتھ ڈالے سامنے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا' وہ اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"پی سی؟" ارسہ نے جھٹ پوچھا۔

"نہیں' میں بدمزہ' باسی اور پھیکے کھانوں سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔ میں تمہیں ایک بہتر جگہ لے کر جا رہا ہوں۔"

شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے ٹیکسی میں انہیں وہ ایک ایسی تنگ گلی میں لے آیا جہاں بے تحاشا تیسرے درجے کے ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے' فضا میں ہر طرف مزے دار مسالوں کی خوشبو پھیلی تھی۔

وہ انہیں نمک منڈی لے آیا تھا۔ پریشے کو حیرت ہوئی تھی' وہ اس کے ملک کو اس سے زیادہ جانتا تھا۔

نمک منڈی کی نمک والی کڑاہی کھا کر جب وہ لوگ وہاں سے نکلے تو نشاء نے بے اختیار پوچھ لیا۔

"تم اگر ان جگہوں پر اتنی دفعہ گھوم چکے ہو تو اب پھر کیوں ادھر آئے ہو؟"

"یہی تو میں کہہ رہی تھی۔ اچھے بھلے ہم جولائی میں ہی راکاپوشی کلائمب شروع کر دیتے' خوامخواہ ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی! پتہ نہیں افق بھائی کو اچانک ان علاقوں کا وزٹ کرنے کا خیال کیوں آگیا اور مجھے بھی ساتھ گھسیٹ لائے۔" ارسہ بے اختیار بول اٹھی۔ افق نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اپنے ہوٹل کے کمرے میں واپس آکر نشاء پھر رطب اللسان تھی۔

"میں نے اتنا سوفٹ' نائس اور اچھا انسان زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا ہے۔"

"اور نہیں تو کیا۔ جتنی معلومات ان علاقوں کے متعلق ان کو ہیں' میرا خیال ہے وہ ایک بہت کامیاب سفرنامہ نگار بن سکتے ہیں۔"

"رہنے دو ارسہ!" وہ جوتی وی ٹرالی کے قریب کھڑی' پانی کی بوتل منہ سے لگائے پانی پی رہی تھی' قدرے خفگی سے بوتل منہ سے ہٹائی۔ "یہ مغربی دنیا کے لوگ ہمارے ملک میں آکر معلومات اس لیے اکٹھی نہیں کرتے کہ عالمی دنیا کو ہمارا سوفٹ امیج دکھائیں' بلکہ اگر تم ان گوروں کے سفرنامے اٹھا کر پڑھو تو تمہیں علم ہو کہ یہ لوگ ہمارے بارے میں کیا کیا زہر اگلتے ہیں۔ ہمیں جاہل' پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ کہتے ہیں۔ تمہارے یہ افق ارسلان بھی ترکی جا کر یہی کام کریں گے۔ سفرنامہ لکھ کر عالمی برادری کو یہ بتائیں گے کہ ہمارا ملک کتنا قدامت پسند' غریب' اور سہولیات سے نابلد ہے' یہاں کتنی گندگی اور بدنظمی ہے۔ یہ سارے ایک جیسے ہوتے ہیں' پروپیگنڈا کرنے والے۔"

بوتل رکھ کر وہ پلٹی تو ساکت رہ گئی۔ افق لب بھینچے کھڑا تھا۔ وہ یقیناً ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے انہیں شب بخیر کہنے

آیا تھا اور چونکہ وہ ارسہ کے لیے انگلش میں بات کر رہی تھی تو نہ سن لینے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ یکدم تیز تیز قدم اٹھاتا راہداری سے واپس پلٹ گیا۔ نشاء اور ارسہ نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کی ناراضی وہ محسوس کر چکی تھیں۔ احساس تو اسے بھی تھا اندر سے وہ بہت پشیمان اور بے چین تھی مگر خاموشی سے لیٹ گئی اور تکیہ منہ پر رکھ لیا۔

"تمہارے پیسے!" نشاء نے اس کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر 250 روپے رکھے تو اس نے حیرت سے تکیہ چہرے سے ہٹایا۔

"کون سے پیسے؟" "وہ اس جیولری شاپ والے نے واپس کیے تھے۔ کہہ رہا تھا' تم نے زائد دے دیے ہیں تم اس وقت ارسہ سے بات کر رہی تھیں' میں دینا بھول گئی'۔"

اس کے انداز میں ہلکی سی خفگی تھی۔

وہ کچھ دیر تو کچھ بول ہی نہ سکی۔ جو کیچڑ اس نے بہت استحقاق سے لگا رکھا تھا اس کی ادائیگی اس نے کی تھی جس کی وہ چند منٹ پہلے بے عزتی کر چکی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ' وہ ڈھائی سو روپے اسی وقت اس کے منہ پر مار کر آئے اور وہ مار بھی آتی مگر اس نے احمر صاحب کے ساتھ کمرہ شیئر کیا تھا۔ اور پھر جو کچھ وہ کر چکی تھی۔ سو اب مجبوری تھی' وہ خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گئی۔ پیسے اس نے پرس میں رکھ لیے' جتنا وہ اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتی' وہ اتنا اس کے راستے میں آجاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

سوموار' 25 جولائی' 2005ء

پوری رات بے چین و مضطرب رہنے کے باعث وہ ٹھیک سے سو نہیں سکی تھی' صبح خاصی دیر سے آنکھ کھلی۔ دن چڑھ چکا تھا' اے سی کی فل کولنگ کے باوجود سورج کی شعاعیں کھڑکیوں کے پردے کے پیچھے سے جھانک رہی تھیں۔ اس نے کسل مندی سے کروٹ بدلی۔ نشاء اور ارسہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔

"مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو تم لوگ؟" بغیر کسی "صبح بخیر" کے اس نے لیٹے لیٹے ہی دونوں کو مخاطب کیا۔

"صبح سے ایک سو دس آوازیں دے چکی ہوں کہ اٹھ جاؤ۔ مگر تم پتا نہیں کون سے اصطبل بیچ کر سو رہی تھیں۔ ابھی ارسہ تم پر پانی پھینکنے لگی تھی۔" وہاں سے بھی تڑسے جواب آیا تھا۔ وہ شرمندہ ہوئے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

شہلا افتخار کو شاپنگ کے لیے جانا تھا' ان کی بہن کی شادی عید کے بعد تھی تو وہ اس کو تحفہ دینے کے لیے کوئی کراکری یا الیکٹرونک کا سامان خریدنا چاہتی تھی' نشاء کو بتایا تو اس نے فوراً "ساتھ چلنے کی ہامی بھری۔

جب وہ سب باہر نکلے تو پریشے کی متلاشی نگاہیں افق کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔ بے اختیار اسے اپنی رات والی حرکت یاد آئی تھی "شرمندگی ورمندگی نہیں ہے مجھے' بلکہ ابھی تو مجھے وہ کیچڑ بھی اس کے منہ پر مارنا ہے مگر وہ ملے تو نا!" وہ شاید خود کو تسلی دے رہی تھی۔

"سنو ارسہ! کون کون جا رہا ہے حیات آباد؟" بہت لاپروا انداز میں ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے ارسہ کو مخاطب کیا۔

"ہم سب!"

اب اس "ہم سب" میں وہ شامل تھا یا نہیں۔ وہ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ ارسہ اور نشاء کے تیور بھی بتانے والے نہیں تھے۔ سو وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چلتی رہی۔

پھر حیات آباد پہنچ کر بھی وہ خاموش ہی رہی۔ گرمی زوروں کی تھی' اوپر سے شہلا اور نشاء کی پختون دکان داروں سے بحث سن کر ہی وہ اکتا گئی۔ شہلا کو ایک ڈنر سیٹ پسند آیا مگر وہ آٹھ ہزار کا تھا۔

"کچھ رعایت کرو بھائی! میں کوئی پہلی دفعہ آرہی ہوں تمہاری دکان پر؟"

ابھی راستے میں ہی تو افتخار صاحب نے بتایا تھا کہ وہ اور شہلا حیات آباد چھوڑ' پشاور ہی پہلی دفعہ آئے تھے۔

"باجی! ام سے قسم لے لو' یہ ڈنر سیٹ آپ کو پوری مارکیٹ میں اس سے کم کوئی نہیں دے گا۔ خالص جاپان کا مال ہے اور باقی لوگ مارکیٹ میں چے نا (چائنا) کا مال رکھتا ہے....." دکاندار اٹھارہ انیس سالہ گورا چٹا لڑکا تھا' چہرے پر چھوٹی داڑھی اور شلوار ٹخنوں سے اوپر تھی۔

شہلا نے ڈنر سیٹ چھ ہزار میں خریدا۔ دوسری دکان پر وہی ڈنر سیٹ تین ہزار میں مل رہا تھا۔ مگر پریشے کو یقین تھا کہ وہ ڈنر سیٹ چار پانچ سو سے زیادہ کا نہیں ہوگا۔ آخر کو چائنا اور افغانستان سے آنے والا اسمگل شدہ مال تھا۔

وہ حیات آباد کے پٹھان اور سکھ دوکانداروں سے خاصی بور ہوئی تھی۔ شام کو جب وہ واپس آئی' تب تک افق کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ ارسہ اور نشاء اس

کے بارے میں کچھ پوچھیں گی مگر وہ تو شاید اسے بھول بھی چکی تھیں۔

بے حد تھکاوٹ کے باوجود بھی پری سو نہ سکی۔ اگر وہ ناراض تھا تو وہ اسے منانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی مگر وہ ایک دفعہ نظر تو آئے۔ کدھر چلا گیا تھا؟ شاید واپس؟ یہ خیال ہی بہت تکلیف دہ تھا۔ اگر وہ واپس چلا گیا تھا تو وہ ادھر کیا کر رہی تھی؟ اس کو بھی واپس چلے جانا چاہیے۔

"تو کیا وہ صرف افق کے لیے یہاں تک آئی تھی؟" اس خیال نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ "نہیں' میں تو ندا آپا سے۔" اس کی دلیل بہت کمزور تھی۔

رات کو نشاء اور ارسہ اسے پشاور کے مشہور "جلیل کے چپل کباب" کھلانے لے گئیں۔ افق کا کوئی پتا نہ تھا۔ اس پر ایک بے نام سی اداسی طاری تھی۔ وہ جو ایک دن بعد ہی بیچ راستے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا' وہ اس کا خوابوں کا شہزادہ کیسے ہو سکتا تھا؟

جلیل کے اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں سبز گھاس پر رکھی کرسی پر بیٹھی وہ یہی سوچ رہی تھی۔ لان کی طرح کے سبز گھاس سے ڈھکے قطعہ اراضی کے چاروں طرف سفید باڑ لگی تھی' رات کا وقت تھا' روشنی کے لیے باہر ایک دو ٹیوب لائٹس لگی تھیں اور یہ مدھم مدھم سی روشنی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"تمہیں کچھ اور لینا ہو تو بتا دو!" نشاء نے اس کی رائے مانگی' اس نے چونک کر نشاء اور باوردی ویٹر کو دیکھا' پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ تو ٹھیک سے سُن بھی نہ پائی تھی کہ [illegible] اور نشاء نے کیا آرڈر دیا تھا' سجی اور شاید چپل کباب..... اس کا دماغ تو سیف اور افق کے درمیان پھنسا تھا۔

"معاف کرنا لڑکیو! میں ہرگز دیر سے نہیں آنا چاہتا تھا' مگر مجھے راستے میں ایک دلچسپ آدمی مل گیا جو کسی زمانے میں پورٹر تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ بہت معذرت!"

نہایت عجلت میں ہمیشہ کی طرح بشاش لہجے میں کہتے ہوئے اس دراز قد اور اٹھی ہوئی ناک والے ترک سیاح نے ارسہ کے ساتھ والی کرسی سنبھالی۔ ایک لمحے کو تو پریشے کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا' مگر دوسرے ہی لمحے وہ شانت ہوگئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا کوئی گمشدہ حصہ اسے واپس مل گیا ہو۔

وہ آگیا تھا' وہ اسے چھوڑ کر نہیں گیا تھا' یہ احساس ہی اس کی دن بھر کی مضمحل طبیعت کو قرار دینے کو کافی تھا۔ وہ ایک دم اتنی پرسکون ہوگئی تھی کہ اسے بے اختیار خود پر بھی حیرت ہوئی۔

"اچھا.... وہ کیا کہہ رہا تھا؟" ارسہ نے بہت دلچسپی سے پوچھا۔ وہ ایسے بیٹھے تھے کہ پریشے کے بائیں طرف نشا اور سامنے افق تھا اور نشا کے سامنے ارسہ بیٹھی تھی۔

افق مسکراتے ہوئے اسے وہ باتیں بتانے لگا جو اسے اس پورٹر سے معلوم ہوئی تھیں۔ ایک دفعہ بھی اس نے نظر اٹھا کر پریشے کو نہیں دیکھا تھا۔

"اور نشاء' تمہارا دن کیسا گزرا" کارخانہ بازار" میں دماغ تو خالی ہو گیا ہوگا اب تک؟" اب اس نے رخ سیدھا کر کے نشاء کو مخاطب کیا' پریشے کو وہ مکمل طور پر نظر انداز کر رہا تھا۔

"بہت تھکا دینے والا! ایک آدمی پندرہ ہزار کا کارپٹ بیچ رہا تھا' میں نے جان چھڑانے کو کہا' پندرہ سو میں دے دو' اور کیا تم یقین کرو گے' وہ بولا' ہاں لے لو! میرے خدایا۔"

افق لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے بہت دھیان سے سن رہا تھا۔ خود کو یوں نظر انداز ہوتے دیکھ کر وہ اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی' اس کے انداز میں اضطراب تھا۔

وہ بات کرتا تھا تو وہ رکھائی برتتی تھی۔ اب وہ دور ہو رہا تھا تو وہ بہت بے چین ہو گئی تھی۔ اگرچہ بظاہر بے نیاز تھی۔

ویٹر ہاتھ میں پکڑی بڑی سی ٹرے لیے ان کی میز پر پہنچا تو اس نے چہرہ اونچا کیا۔ پہلی نگاہ سیدھی افق پر پڑی' وہ ویٹر کی طرف متوجہ تھا۔ آج اس نے گرے شرٹ اور بلیک پینٹ پہن رکھی تھی۔ سفید جیکٹ اور سرخ مفلر غائب تھا۔ گرے شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک فولڈ کر رکھی تھیں' پی کیپ سے بھورے بال چھپ گئے تھے۔

"میں نے تمہیں جلیل ریسٹورنٹ کا اس لیے کہا تھا کیونکہ مجھے ان کے چپلی کباب نہیں' بلکہ ان کے نان زیادہ پسند ہیں۔" سفید' بے حد سفید۔ آنسو کی شکل کے نان پلیٹ میں نکالتے ہوئے وہ مسلسل بول رہا تھا۔

پریشے کے قدموں کے قریب ایک سفید بلی چکراتی پھر رہی تھی اسے دیکھ کر اسے اپنی بلی یاد آگئی' ساتھ ساتھ روشان اور رنی کا رویہ بھی یاد آیا تھا۔ اس نے تھوڑا سا کباب توڑ کر نیچے گھاس پر پھینکا' بلی نے جھٹ اسے منہ میں ڈال لیا۔ وہ مسکرا دی۔ اب وہ ایک نوالہ خود لیتی اور ایک

بلی کو دیتی۔ وہ اپنے تئیں افق کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں لاسٹ ٹائم ادھر آئی تھی تو جلیل بھی آئی تھی مگر وہ یہ والا نہیں تھا۔" ارسہ کہہ رہی تھی۔

"یہاں ایک سے زیادہ جلیل ہیں۔ بہرحال یہ جلیل اوریجنل ہے۔" وہ واقعی ان کے مالک کو بہت زیادہ جانتا تھا۔

"ویسے افق بھائی! آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں ہے کہ آپ اتنا کھاتے ہیں۔ ایک کوہ پیما کے لیے یہ خاصی عجیب بات ہے۔"

"دیکھو' میرا زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں' ایک وہ جو کھا کر مرتے ہیں' اور دوسرے وہ جو بغیر کھائے مرتے ہیں۔ مرنا سب نے ہے' سو بہتر ہے کہ کھا کر مرا جائے۔"

وہ سر جھکائے بلی کو کباب کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کھلا رہی تھی۔

"ویسے آپ نے سارا دن کیا کیا؟ ہمارے بغیر بور تو ہوئے ہوں گے نا؟"

"قطعاً" نہیں۔ میں میوزیم اور دیگر ٹورسٹ اٹریکشنز دیکھ آیا ہوں' اور میں نے خوب مزا کیا۔ جو آزادی تنہائی میں ہوتی ہے۔ وہ یقین جانو دو لڑکیوں کے ساتھ ہرگز نہیں مل سکتی۔"

اس نے تین کے بجائے دو لڑکیاں کہا تھا' اس کے دل کو تکلیف ہوئی تھی۔

"آپ نے چاول وغیرہ لے لیے؟"

"ہاں۔"

"اور مچھلی بھی؟"

"او ہو ارسہ..... میں بچہ نہیں ہوں۔ پچھلے چودہ سال سے کلائمبنگ کر رہا ہوں۔" وہ بے اختیار ہنسا تھا۔ "میں نے فوڈ سپلائی بالکل درست رکھی ہے' انشاء اللہ ہم راکا پوشی کی چوٹی پر بھوک سے نہیں مریں گے۔"

ویٹر بل لے آیا تھا' افق نے بل خود پے کیا۔ وہ ان کے ہمراہ ہوتا تو ریسٹورنٹ کا بل' ٹیکسی کا بل اور ٹپ وغیرہ خود دیتا تھا۔ نشاء نے بہت دفعہ ٹوکنے کی کوشش کی مگر اس معاملے میں وہ خاصی انا والا تھا۔ اب بھی اس نے سو روپیہ ٹپ رکھی تو ویٹر حیران سا ہو گیا۔

"یہ کیا ہے سر؟"

"رکھ لو نیور مائنڈ!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بلی جس کا پیٹ آدھا چپل کباب کھا کر بھی نہیں بھرا تھا' پریشے کے قدموں کے ساتھ لوٹنے لگی۔ وہ البتہ اچھنبے سے ویٹر کی حیرانی کو دیکھ رہی تھی۔ یہ اسے بعد میں علم ہوا تھا کہ پشاور میں ٹپ یا بخشش کا کوئی رواج نہ تھا۔

وہ پرس اٹھا کر دو قدم آگے بڑھی تو بلی نے بے اختیار میاؤں کی آواز نکالی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا' افق اسی طرح سے میز کے پیچھے سے نکل کر آ رہا تھا۔ اس نے بلی کو دیکھا' افق نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں بلی کو دیکھا۔

"اوہ ہاؤ سوئٹ!" جھک کر اس نے بایاں بازو بڑھایا اور بلی کو اٹھا لیا۔ اب وہ اس کی نرم فر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے پیار کر رہا تھا۔ ٹیوب لائٹ کی دور سے آتی مدھم روشنی اور چاند کی چاندنی اس کے چہرے کے نقوش کو بہت خوب صورت بنا رہی تھی۔

بلی نے اس کے پیار کو خاصا مائنڈ کیا تھا۔ وہ ایک دم چھلانگ لگا کر پریشے کے قدموں میں آئی اور اپنی کمر اور دم اس کے پاؤں سے رگڑنے لگی۔ اس نے چونک کر قدموں میں لوٹتی بلی کو دیکھا اور پھر گردن اٹھا کر افق کو' وہ بلی پر ایک نگاہ ڈالتا سائیڈ سے نکل گیا تھا۔

اسے بے اختیار رونا سا آیا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ اتنی بے اعتنائی اور بے رخی کیوں برت رہا تھا؟

جھک کر اس نے بلی کی سفید' نرم کھال پر چمکارنے والے انداز میں ہاتھ پھیرا۔ اسی کھال کو ابھی افق نے چھوا تھا۔ جس کے لمس کی تمازت اسے محسوس ہوئی تھی' اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور تقریباً بھاگتی ہوئی ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی' جہاں وہ سب کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

افق البتہ ایک چھوٹے سے بچے کی جانب متوجہ تھا' جو بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کا لباس ابتر اور پاؤں ننگے تھے۔

"یہ لو اور ان سے شوز خریدنا۔" افق نے پانچ سو کا نوٹ بچے کی طرف بڑھایا' بچے نے وہ جھپٹ لیا اور تیزی سے وہاں سے بھاگ گیا کہ شاید وہ واپس نہ مانگ لے۔ افق پیچھے سے بے چینی اور فکرمندی سے اس کو بھاگتے دیکھتا رہا۔ پھر بے اختیار سر جھٹکا۔

"کاش میں ان پہاڑوں میں بسنے والے بچوں کے لیے کچھ کر سکوں۔"

وہ خاموشی سے لب کاٹتی' سر جھکائے ٹیکسی میں بیٹھ گئی

-

☼ ☼ ☼

منگل 26 جولائی 2005ء

ہوٹل کی لابی میں ری سیپشن ڈیسک کے سامنے دیوار کے ساتھ چند صوفے رکھے تھے۔ وہ ایک صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔

شہ سرخیوں پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے وہ باقی لوگوں کے نیچے اترنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ظفر پہلے ہی باہر بس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ ابھی تک سب اوپر تھے۔

"انٹرنیشنل کال ریلیز ہے۔" انگریزی لب ولہجہ اس کی سماعت سے ٹکرایا' اخبار پڑھتے پڑھتے اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کی جانب کمر کیے ری سیپشن ڈیسک پر کہنی رکھے قدرے جھک کر ریسپشنسٹ سے کہہ رہا تھا۔ اس کی گردن کے پچھلے حصے میں اسے سرخ مفلر دکھائی دے رہا تھا' بھورے بالوں پر پی کیپ بھی تھی۔ اس نے شاید ابھی تک پریشے کو نہیں دیکھا تھا۔

اسے بے اختیار اس کا رات والا مغرور اور بے رخی سے بھرا انداز یاد آگیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

افق نے ڈیسک کلرک کو ایک لمبا چوڑا نمبر بتایا' کلرک نے سلسلہ ملنے پر ریسیور افق کو تھما دیا۔

"سلام ولیکم آنے۔" اپنے مخصوص ترک لب و لہجے میں وہ اپنی زبان میں بہت پرجوش انداز میں بات کر رہا تھا۔ آخر میں اس نے "گلو گلو آنے" کہہ کر ریسیور رکھ دیا

"ایک کال اور کرنی ہے۔" اس نے دوبارہ ایک اور لمبا چوڑا نمبر ملایا۔

"مرحبا' از دس Jumas؟ آئی ایم ارسلان۔ کین آئی سپیک ٹو مسٹر جینک یقین پلیز؟" وہ کسی "جینک یقین" سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔

مطلوبہ شخص شاید لائن پر آگیا تھا' وہ یک دم بہت بے تکلف انداز میں بات کرنے لگا۔ انگریزی کے چند جملوں کے باعث وہ اتنا سمجھ چکی تھی کہ مخاطب سے اس کی خاصی بے تکلفی تھی اور وہ اس کو اپنے پشاور سے سوات جانے کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا۔ دوسری جانب سے کسی نے کچھ کہا تو وہ بے اختیار ہنس پڑا اور بولا۔ "میں نے بچپن میں [illegible] کہانیوں میں جو بات پڑھی تھی' وہ آج سچ ہو گئی ہے۔ یقین کرو' قراقرم کے پہاڑوں پر واقعی پریاں اترتی ہیں۔"

پریشے کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا' اس کے ہاتھوں پر نمی در آئی تھی۔ اس نے گھبرا کر چہرہ بالکل جھکا لیا اور اخبار رخ کے آگے کر لیا۔ وہ یقیناً اس کی موجودگی سے بے خبر' اب اپنی مادری زبان میں الوداعی کلمات ادا کر رہا تھا۔ گلو گلو کہہ کر اس نے ریسیور رکھا' پیسے ادا کیے' بقیہ رقم بٹوے میں ڈالی اور بٹوہ جیب میں رکھتے ہوئے پلٹا ہی تھا کہ اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹکا۔ پریشے نے اپنا سر اتنا جھکایا ہوا تھا کہ وہ اس کے چہرے کی اڑی اڑی رنگت نہیں دیکھ سکتا تھا' وہ بس ایک لمحے کو وہاں رکا' اور پھر باہر نکل گیا۔

اس نے اخبار میز پر رکھ دیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ وہ جسے اس کی بے رخی اور بے اعتنائی سمجھ رہی تھی' وہ سوائے ایک مصنوعی خول کے کچھ نہ تھا؟ وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہا تھا اور کیوں سوچ رہا تھا؟ اور وہ خود مسلسل تین دن سے اس کے متعلق کیوں سوچے جا رہی تھی۔ وہ ایک منگنی شدہ لڑکی تھی' حالانکہ منگنی کوئی شرعی تعلق نہ تھا' پھر بھی اسے لگتا تھا کہ اسے سیف کے علاوہ کسی کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ اسی لیے اس کو خود سے دور رکھ رہی تھی' وہ دراصل خود سے لڑ رہی تھی۔ پچھلے تین دن سے جاری اس اعصابی جنگ میں اب وہ تھکنے لگی تھی۔

وہ کب بس میں بیٹھی' بس کب چلی' اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

زندگی کی سچائیاں اور حقیقتیں کتنی تلخ ہوتی ہیں نا۔ وہ قفس میں بند تھی' اپنی مرضی سے سوچ بھی نہیں سکتی تھی' نومبر میں اس کی شادی سیف جیسے ناپسندیدہ شخص سے ہو جائے گی' وہ کس طرح زندگی گزارے گی اس سطحی انسان کے ساتھ؟ وہ اس کے لیے نہیں بنا تھا۔ وہ اس کے لیے بنایا ہی نہیں گیا تھا۔

اس لمحے جب ٹور کمپنی کی بس' صاف ستھری' کشادہ سڑک پر دوڑتی ہوئی پشاور کی حدود سے باہر نکل رہی تھی' تو پریشے کے ذہن میں بس ایک ہی فقرے کی بازگشت گونج رہی تھی۔

"قراقرم کے پہاڑوں پر پریاں اترتی ہیں۔"

وہ بند آنکھوں سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بہت سوگوار اور ماتمی تھی۔ "قراقرم کے پہاڑوں پر پریاں اترتی

ہیں افق ارسلان، مگر وہ صرف سیف الملوک تک محدود ہو جاتی ہیں۔ پردیسی کوہ پیماؤں کے لیے پریاں نہیں ہوتیں۔"

اس نے آنکھیں کھول کر دائیں جانب دیکھا۔ اس کے ساتھ نشاء بیٹھی تھی، نشاء کے دائیں جانب برابر والی رو میں افق ترچھا ہو کر بیٹھا نشاء سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ خاصے خوشگوار موڈ میں تھا۔ پریشے کو جاگتے دیکھ کر اس نے ایک دوستانہ مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی۔

"ہماری گفتگو سے تم ڈسٹرب تو نہیں ہو رہیں؟" کل رات والی اکڑ، بے نیازی، بے اعتنائی، سب غائب تھا۔ وہ واقعی اس کو نہیں سمجھ پائی تھی۔

"نہیں۔" مختصراً کہہ کر اس نے رخ کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔ شاید وہ خود بھی خود سے لڑتے لڑتے عاجز آچکا تھا، یا پھر شاید کل رات والا رویہ محض اس کی پرسوں رات والی تقریر کے جواب میں ناراضی کا اظہار تھا، یا پھر شاید، وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے متعلق کوئی احساس ہی نہیں رکھتا تھا۔

اس کا ذہن منفی ہونے لگا تھا۔

"میں غلط سوچ رہی ہوں۔ وہ نشاء اور ارسہ سے بات کرتا ہے، مجھ سے نہیں پھر میں نے کیسے فرض کر لیا کہ وہ میرے متعلق کوئی خاص جذبہ رکھتا ہے؟ وہ تو نگر نگر پھرنے والا ایک مسافر ہے، جو دنیا کے سب سے حسین پہاڑ کو سر کرنے کا عزم لیے میرے دیس آیا ہے، اور چند دن ان خوب صورت وادیوں، چشموں اور پہاڑوں کے درمیان بتا کر اسے یہاں سے چلے جانا ہے۔ وہ جانے کے لیے ہی تو آیا ہے۔ پھر وہ اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہے؟ مجھے اس کے ساتھ نارمل رویہ اختیار کرنا چاہیے۔" وہ اس کا ہم سفر تھا، وہ کیوں خوامخواہ کی خود سے جنگ لڑ رہی تھی؟ افق کو تو واپس ترکی جا کر شاید یہ یاد بھی نہ رہے کہ مارگلہ کے پہاڑوں پر جب بادل اترے ہوئے تھے، تو گھوڑا دوڑاتے بیچ سڑک کے، اسے کوئی لڑکی ملی تھی۔ سیاح تو بہت کٹھور ہوتا ہے، خوب صورت مناظر پلکوں میں جذب کر کے اپنے دیس لوٹ جاتا ہے، پھر پلٹ کر نہیں آتا۔ تو وہ کیوں اپنے اندر کوئی جذبہ پالنے لگی تھی؟

اس کا دل قدرے ہلکا ہوا تھا۔ کوئی پریشانی جیسے ختم ہو گئی تھی۔ اگر اس کے اندر کوئی جذبہ پنپ بھی رہا تھا تو اس نے اس قطرے جتنے جذبے کو سختی سے سیپ میں بند کر کے اپنے دل کے وسیع سمندر میں دفن کر دیا۔

"گاڑی کا انجن قدرے گرم ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا اس میں پانی ڈال لوں، آپ چاہیں تو آس پاس گھوم پھر لیں۔" گاڑی اچانک روک کر ظفر نے وضاحت دی۔

وہ دوسرے مسافروں کے ہمراہ بس سے باہر نکلی تو اسے احساس ہوا کہ بس کافی دیر سے درگئی کے پہاڑوں پر چڑھ چکی تھی۔ اس وقت بھی وہ درگئی کے سرخ اور بھورے خشک پہاڑوں کے اوپر تھے۔ سڑک کشادہ تھی، دائیں جانب کھائی اور بائیں جانب پہاڑ تھے۔

ظفر بس کا تیل پانی چیک کرنے لگا۔ افتخار صاحب اور شہلا قریب موجود واحد کھوکھے سے، جو کہ ایک کولڈ ڈرنک کارنر تھا، پر چلے گئے۔ احمر انکل تصویریں کھینچنے لگے، افق بھی تصویریں بنا رہا تھا۔

وہاں سڑک خالی ہی تھی۔ دو، دو منٹ بعد کوئی ٹرک یا کار گزر جاتی تھی۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا، موسم پشاور کی نسبت خوشگوار تھا۔

"سنو پریشے!" وہ پہاڑ کے دہانے پر ایک سرخ پتھر، اپنے قیمتی سوٹ کی پروانہ کرتے ہوئے خاموش بیٹھی تھی، جب افق نے اسے آواز دی۔ اس نے سر اٹھا کر افق کو دیکھا وہ کیمرہ کور میں ڈال کر اسی کی طرف آرہا تھا۔

وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ "میں رہی ہوں، تم بولو۔" خود سے اعصابی جنگ ترک کر کے اور مصنوعی خول اتار کے وہ خاصی ہلکی ہو گئی تھی۔

"تم شرط لگاؤ گی میرے ساتھ؟" وہ کل سے مختلف، اصلی والا افق لگ رہا تھا۔

"بالکل کیونکہ مجھے پتا ہے میں جیت جاؤں گی۔" وہ پچھلے تینوں دنوں سے مختلف اور بالکل اصلی والی پریشے تھی۔

"اوہ! اتنی خود پسندی؟" وہ مسکرایا۔

"خود پسندی نہیں، خود اعتمادی کہو۔"

"فائن! تم پلیز ایک شرط لگاؤ گی؟" افق کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بچپن سے دوست رہے ہوں۔

"ہاں اب بتا بھی دو!"

"وہ اوپر جھاڑی دیکھ رہی ہو، وہ تقریباً" یہاں سے چالیس فٹ اونچی ہے۔ تم میرے ساتھ ایک ریس لگا کر دیکھتے ہیں اوپر پہلے کون پہنچتا ہے!" افق نے ہاتھ سے اوپر جھاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"ایک مخلصانہ مشورہ دوں؟ اگر تم اسی وقت یہاں سے نیچے چھلانگ لگا دو تو یقین کرو بہت جلدی اوپر پہنچو گے۔"

"وری فنی! میں ارسہ اور نشاء کو بلاتا ہوں، وہ جج ہوں گی۔" وہ پلٹ کر ان دونوں کو بلانے چلا گیا۔

"جو جیتے گا، اسے کیا ملے گا؟" ان تینوں کے واپس آنے پر پریشے نے پوچھا، نشاء کو اس کے رویے کی تبدیلی پر خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ "مرسڈیز بینز؟"

"نہیں، تبت کا ریٹرن ٹکٹ۔" ارسہ فوراً بولی۔

"پوری دنیا امریکہ انگلینڈ جانے کی خواہش کرتی ہے، لیکن تم کوہ پیما لوگ تبت سے آگے مت بڑھنا۔" نشاء ان لوگوں میں سے تھی جن کا کوہ پیمائی کے متعلق علم کلف ہینگر اور ورٹیکل لمٹ تک تھا، البتہ تبت کو وہ تبت سنو کریم کے حوالے سے تھوڑا زیادہ جانتی تھی۔

"اچھا خاموش رہو تم دونوں۔ میں بتاتا ہوں، جو ہارے گا، اسے جیتنے والے کا ڈیئر Dare پورا کرنا ہو گا۔ ٹھیک؟"

"ٹھیک تم میرا ڈیئر پورا کرنے کے لیے تیار رہنا۔" وہ اعتماد سے مسکرائی۔

"دیکھتے ہیں مادام!" اس کا انداز بھی بہت چیلنجنگ تھا۔

"اب شروع کرو، اس سے پہلے کہ دوسری ٹریفک آئے اور لوگ تمہارے یہ بچکانہ ایڈونچر دیکھیں۔"

پھر ان کا پہاڑوں پر پہلا بچکانہ ایڈونچر شروع ہوا۔

وہ خاصی پر اعتماد تھی، مگر چار سال سے وہ پہاڑوں پر نہیں چڑھی تھی، نتیجتاً وہ قدرے سست تھی، اور ان ... دار کانٹوں اور جھاڑیوں کی پروانہ کرتے ہوئے بہت ... سے اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچ گیا تھا۔ وہ چند فٹ ہی پیچھے رہ گئی تھی۔

"میں جیت چکا ہوں ڈاکٹر!" جھاڑی کو چھو کر وہ ناہموار ... میں سے راستہ بناتا اس کے قریب آیا۔ شکست کے احساس سے اس کے اندر کی کوہ پیما لڑکی خاصی بری طرح تڑپی تھی۔

"میں مشکل راستے سے آرہی تھی، جبکہ جس جگہ سے ... تھے، وہ مقامی لوگوں کا بنایا گیا ہموار راستہ ہے اور ... سے چڑھنا خاصا آسان ہے۔"

"مادام، جب زندگی ایک آسان راستہ دے رہی ہو تو ... ان راستوں سے سفر نہیں کیا کرتے۔ منزل ایک ہی تھی ... بھی میرے والا ہی چنتیں!"

پریشے نے شانے اچکا دیے۔ "میں ہار مانتی ہوں بہرحال تم شاعری اچھی کر لیتے ہو۔" وہ اپنے جوگرز نیچے والے پتھر پر رکھ کر اترنے لگی۔ اترائی، چڑھائی کی نسبت زیادہ مشکل تھی۔

"شکریہ اور تمہیں میرا ڈیئر تو پورا کرنا پڑے گا۔" وہ اس کے عقب میں اتر رہا تھا۔

"بہتر ہے کہ وہ آپ سوات پہنچ کر ہی بتائیں کیونکہ ظفر بلا رہا ہے۔" ارسہ نے ان کی توجہ اشارہ کرتے ظفر کی طرف دلائی۔

"سوات کتنی دور ہو گا یہاں سے؟" اپنی قمیص کے دامن سے چپکا ایک کانٹا الگ کرتے ہوئے پریشے نے پوچھا۔

"دو گھنٹے۔" جواب افق کی جانب سے آیا تھا۔ وہ اف کر کے رہ گئی۔ وہ ہر جگہ کا جغرافیہ رٹ چکا تھا۔

"کبھی میں ترکی آئی نا، تو تمہارے ملک کے چپے چپے کا نام حفظ کر کے تمہیں بھی یونہی امپریس کروں گی۔" بس کی طرف جاتے ہوئے وہ بولی۔ افق اس کے آگے تھا، اس کا ہاتھ دروازے پر تھا، اس کی بات سن کر وہ ٹھٹک کر پلٹا۔

"کب آؤ گی ترکی؟" اس کے لہجے میں خوشی اور آنکھوں میں امید تھی۔ وہ ہنس پڑی۔

"میں مذاق کر رہی تھی۔"

اس کی آنکھوں کی جوت یک دم بجھ گئی۔

"اچھا" وہ اسے راستہ دینے کو پیچھے ہوا، وہ دروازے کے ساتھ لگی راڈ پکڑ کر اندر چڑھ گئی۔ اسی وقت وہ بہت مدھم آواز میں بولا۔

"سنو، تم ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو۔ ہنستی رہا کرو!"

پریشے کے چہرے سے مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی، اس کی بھنویں تن گئیں۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ پر بیٹھی اور سختی سے لب بھینچے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ اس کے موڈ کی خرابی کو دیکھ نہ سکا تھا۔

تقریباً" ساڑھے دس کے قریب وہ لوگ ان پہاڑوں تک پہنچ چکے تھے جن کے بیچ وادی سوات کا خوب صورت دریا، دریائے سوات بہتا تھا۔

"یہ انسانی فطرت ہے کہ پانی کے قریب جا کر وہ خود کو بہت ہشاش بشاش محسوس کرتا ہے۔ قدرتاً" جب ہم دریا کے قریب ہوتے ہیں تو خود کو بہت فریش فیل کرتے ہیں۔" آواز بہت اجنبی تھی۔ پریشے نے تعجب سے سر گھما کر پیچھے

دیکھا کہ یہ بات کس نے کی ہے۔ اسے حیرت ہوئی تھی کیونکہ یہ افتخار صاحب تھے۔
"یہ بولتے بھی ہیں؟ میں تو سمجھتی تھی گونگے ہیں۔" نشاء نے بہت متعجب انداز میں اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ اس کے لبوں سے ہنسی کا فوارہ چھوٹا تھا۔
سب نے۔۔۔ یہاں تک کہ ڈرائیو کرتے ظفر نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہنسی کنٹرول کرنے کی کوشش کے باوجود ہنستی چلی جارہی تھی۔ افق اس کو یوں بچوں کی طرح ہنستے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے' وہ سختی سے لب بھینچ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔
"نشاء! اپنی دوست سے کہو' اس کی کھڑکی کے باہر خشک پہاڑ ہیں' دریا تو بائیں طرف بہہ رہا ہے۔ وہ کس کو دیکھ رہی ہے؟" وہ نشا کے ساتھ والی نشست پر تھا' اس کی اور نشا کی نشست کے درمیان aisle تھا۔ وہ ایک جوگر اپنی سیٹ کے آگے اور دوسرا aisle پر رکھے' قدرے جھک کر آہستہ سے نشاء سے بولا۔
"پری! تمہاری کھڑکی کے باہر خشک پہاڑ ہیں' دریا تو بائیں طرف بہہ رہا ہے تم کس کو دیکھ رہی ہو؟"
"پہاڑوں کو!" اس نے چہرہ موڑے بغیر سنجیدگی سے کہا۔
"لگتا ہے ڈاکٹر کا موڈ پھر سے خراب ہو گیا ہے۔ ویسے ان کو یہ دورے دن میں کتنی دفعہ پڑتے ہیں؟"
"جتنی دفعہ کوئی عامیانہ انداز میں میری تعریف کرے۔" کھٹ سے جواب آیا تھا۔
"اوہ!" وہ سمجھ گیا تھا۔ "میں تو بس دل رکھنے کو کہہ رہا تھا تاکہ تم ہنستی رہو اور اتنی غصے والی اکھڑی اکھڑی سی شکل ہر وقت نہ بنائے رکھو۔ تمہیں برا لگا؟"
"ہاں!" وہ ابھی تک کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔
افق نے بمشکل مسکراہٹ لبوں تک روکی تھی۔ "بہت معذرت میں آئندہ ایسے جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کروں گا۔"
"تمہارے حق میں یہی ٹھیک رہے گا۔"
"بہتر! اب اس طرف دیکھ لو۔ دریا بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔"
اس نے گردن کو بائیں جانب جنبش دی' افق مسکراہٹ چھپانے کو چہرہ اپنی کھڑکی کی طرف موڑ چکا تھا۔ اس نے افق کی کھڑکی کے کھلے شیشے کے پار نگاہ دوڑائی اور پھر نگاہ پلٹ کر واپس آنا بھول گئی۔
سبزے سے ڈھکے سبز پہاڑوں کے درمیان' سڑک سے کوئی سو میٹر نیچے' بل کھاتا نیلا دریا بہہ رہا تھا۔ اس کا پاٹ کسی ندی سے تھوڑا سا ہی زیادہ چوڑا تھا' پانی بے حد نیلا تھا جس کے اوپر سفید جھاگ پتھروں سے ٹکرانے کے باعث پیدا ہو رہے تھے۔ کسی نیلے سانپ کی طرح بل کھاتا دریا گو کہ سڑک سے خاصا نشیب میں تھا مگر اس میں رکھے دیو قامت پتھروں سے ٹکراتے پانی کا شور بہت بلند تھا۔ سوات اور کالام میں یہ شور آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔
دریا کے دونوں طرف کے پہاڑ سرسبز تھے' جن پر مقامی لوگوں نے فصلیں اگا رکھی تھیں۔ پہاڑوں کی ڈھلوان ہموار نہیں ہوتی' سو فصلیں بھی سیڑھیوں کی شکل میں اگائی گئی تھیں' یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چوٹی تک جانے کے لیے بے شمار سبز زینے سے بنے تھے۔
کبل سے گزر کر جس وقت بس مینگورہ میں داخل ہوئی' وہ اپنی اور افق کی گفتگو بھلا چکی تھی۔ دراصل وہ نیلا دریا اتنا خوب صورت تھا کہ وہ اس پر سے نگاہ ہی نہ ہٹا پا رہی تھی۔
پھر بس شہر میں داخل ہوئی' سیرینہ ہوٹل' سیدو شریف کی عمارت کے قریب سے ٹرن لے کر بس "مرغزار" کی جانب روانہ ہو گئی جہاں کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ان کی بکنگ تھی۔
"ظفر! وہ ہوٹل رائل پیلس کہاں گیا؟" افق کھڑکی سے باہر متلاشی نظروں سے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔
"سر! وہ جو والیٔ سوات کا محل تھا؟"
"ہاں وہی۔"
"وہ تو اب کوئی ٹیوشن اکیڈمی بن چکا ہے۔" ظفر کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے والیٔ سوات کا یہ اقدام پسند نہیں آیا۔ "ویسے سر! قسم سے وہ بہت خوب صورت ہوٹل تھا۔"
"ہاں' وہ بہت خوب صورت تھا۔ میں دو سال پہلے ادھر آیا تھا تو ایک دن رہا تھا وہاں پر۔ اسے ٹیوشن سنٹر بنا کر والیٔ سوات نے اچھا نہیں کیا۔"
پری نے چونک کر افسوس سے سر ہلاتے افق کو دیکھا۔ پرسوں شام جب نشاء نے اس سے دو برس قبل پاکستان آنے کے متعلق استفسار کیا تھا تو وہ ٹال گیا تھا۔ وہ دو سال پہلے یہاں کیوں آیا تھا؟ ایسا کون سا کام تھا جس کے متعلق

وہ نہیں بتاتا تھا؟ اسے الجھن سی ہوئی' ساتھ میں تجسس بھی ہوا تھا۔
"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ الجھ کر افق کو دیکھ رہی تھی تو اس نے مسکرا کر ٹوکا۔
"کچھ نہیں۔" وہ سر جھٹک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔
مرغزار جانے والا راستہ شہر سے دور ہٹ کر خاصا سنسان اور پرسکون سا تھا۔ دور دور تک ان کی بس کے علاوہ کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ہر طرف اتنا سکوت اور ویرانہ سا تھا کہ پریشے کو لگا' ظفر راستہ بھول گیا ہے' وہ یقیناً کسی انجان وادی میں بھٹک رہے ہیں۔ مگر ہر کلومیٹر بعد "وائٹ پیلس اتنے کلومیٹر دور" کا بورڈ اس کے دل کو تسلی دیتا تھا۔
"ہوٹل مینجمنٹ کے نقطۂ نظر سے وائٹ پیلس کی لوکیشن زبردست ہے۔ آبادی سے بہت دور اس مرغزار میں یہ واحد ہوٹل ہے کہ جب ٹورسٹ کئی کلومیٹر سفر کر کے تھکا ہارا ہوٹل تک پہنچتا ہے تو اس کے آسمان کو چھوتے کرائے سن کر بھی واپس پلٹنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا۔۔۔ ظفر! ایک منٹ گاڑی روکو۔" وہ ہوٹل کی لوکیشن پر کمنٹ کرتے ہوئے اچانک سیدھا ہو کر بولا' ظفر نے گاڑی روکی۔ افق نے اپنا بند شیشہ نیچے کر لیا۔
باہر ایک سرخ رنگت اور سنہری بالوں والا بچہ کھڑا تھا۔ اس کا لباس میلا تھا' پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔ اس نے لمبے اور پتلے تنکوں پر انجیر اور اخروٹ لگا رکھے تھے' اخروٹ سبز اور کچے تھے۔
"اس سے کہو' سو روپے کی دے دے۔" افق نے ایک سرخ نوٹ شیشے سے باہر بچے کی طرف بڑھایا۔ احمر صاحب نے ترجمانی کی۔
"یہ سب تو چالیس روپے کی ہے۔" بچہ بولا تھا۔ احمر صاحب نے افق کو بتایا۔
"تو پھر یہ ساری دے دو!"
"تم ساری لے لے گا تو ام شام تک تمہارا سر بیچے گا؟" بچہ سارے انجیر دینے پر راضی نہ تھا۔ احمر صاحب ترجمانی کر رہے تھے۔
"اوہو' تو دو دے دو' اور باقی پیسے رکھ لو۔"
"افق! وہ ایسے نہیں رکھے گا۔ تم اس سے صرف بیس روپے کی انجیر خرید سکتے ہو۔"
"اچھا۔" افق نے دس کے دو نوٹ باہر بچے کو دیے' اس نے دو ٹہنیاں اس کی طرف بڑھائیں۔
بس پھر سے چل پڑی تھی۔ پریشے جانتی تھی کہ افق کو انجیر کھانے کا کوئی شوق نہ تھا' وہ بس اس بچے کی مدد کرنا چاہتا تھا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ باقی لوگوں میں انجیر بانٹ رہا تھا۔
"تم خود بھی کھاؤ نا!"
"میں پھل وغیرہ نہیں کھاتا۔" اس نے لاپروائی سے شانے جھٹکے۔
ظفر نے بس روک دی۔ بس سے باہر نکلتے ہوئے اس نے بالوں میں لگے کیچر کو جکڑنا چاہا تو اسے احساس ہوا کہ کیچر کا دو رنگا پتھر قدرے ڈھیلا ہو چکا تھا۔ بس ایک بار گرنے کی دیر تھی اور پھر وہ کیچر سے الگ ہو جاتا۔
اس نے وہ افق کو واپس کرنے کا سوچا تھا' مگر جانے کیوں اس کا دل ہی نہیں چاہا تھا کہ وہ اسے واپس کرے' اب وہ اس کو اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی ہمیشہ کے لیے۔
وہاں ایک کھلا سا پارکنگ لاٹ بنا تھا جس کے آخر میں بہت چوڑی سیڑھیاں تھیں۔ پارکنگ لاٹ کے بائیں جانب ڈھلوان تھی' وہاں چند فٹ نشیب میں تین چار دکانیں تھیں جن پر سواتی شالیں لٹکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ دکانوں کے بائیں طرف پہاڑ ختم ہو جاتا تھا اور آگے کھائی تھی' جس میں چشمہ بہہ رہا تھا۔ بہتے پانی کی آواز اسے بہت پسند تھی۔
سیڑھیوں کے اختتام پر دور تک پھیلا سبز لان تھا جس میں سنگ مرمر کے بیچ کرسیاں اور میزیں رکھی تھیں۔ لان کے اختتام پر ایک سفید رنگ کا محل تھا' دودھ کی طرح سفید محل۔ اتنا خوب صورت کہ نگاہ نہ ٹکتی تھی۔ لان کے دائیں طرف سیدھی پتھریلی روش تھی' جس کا اختتام پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئی طویل سیڑھیوں پر ہوتا تھا۔ یہ سیڑھیاں وائٹ پیلس کی بلڈنگ سے ہٹ کر تھیں۔
"پری! یہ ہوٹل میں نے دیکھ رکھا ہے۔ وہ ڈرامہ "موم کا چہرہ" یہیں تو شوٹ ہوا تھا۔" نشاء نے آہستہ سے اسے بتایا۔ شہلا اور افتخار کو اس روش کے دائیں جانب بنے کمروں میں سے ایک مل گیا تھا' جبکہ باقی سب کو دوسری منزل پر کمرہ ملا تھا۔
"مجھے نہیں رہنا دوسری منزل پر۔ نانگا پربت سر کرنا آسان ہے' وائٹ پیلس کی سیڑھیاں چڑھنا بہت مشکل!" افق نے یہ سنتے ہی کہ اسے دوسری منزل پر رہنا ہو گا' منہ بنایا تھا مگر کسی نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی۔

وائٹ پیلس کی وہ سفید عمارت دراصل اس کی پہلی منزل تھی۔ پتھریلی روش کے بائیں جانب جہاں چند کمرے اور دکانیں تھیں' ان کے آگے طویل سیڑھیاں پہاڑ کے اوپر لے جاتی تھیں جہاں دوسری منزل تھی۔ وائٹ پیلس کی چاروں منزلیں اسی طرح مختلف altitude مگر ایک ہی پہاڑ پر اوپر تلے بنی تھیں۔

وہ سیڑھیاں واقعی مشکل تھیں' یہ احساس اسے انہیں عبور کرتے ہوئے ہی ہو گیا تھا۔ نیچے بہتے جھرنے کا شور ابھی تک اس کی سماعت سے ٹکرا رہا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ شام کو اس جھرنے تک ضرور جائے گی۔

☼ ☼ ☼

"دور سے دیکھنے میں یہ طویل سیڑھیاں جتنی خوب صورت لگتی ہیں۔" "انہیں چڑھنے لگو تو اتنی ہی تھکاتی ہیں ۔ اف اللہ!" سیڑھیاں نیچے اترتے ہوئے اس نے بے اختیار جھنجلا کر دائیں طرف نصب پنجرے پر ہاتھ مارا تو اندر بیٹھا خوب صورت مور سہم کر پیچھے ہوا۔

"سوری!" اسے بے اختیار شرمندگی ہوئی۔ اس کے آگے سیڑھیاں اترتے افق نے سر گھما کر اسے دیکھا اور پھر ہولے سے مسکرایا۔ پھر مسکراہٹ چھپانے کو رخ آگے پھیر کر نیچے اترنے لگا۔ اس نے اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی' وہ بہت مسحور سی ہو کر اس خوب صورت مور کو دیکھ رہی تھی۔

ان سیڑھیوں کے دائیں اور بائیں طرف بہت بڑے بڑے پنجرے بنے تھے' جیسے چڑیا گھر میں ہوتے ہیں۔ ان پنجروں میں مختلف پرندے' مور اور بندر مقید تھے۔ اسے افسوس ہوا تھا کہ اس نے اتنے خوب صورت مور کو ڈرا دیا تھا۔

"رک کیوں گئی ہو؟ چلو!" نشاء نے پلٹ کر اسے دیکھا' وہ سر جھٹک کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ وہ چاروں نیچے جھرنے پر جا رہے تھے۔

پتھریلی روش جہاں ختم ہوئی تھی اور جہاں سے پارکنگ لاٹ میں جانے کے لیے چند بے حد چوڑے زینے بنے تھے' اس جگہ پر ناشپاتی کا ایک درخت تھا جس کے تنے کے ساتھ کرسی پر ایک بوڑھا سیکیورٹی گارڈ بیٹھا تھا۔

"یہاں سے ناشپاتی نہیں توڑ سکتے؟" اس نے بڑی حسرت سے درخت کو دیکھا۔

افق دھیرے سے مسکرایا "وہاں جھرنے کے اوپر دائیں طرف کے پہاڑ پر چڑھتے جاؤ تو آگے جنگل ہے' وہاں جنگلی ناشپاتی کے بہت سارے درخت ہیں۔ وہیں سے توڑ لینا' اس درخت کو تو یہ آدمی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دے گا۔"

"تم ادھر ہی پیدا ہوئے تھے یا یہ انفارمیشن ہم پر اپنی نالج جھاڑنے کو دیتے ہو؟"

"نہیں' اصل میں جینک جنگلی ناشپاتی بہت شوق سے کھاتا ہے' پچھلی دفعہ وہ میرے ساتھ آیا تھا تو وہاں چشمے کے اوپر ہم نے ناشپاتی کے درخت ڈسکور کیے تھے۔"

"جینک کون؟" ارسہ اور نشاء نے پارکنگ لاٹ کا احاطہ عبور کرتے ہوئے بیک وقت پوچھا تھا۔

"میرا دوست' جینک یقین۔ Cenk yakin"

اس کی آواز قدرے پژمردہ سی تھی' آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں' شاید وہ سفر کے باعث تھک گیا تھا۔

جھرنے کا لکڑی کا پل عبور کر کے وہ دوسرے پہاڑ پر مقامی لوگوں کے بنائے گئے کچے راستے پر اوپر چڑھنے لگے۔ راستہ بہت کچا تھا' پریشے کے جوگرز پر مٹی لگ رہی تھی' اس نے ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔ افق جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے برابر میں مگر چند قدم کا فاصلہ رکھے چل رہا تھا۔

"وہ رہے ناشپاتی کے درخت۔" افق کی آواز پر اس نے چلتے ہوئے سر اٹھا کر اوپر دیکھا' وہاں درختوں کے جھنڈ تھے ۔ اسے سامنے رکھا پتھر دکھائی نہیں دیا' اس کا پاؤں ہلکا سا پتھر سے ٹکرایا' وہ جھٹکا کھا کر لڑکھڑائی' افق نے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

وہ لڑھکنے نہیں لگی تھی' ہلکی سی لڑکھڑائی تھی' مگر وہ سمجھا تھا کہ وہ پہاڑ پر سے گرنے لگی ہے' اس لیے اس نے ریفلیکس ایکشن کے طور پر اس کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا اور پھر فوراً ہاتھ چھوڑ دیا۔ ارسہ اور نشاء ان سے کافی آگے تھیں۔

وہ چلنے کے بجائے رک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ قدرے وضاحت دینے والے انداز میں بولا "سوری' میں سمجھا تم گرنے لگی ہو۔"

"تمہارا دماغ درست ہے؟" وہ اس کے سامنے کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

"پری...... میں۔"

اس نے افق کی بات سنے بغیر تیزی سے اس کی کلائی تھامی۔

"تمہیں بخار ہے' اتنا تیز بخار۔ ہاتھ دیکھو' کتنا گرم ہو رہا ہے اور نبض دیکھو' کیسے دوڑ رہی ہے' اور تم بجائے ریسٹ کرنے کے ہائیکنگ کرنے نکلے ہوئے ہو ہاں!" اسے اس لاپروا انسان پر بہت غصہ آیا تھا۔ "تم سے اتنا بھی نہیں ہوا کہ مجھے بتا ہی دو۔ میں ڈاکٹر ہوں' تمہیں دوائی تو دے ہی سکتی تھی' مگر تمہیں خود کو اذیت دے کر اپنے آپ کو بہادر کہلوانے کا شوق ہے۔ تم انتہائی فضول انسان ہو! فوراً واپس چلو میرے ساتھ۔"

وہ جو پہلے بوکھلا گیا تھا' اب مسکراہٹ لبوں تلے دبائے' سر جھکائے کھڑا اس کی ڈانٹ سن رہا تھا۔

"معاف کرنا ڈاکٹر' میرا نہیں خیال کہ میں اتنا بیمار ہوں کہ بستر سے لگ کر بیٹھ جاؤں۔"

"یہ فیصلہ کرنے والے تم نہیں' میں ہوں' سمجھے تم؟" وہ واپس جانے کو پلٹی تو وہ بھی سر جھکائے اس کے فکر مندی بھرے غصے سے محظوظ ہوتا اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی پہاڑ سے نیچے اتر رہی تھی۔

"ڈاکٹر! میں واقعی اتنا زیادہ۔"

وہ جھٹکے سے پیچھے مڑی۔ وہ اس کے عقب میں محض ایک قدم کے فاصلے پر تھا' اس کے ایک دم مڑنے پر فوراً پیچھے ہوا' نہ ہوتا تو اس سے ٹکرا جاتا۔

"سنو' تمہیں آخری دفعہ بتا رہی ہوں۔ میرے سامنے اپنا منہ بند رکھو' مجھے بڑبڑاتے ہوئے مریض زہر لگتے ہیں۔"

افق نے تابعداری سے لبوں پر انگلی رکھ لی۔ "سوری ڈاکٹر' اب نہیں بولوں گا۔" اس کے لہجے اور شہد رنگ آنکھوں سے شرارت جھلک رہی تھی۔

"ہاں' اب ٹھیک ہے' چلو!" وہ اس کے آگے چلنے لگی۔

"ویسے کتنی دیر تک نہیں بولنا؟"

"جب تک میں نہ کہوں اور اب خاموش رہو۔" وہ اس کے آگے چلتی ہوئی اوپر کمروں تک لے آئی۔ اس کو پیراسیٹامول کی دو گولیاں دے کر سختی سے سو جانے کو کہا۔

"مگر میں سونا نہیں چاہتا۔" بیڈ پر بیٹھے افق نے احتجاج کیا۔

"خاموش' بالکل خاموش رہو۔ ڈاکٹر کے سامنے اپنی زبان بند رکھا کرو۔"

اس کو باقاعدہ ڈانٹ کر وہ اس کے کمرے سے آ گئی۔ دوسری منزل پر کمروں کی دو متصل قطاریں تھیں' سامنے لان تھا' جو مستطیل شکل کا تھا۔ لان کے دہانے پر' جہاں کھائی تھی' جھاڑیوں اور چند درختوں کی معمولی باڑ سی بنی تھی۔

وہ اپنے بیگ سے ڈائری اور پین نکال لائی اور لان کے وسط میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر اپنے سفر کے متعلق لکھنے لگی۔ جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ آس پاس اس کے سوا کوئی نہیں ہے تو اس نے جوگرز اتار کر پاؤں میز پر رکھ لیے اور ڈائری گھٹنوں پر۔ ڈائری لکھتے ہوئے وہ گاہے بگاہے افق کے کمرے کی جانب نگاہ بھی دوڑا لیتی تھی۔ ایک دفعہ جا کر دیکھ بھی آئی وہ آنکھوں پر بازو رکھے سو رہا تھا۔ اسے تسلی ہوئی۔ واپس آئی تو ایک چھوٹا سا بندر میز پر بیٹھا اس کی ڈائری سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ ایک اور بندر نیچے گھاس پر انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اس کو قریب آتے دیکھ کر چھوٹا بندر تو چھپاک سے غائب ہو گیا۔ جبکہ گھاس پر لیٹا بندر احتراماً "سیدھا ہو گیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے اپنا بال پوائنٹ بندر کی طرف بڑھایا' جسے اس نے اپنے انسان نما ہاتھوں کی مدد سے پکڑ لیا' کچھ دیر وہ اس سے کھیلتا رہا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم بندر نے اس کا پین زور سے اچھالا' وہ لان کے دہانے پر سے ہوتا ہوا نیچے کھائی میں گر گیا۔ پریشے کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"دفع ہو جاؤ تم!" اس نے غصے سے پاؤں زور سے زمین پر مارا' بندر اچھلتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ پری نے افسوس سے کھائی کی طرف دیکھا۔ اس کا پین اب واپس نہیں آ سکتا تھا۔

پھر وہ افق کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے سیف کے متعلق سوچنا برا لگتا تھا' مگر افق کی باتوں' اس کی شرارت بھری شہد رنگ آنکھوں اور اس کی لبوں میں چھپی مسکراہٹوں کو سوچنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ شخص جسے چار دن پہلے تک وہ جانتی بھی نہیں تھی' اب بہت شناسا لگ رہا تھا۔ بلکہ نہیں' وہ تو شاید اس کو پیا کو صدیوں سے جانتی تھی' روح سے وجود میں آنے سے بھی پہلے' پہلی سانس لینے سے بھی پہلے سے......

اسے لگا افق کسی کو پکار رہا ہے' وہ کمرے کا دروازہ ادھ

کھلا چھوڑ کر آئی تھی' تب ہی آواز اس تک آئی تھی۔ وہ اتنی جلدی جاگ گیا؟

وہ جاگا نہیں تھا' وہ شاید سو بھی نہیں رہا تھا۔ اس کا بازو اب اس کی آنکھوں پر نہیں تھا' اس کی پیشانی اور پورا چہرہ پسینے سے تر تھا۔

"افق!" پریشے نے اس کے نزدیک ہو کر بغور اسے دیکھا۔ اس کے لب ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ وہ شاید کچھ کہہ رہا تھا۔

"میرا آکسیجن کین کہاں ہے؟ میرا آکسیجن کین کہاں ہے؟" بند آنکھوں اور نفی میں ہلاتے سر کے ساتھ وہ مدھم آواز میں جیسے پکار رہا تھا۔

"افق' اٹھو....." اس نے اس کا شانہ دھیرے سے ہلایا' اس کی شرٹ پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔

"میرا آکسیجن کین ..... حنا دے' میرا آکسیجن کینیسٹر....." اس نے درمیان میں ترکی زبان کا کوئی لفظ بولا تھا جسے وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس نے زور سے اس کا کندھا ہلایا۔ افق نے فوراً" آنکھیں کھول دیں اور ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور خوف تھا۔ "مم' میرا آکسیجن کا کینیسٹر کہاں ہے؟"

"افق! تمہارے پاس کوئی آکسیجن کین نہیں ہے' کیا تمہیں آکسیجن نہیں آ رہی؟ سانس گھٹ رہا ہے کیا؟" وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اس نے چونک کر پری کو دیکھا "میں کہاں ہوں۔" پھر وہ اپنی ترک زبان میں کچھ بولا۔

"تم وائٹ پیلس' مرغزار' سوات میں ہو۔ تم نے شاید کوئی برا خواب دیکھا ہے۔"

"خواب؟" وہ جھٹکے سے کمبل اتار کر بیڈ سے اتر آیا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے دھیرے سے افق کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چند قدم آگے بڑھ گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سچویشن سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم' تم جاؤ یہاں سے۔" وہ اس کی جانب کمر کیے دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا' وہ اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر انجانا خوف اور اضطراب رقم تھا۔

وہ اس کے سامنے آگئی اور بغور اس کے چہرے کو دیکھا جس کی رنگت کسی مرجھائے' پیلے گلاب کی طرح زرد ہو رہی تھی۔

"مجھے بتاؤ' تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"تم جاؤ ادھر سے۔" وہ رخ موڑ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسائے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم ٹھیک نہیں ہو' تمہیں۔"

"جاؤ..... خدا کے لیے جاؤ یہاں سے..... جسٹ گیٹ آؤٹ فرام ہیئر!" وہ ایک دم زور سے چلایا تھا' وہ سہم کر پیچھے ہوئی' اگلے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

اسے حیرت ہوئی تھی' وہ بہت بہادر کوہ پیما تھا' وہ تو جسمانی تکالیف کو خاطر میں نہیں لاتا تھا' تو پھر ایک خواب سے اس بری طرح سے کیوں ڈر گیا تھا؟ اس کے چہرے پر اتنا انجانا سا خوف' کچھ کھو دینے کا کرب کیوں تھا؟

☼ ☼ ☼

پھر تمام شام وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ پریشے نے اس کو رات کے کھانے پر دیکھا۔ وہ تینوں وائٹ پیلس کی پہلی منزل کی سفید عمارت کے برآمدے میں رکھے خوب صورت براؤن لکڑی کے صوفوں پر بیٹھی کھانے کا انتظار کر رہی تھیں جب وہ ان سے آن ملا۔

"میں ذرا لیٹ ہو گیا' معاف کرنا۔ میں اس بندر سے کھیلنے لگا تھا۔" وہ لکڑی کے دو تین زینے پھلانگ کر ان کی طرف آیا۔

"گھوڑوں کے علاوہ بندروں سے بھی آپ کی اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ لگتی ہے۔" نشاء نے بے ساختہ کہا۔

"سمجھا کریں نا.....! ڈارون کہتا تھا' انسان بندر سے بنا ہے۔ کیوں افق بھائی؟"

"انسان بندر سے بنا ہو یا نہ بنا ہو' ڈارون ضرور بندر سے بنا تھا۔" وہ ایک دفعہ پھر وہی پرانا' ہنستا مسکراتا افق لگ رہا تھا۔ شام والے واقعے کا اس کے چہرے پر شائبہ تک نہ تھا۔

وہ سر جھٹک کر خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔

☼ ☼ ☼

بدھ 27 جولائی' 2005ء

وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں آگئی۔ برآمدہ کافی طویل تھا اور ہر کمرے کے دروازے کے دونوں اطراف خوشنما پھولوں کے گملے رکھے تھے۔ برآمدے کے آگے سفید ستون سے بنے تھے' وہ ایک ستون سے ٹیک

لگائے' سامنے کا منظر دیکھنے لگی۔

قدرتی لش گرین گھاس سے ڈھکے مستطیل لان کے دہانے پر لگی جھاڑیوں کی باڑ کے ارد گرد وہی چھوٹا بندر چکراتا پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ادھ کھایا' چھوٹا سبز سیب تھا۔ وہ فجر کا وقت تھا۔ ہر طرف گہرا نیلاہٹ بھرا اندھیرا چھایا تھا۔ دور جنگل سے جانوروں کے بولنے کی آوازیں ماحول پر چھائے سکوت کو چیر رہی تھیں۔ رات خوب بارش ہوئی تھی' برآمدے کی مخروطی چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔

تب ہی دفعتاً" اس کی نگاہ گیلی گھاس پر پڑی جہاں ایک طرف گول سی کیاری کے قریب جائے نماز بچھائے افق ارسلان نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے نیلی جینز کے پائنچے اوپر فولڈ کر رکھے تھے' جسم پر وہ جیکٹ اور مفلر نہ تھا البتہ پی کیپ الٹی کر کے سر ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے جوگرز جائے نماز کے پیچھے رکھے تھے۔ سینے پر ہاتھ باندھے' سر جھکائے کھڑا وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

وہ گھاس پر آگئی' جوگرز کے بجائے نرم سوفٹی پہننے کے باعث گیلی گھاس اس کے پاؤں کو بھی گیلا کرنے لگی تھی۔ وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

سیڑھیوں کے دائیں طرف بنے پنجرے میں مقید مور جاگے ہوئے تھے۔ نیلے اور سبز پروں والا مور اپنے بدصورت پاؤں کی مدد سے ناچ رہا تھا' سفید مورنی کونے میں بیٹھی ناچ دیکھ رہی تھی۔ پری تحیر اور ستائش سے رک کر انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی موجودگی کا احساس کر کے مور رک گیا' اس کو اس لمحے اس مور اور خود میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اتنا حسین مور اپنی خوب صورتی کے باعث تمام عمر کے لیے اس پنجرے میں مقید کر دیا گیا تھا بالکل ایسے جیسے اس کی خوب صورتی اور دولت نے اس کے قدموں میں سیف کے نام کی زنجیر ڈالی تھی۔ کاش وہ اس وقت تھوڑی سی ہمت کر کے پاپا کو منع کر دیتی۔

سیف کے متعلق سوچ کر ہی وہ اداس ہو گئی تھی۔ اس سمے اسے نیلے اندھیرے میں ڈوبا وہ پورا مرغزار بہت اداس لگا تھا اور جب وہ نیچے جھرنے کے پل تک آئی تو اسے سامنے والے درخت پر بیٹھی وہ چڑیا بھی اداس گیت گاتی محسوس ہوئی تھی۔

"پری!" وہ اس وقت پہاڑ پر بنے بل کھاتے کچے راستے پر چڑھ کر اوپر ناشپاتی اور سیبوں کے درختوں تک پہنچ گئی تھی' جب اس نے اپنے عقب میں پکار سنی۔

اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ افق نیچے پل پر چلتا ہوا اس تک آ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں جوگرز اور گردن میں مفلر تھا' الٹی پی کیپ اب سیدھی ہو چکی تھی۔

وہ رک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

"تم ادھر کیا کر رہی ہو؟" وہ چند قدم نشیب میں تھا۔

"تمہارا انتظار۔ مجھے علم تھا تم میرے پیچھے جھرنے تک ضرور آؤ گے۔"

وہ سوچ کر رہ گئی' پھر بولی۔ "میرا ناشپاتی کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔" وہ اب اس کے قریب آ چکا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ اوپر چڑھنے لگے۔ گہرا نیلا اندھیرا قدرے ہلکا ہوا تھا۔

"تم میری وجہ سے کل نہیں کھا سکی تھیں نا؟" افق نے بغیر کسی شرمندگی کے کہہ کر اسے ایک نظر دیکھا۔ وہ ریڈ اور پنک امتزاج کے شلوار قمیص میں ملبوس تھی' دوپٹہ گردن کے گرد لپٹا تھا اور بال اونچی پونی ٹیل میں بندھے تھے۔ اس پر اونچی پونی بہت اچھی لگتی تھی۔

"ہاں!"

وہ چڑھتے چڑھتے اب پہاڑ کے اوپر پہنچ گئے تھے' جھرنا اب بہت چھوٹا اور وائٹ پیلس بہت دور دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جگہ ناہموار تھی' بہت سے درخت اونچے نیچے ڈھلوان پر اگے تھے۔ وہ ایک درخت کے قریب چلی آئی۔

"کھاؤ گے؟" ایک ناشپاتی توڑ کر اس نے دوپٹے سے خوب رگڑ کر صاف کی یہ اس کا سیبوں اور ناشپاتیوں کو صاف کرنے کا اپنا طریقہ تھا اور افق کی طرف بڑھائی۔

اس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں پھل نہیں کھاتا۔"

"کیوں؟" پری نے حیرت سے بڑھا ہوا ہاتھ نیچے گرا دیا۔

"یونہی۔ اچھے نہیں لگتے۔" وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"کھایا کرو' ان میں فائبرز ہوتے ہیں' معدے کے لیے اچھے ہوتے ہیں۔"

وہ ڈاکٹروں کے مخصوص انداز میں کہتی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ "اور سنو' تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"خود دیکھ لو۔" افق نے اپنی کلائی اس کی جانب بڑھائی۔ سنجیدہ لہجے کے پیچھے شرارت تھی۔

اس نے بس ایک سیکنڈ کو نبض پکڑی' پھر چھوڑ دی۔ "ابھی تک بخار ہے' مگر کل کی نسبت ہلکا ہے۔" افق

نے ہاتھ پیچھے کرلیا۔ دور نیلے آسمان پر نارنجی سورج طلوع ہونے کو بے تاب تھا مگر گہرے سیاہ بادل اسے رستہ نہیں دے رہے تھے۔

"تم نے آج مور کو ناچتے دیکھا تھا' پری؟" اس کی نگاہیں یہاں آسمان پر چھائے بادلوں پر تھیں۔ وہ خاموش رہی۔

"میں جب بھی ادھر آتا ہوں' یہ مور مجھے پہچان کر اپنا ناچ ضرور دکھاتے ہیں۔ جن چیزوں کو ہم سیاح صرف لطف اندوزی کا سامان سمجھتے ہیں' وہ ہمارے جانے کے بعد ہمیں یاد کرتی ہیں' ہمیں پکارتی ہیں۔ تمہیں نہیں لگتا پری کہ وائٹ پیلس کی سیڑھیوں کے ساتھ نصف پنجرے میں مقید مور ہمارے جانے کے بعد ہمیں یاد کرے گا۔ اس جھرنے کا تیز بہتا پانی' پانی میں رکھے پتھر' اور اس پل کے قریب لگے درخت پر وہ اداس گیت گاتی چڑیا ہمیں یاد کرے گی؟ سیاح سمجھ نہیں پاتا' ورنہ ہمارے قدموں کے نشان تو صدیوں ان پتھروں' مرغزاروں اور ان کچے راستوں پر ثبت رہتے ہیں۔"

"کل شام تمہیں کیا ہو گیا تھا' افق؟" وہ خاموش ہوا تو اس نے پوچھا۔ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ افق نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کل شام؟"

"ہاں۔۔۔ کل۔۔۔ شام!"

"تم نے اپنی ناشپاتی نہیں کھائی۔"

"بات مت بدلو۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "بارش آنے والی ہے' چلو واپس چلتے ہیں۔" کھڑے ہو کر اس نے اپنی پینٹ جھاڑی' ایک سرخ رنگ کا کیڑا اس کے گھٹنے سے نیچے پتھریلی زمین پر گرا۔

"تم جاؤ۔ میں بعد میں آجاؤں گی۔" پری نے خفگی سے منہ پھیر لیا۔ جھرنے کے بہتے پانی نے دیکھا تھا کہ وہ دونوں اس پل ایک دفعہ پھر اجنبی ہو گئے تھے۔

وہ کچھ کہے بنا وہاں سے چلا گیا' وہ پھر ویسے ہو گیا تھا' جیسے کل شام تھا' جیسے جلیل کے ریسٹورنٹ میں تھا۔ اجنبی۔ غیر شناسا۔

پھر کتنی ہی دیر وہ بغیر کھائی ناشپاتی ہاتھ میں لیے وہاں بیٹھی بیتے لمحوں کا شمار کرتی رہی' یہاں تک کہ سیاہ بادل برسنے لگے' تب وہ اٹھی اور پہاڑ کی ڈھلوان سے اترنے لگی۔

وہ پری کو سیڑھیوں پر موروں کے پنجرے کے قریب کھڑا تیز بارش میں بھیگتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ وہ بہت اداسی سے ترک زبان میں ان موروں کو کوئی گیت سنا رہا تھا' سبز اور نیلے پنکھ والا مور ناچ رہا تھا۔ افق کے سر پر کیپ نہیں تھی' بارش نے اس کا پورا جسم بھگو ڈالا تھا۔ اس کو یوں بخار میں باہر کھڑے دیکھ کر اسے بہت غصہ آیا تھا۔

"کیوں کھڑے ہو تم ادھر؟ جاؤ اپنے کمرے میں۔ کتنی دفعہ کہوں تم سے یہ بات؟ سمجھ میں نہیں آتی تمہیں؟ ابھی تمہارا بخار بھی نہیں اترا۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔"

وہ غصے سے بلند آواز میں چلائی تھی۔ سر پر ٹرے رکھ کر بارش کے پانی سے بچتے اس ویٹر نے جو تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اتر رہا تھا' حیرت سے گردن پھیر کر ایک لمحے کو اسے دیکھا ضرور تھا جو خود بارش میں بھیگتی اسے ڈانٹ رہی تھی۔

"تمہیں کوئی حق حاصل نہیں مجھ پر حکم چلانے کا!" وہ بھی جواباً چلایا تھا۔ ایک لمحے کو وہ چپ سی ہو گئی۔ واقعی' کہاں حق رکھتی تھی وہ ایک اجنبی پر؟

"ٹھیک ہے۔ پھر مرو اس بارش میں۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی اوپر آگئی۔ لان میں تین بندر اٹھکھیلیاں کر رہے تھے' لان کو بھاگتے ہوئے کراس کرتے ۔۔۔ اس نے راستے میں پڑی منرل واٹر کی خالی بوتل اٹھا کر میز پر چڑھے بندر کو زور سے ماری' بندر سہم کر جھاڑیوں کے پیچھے گم ہو گیا۔

وہ بارش میں بھیگتی کمرے تک آئی تھی۔ ایک بارش سوات کے پہاڑوں پر ہو رہی تھی' ایک اس کی آنکھوں سے برس رہی تھی۔ وہ خود پر کمبل تان کر پوری دنیا سے چھپ کر رونے لگی۔ ارسہ اور نشاء پرسکون سو رہی تھیں۔

باہر موسلا دھار بارش میں چوڑی سیڑھیوں کے درمیان موروں کے پنجرے کے ساتھ کھڑا افق ارسلان ابھی تک بھیگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ تمام دن اپنے کمرے میں رہی تھی پھر جب دن ڈھل گیا اور افق پر سیاہی پھیلنے لگی تو وہ ٹی وی کے آگے سے ہٹی' جس پر پی ٹی وی اور جیو کے سوائے کوئی چینل نہیں آتا تھا۔ اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا' پھر نشاء اسے زبردستی اٹھا کر وائٹ پیلس کے باہر بنی دکانوں تک لے آئی۔ اس کو سواتی شالوں اور قیمتی پتھروں کی شاپنگ کا کوئی شوق نہیں

تھا' مگر محض نشاء کا ساتھ دینے کو وہ کافی دیر تک وہاں سر کھپاتی رہی۔

دونوں واپس آئیں تو وائٹ پیلس کی سفید عمارت کے سامنے پھیلے وسیع و عریض لان کے وسط میں' دائرے کی صورت میں احمر صاحب' شہلا' افتخار' اریبہ اور افق بیٹھے تھے۔ افق کے پیچھے سنگ مرمر کا سفید بینچ تھا جس سے ٹیک لگائے وہ ایسے بیٹھا تھا کہ دائیں ٹانگ گھاس پر پھیلا رکھی تھی اور بایاں گھٹنا سیدھا کھڑا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے گھاس کے تنکے نوچ رہا تھا۔ اس کی پی کیپ اس کے سر پر تھی۔

احمر صاحب اور باقی افراد کسی بحث میں محو تھے۔ نشاء بھی ساتھ شامل ہو گئی۔ صرف وہ اور افق خاموش تھے۔ وہاں وائٹ پیلس کے برآمدے سے آنے والی روشنی اور چاند کی چاندنی کے علاوہ دوسری کوئی لائٹ نہیں تھی' جس کے باعث وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی تھی' مگر وہ اسے پہلے کی نسبت بہتر لگا تھا۔

"اتاترک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے' افق؟" احمر انکل بحث کو مشرف سے اتاترک تک لے گئے تھے' ان کے پکارنے پر اس کی گھاس نوچتی انگلیاں رکیں' اس نے چہرہ اونچا کیا۔ چمکتی چاندنی نے اس کے چہرے کے خدوخال کو قدرے واضح کیا تھا۔ نقاہت اور بیماری واضح تھی۔

"اتاترک؟" اس نے دہرایا' پھر شانے اچکا دیے۔ "وہ ترکوں کا باپ تھا۔"

"باپ کبھی بچے کی غلط رہنمائی نہیں کرتا!" احمر صاحب سے پہلے ہی پریشے تیزی سے بولی وہ خفیف سا مسکرایا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں اردگان کا حامی ہوں۔" اس نے اپنی پی کیپ کی جانب ہلکا سا اشارہ کیا جسے وہ سمجھ نہ سکی۔

"ویسے میں نے سنا ہے' تمہارا ڈکٹیٹر اتاترک کو آئیڈیالائز کرتا ہے اور روانی سے ترک زبان بولتا ہے؟" قدرے توقف سے اس نے سوال کیا۔

"وہ اس لیے کہ ہمارے ڈکٹیٹر کا اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔" نشاء ڈکٹیٹر کے ذکر پر چڑ گئی۔

"نشاء' یہ ڈکٹیٹرز بادشاہ Padshah ہوتے ہیں۔ بادشاہوں سے بھی زیادہ اختیار ہوتے ہیں ان کے پاس۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ تمہارا بادشاہ۔۔۔ یورپ اور امریکہ سے آنے والوں کی بہت قدر کرتا ہے۔ مجھے تو اس نے آج تک نہیں پوچھا۔ شاید اس لیے کہ میں مسلمان ہوں؟"

"فکر مت کرو۔ تم راکاپوشی سر کرلو' تمہیں کوئی ایوارڈ دلوا ہی دیں گے!" نشاء نے کہا۔

"کون سا ایوارڈ؟ نشان حیدر!؟" وہ دلچسپی سے بولا۔

"نہیں نہیں۔ وہ تو شہید ہونے کے بعد ملتا ہے اور ملٹری اعزاز ہے۔ خیر تم پہلے کوئی پاکستانی پہاڑ سر تو کرو' قومی اعزاز کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔"

وہ بد مزہ سا ہو کر پیچھے ہوا۔ "میں گیشر بروم ٹو' براڈ پیک اور نانگا پربت سر کر چکا ہوں۔ تمہارے صدر نے مجھے کبھی نہیں بلایا۔ اب تو میں نے امید لگانا بھی چھوڑ دی ہے۔" وہ بہت مصنوعی افسوس سے کہہ رہا تھا۔

"تم نے نانگا پربت سر کیا ہے؟ دی کلر ماؤنٹین؟" پریشے چونکی تھی۔

"ہاں!" وہ کیپ ٹھیک کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں چلتا ہوں' آپ لوگ باتیں کریں۔"

پری کی نگاہوں نے لان عبور کرکے سیڑھیوں پر چڑھتے افق کا دور تک تعاقب کیا تھا' آج وہ موروں کے پنجرے کے پاس نہیں رکا تھا۔

محفل چل رہی تھی' جب وہ وہاں سے اٹھ کر اوپر آگئی۔ وہ افق کو تلاش کر رہی تھی۔ وہ مستطیل لان میں نہیں تھا' نہ ہی اپنے کمرے کے آگے بنے برآمدے میں' وہ تو اپنے کمرے میں بھی نہیں تھا۔ لان میں اس رات بندر بھی نہیں تھے۔

وہ تیسری منزل پر آگئی۔ ایک ہی نگاہ میں اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔

چوکور احاطے کے دائیں طرف کونے میں آگے جا کر ایک بالکونی بنی تھی' اسے وہاں افق کی جھلک دکھائی دی۔ وہ وہیں آگئی۔

وہ بالکونی پرانے وقتوں کے محلوں کی طرز پر بنی تھی۔ اس کی ریلنگ اونچی تھی' جس پر کہنیاں ٹکائے' وہ قدرے جھک کر نیچے جھرنے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے عقب میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کی کیپ کا پچھلا حصہ اس کے سامنے تھا' اس پر سفید مارکر سے کسی نے ہاتھ سے لکھ رکھا تھا۔

Hail to Tayyip Erdogan اس نے یہ وہ پہلی دفعہ نوٹ کیا تھا۔

افق اپنے گرد و پیش سے بے خبر دھیمی آواز میں کچھ

گنگنا رہا تھا۔

"سون اکشام استورین۔۔۔ انجے باناسوزویر۔۔۔"

یکدم کسی کی موجودگی کا احساس کرکے اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

"تمہاری کیپ پر طیب کے ہجے غلط لکھے ہیں' طیب کے آخر میں "B" آتا ہے' تم نے "P" لکھ رکھا ہے۔" اس کے خود کو سوالیہ نظروں سے گھورنے پر جو اس کے منہ میں آیا وہ بول پڑی۔

"میں نے نہیں لکھا۔" چہرہ واپس جھرنے کی طرف موڑ کر وہ بے نیازی سے بولا۔ "یہ جینک کی کیپ ہے' اس نے لکھا ہے۔ ترک زبان میں "B" کی جگہ "P" استعمال ہوتا ہے۔ یہ فقرہ انگریزی میں اس لیے لکھا ہے کہ وہاں ترکی میں لوگ انگریزی سے نابلد ہوتے ہیں۔ ملٹری والے بھی اور وہاں کی ملٹری اردگان کو پسند نہیں کرتی۔"

"مگر تمہاری انگریزی تو بہت اچھی ہے۔" وہ اس کی طرح ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے کھڑی ہوگئی' فرق یہ تھا کہ وہ سامنے دیکھ رہا تھا اور وہ اسے۔

"میں بچپن میں کافی عرصہ امریکہ میں رہا ہوں' شاید اس کا اثر ہو۔"

"اچھا۔ تم نے جینک کی کیپ کیوں لے رکھی ہے؟"

"میں مصر جا رہا تھا تو انقرہ کے ایئرپورٹ پر یونہی مذاق میں' میں نے اس کی کیپ چھینی اور اس نے میری۔ بس پھر بعد میں واپس ہی نہیں کر سکا۔" وہ رکا اور قدرے توقف سے بولا۔ "ہم دونوں انجینئرز ہیں اور سائٹ پر جاتے ہوئے کیپ لیتے ہیں' دھوپ ہوتی ہے۔ تو بس عادت پڑ گئی ہے۔"

"اور یہ مفلر؟" اس نے گردن میں موجود مفلر کی طرف اشارہ کیا۔ افق نے گردن جھکا کر اسے دیکھا۔

"یہ مفلر نہیں ہے' یہ ترکی کا جھنڈا ہے۔"

"اوہ!" وہ حیران ہوئی۔ "میں تو اسے مفلر سمجھی تھی۔"

"میں اسے راکا پوشی پر لہرانے کو لایا ہوں۔" وہ پھر سے اندھیرے میں دیکھنے لگا تھا۔ وہ اس کی جانب دیکھنے سے دانستہ گریز کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کرکے افق نے گردن ترچھی کرکے اسے دیکھا۔

"تم ابھی کیا گا رہے تھے؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ ہمارا ایک لکھاری ہے احمت اومت' اس نے لکھی تھی۔ ایک ترسری رائم ہے۔۔۔ کائنڈ آف۔۔۔" پھر وہ رخ پھیر کر ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا اور دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔

"کیا مطلب ہے اس کا؟"

افق اس کو مطلب سمجھانے لگا۔

"مجھے سناؤ نا۔ ویسے ہی' جیسے تم ابھی گنگنا رہے تھے۔" وہ ضد کر رہی تھی۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی' پھر وہ بہت مدھم آواز میں گنگنانے لگا۔ "سون اکشام استودین۔۔۔ "انجے باناسوزویر۔۔۔

"(زندگی کے سفر میں بچھڑنے سے پہلے
ملن کی آخری شام کے ڈھلنے سے پہلے
اور ایک دوسرے کی سانسوں اور
دھڑکنوں کی آخری آواز سننے سے پہلے
کہ جس کے بعد تم میری دنیا سے دور چلے جاؤ گے.
تمہیں مجھ سے
ایک وعدہ کرنا ہوگا
جب بھی سورج طلوع ہوگا
اور اناطولیہ کی گلیوں میں روشنی بارش کے قطروں کی طرح گرے گی اور ارارات کے جامنی پہاڑوں پر جمی برف پگھلے گی۔
اور پھر جب اس برف میں دبی داستان مارمرا کے پانیوں میں بہہ جائے گی۔
تب تم کو مجھ سے ایک وعدہ نبھانا ہوگا
کہ اس رات کے بعد اپنی زندگی میں آنے والی
ہر صبح کی ٹھنڈی ہوا
اور ہر بارش کے بعد گیلی مٹی
اور جامنی پہاڑوں پر دودھ کی سی جمی برف کو دیکھ کر
تم مجھے یاد کرنا
کہ یہ میرا تم پر
اور تمہارا مجھ پر
قرض ہے

وہ اسی مدھم سر میں ریلنگ سے ٹیک لگائے' آنکھیں موندے گنگنا رہا تھا اور وہ اس کے لہجے' اس کی آواز میں کھوئی ہوئی تھی۔

دفعتاً بادل گرجے تو افق چونک کر رک گیا' اور گردن اٹھا کر سیاہ' تاریک آسمان کو دیکھا۔

"چلو چلتے ہیں' بارش ہونے لگی ہے۔" وہ چل پڑا' پری اس سے پیچھے' اس کے جوتوں کے نشانات پر' جو گھاس میں گم ہو رہے تھے' پاؤں رکھتی چلنے لگی۔

نیچے' اپنے کمرے کی چوکھٹ پر پہنچ کر' دروازہ بند کرنے سے پہلے افق نے ایک لمحے کو رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"آئی ایم سوری۔۔۔ آئی ایم سوری فار ایوری تھنگ۔" صبح والے واقعے کے متعلق دھیرے سے کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔

دور تاریک آسمان پر بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

جمعرات 28 جولائی 2005ء

سوات کے پہاڑوں پر ٹھنڈی' پُرنم اور بادلوں سے ڈھکی صبح اتری ہوئی تھی۔ سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا' کل کی طرح آج بھی بادلوں نے آسمان کو اپنی راجدھانی بنایا ہوا تھا' مگر آج ان کا رنگ ہلکا تھا۔

"خدا کرے آج بارش نہ ہو۔" اپنے کمرے سے باہر برآمدے میں آتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں بے اختیار دعا مانگی تھی۔ آج انہیں سوات سے کالام جانا تھا۔ تھا تو کالام' ضلع سوات کی تحصیل ہی' مگر پھر بھی لوگ مینگورہ اور سیدو شریف کو ہی "سوات" بولتے تھے۔

برآمدے سے باہر' لان کے وسط میں جس جگہ کل وہ نماز پڑھ رہا تھا' آج بھی وہ ادھر ہی بیٹھا تھا۔ آج وہ نماز نہیں پڑھ رہا تھا۔ اس نے کیپ الٹی کرکے رکھی تھی' پاؤں میں جرابیں تھیں' بلیو جینز کے پائنچے اوپر تہہ کیے ہوئے تھے اور آنکھیں بند کیے وہ بالکل گوتم بدھ کے انداز میں دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھا یوگا کر رہا تھا۔

وہ دبے قدموں سے چلتی اس کے عقب میں آئی' جوتے ایک طرف اتارے اور اس کے پیچھے دائیں طرف' اسی کے بدھا والے انداز میں آلتی پالتی کرکے بیٹھ گئی۔

افق نے آنکھیں کھولیں اور ہاتھوں کی پوزیشن بدلنے ہی لگا تھا کہ کسی احساس کے تحت پلٹ کر دیکھا۔ پریشے کو اپنے پیچھے یوگا کے Sukhasana پوز میں بیٹھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشگوار حیرت در آئی۔

"صبح بخیر۔۔۔ یوگا؟" اس نے یک لفظی استفسار کیا۔

"صبح بخیر۔ ہاں' یوگا!"

وہ گھاس پر لیٹ گیا' بازو سر کے پیچھے کرکے پاؤں کیاری کی اینٹوں تک لمبے کیے اور فلور پوز کرتے ہوئے پوری قوت سے اینٹوں کو دھکیلا۔

"کب سے کر رہی ہو یوگا؟"

"دو منٹ پہلے سے۔" وہ اپنے جواب پر خود ہی ہنس پڑی۔

"واقعی؟" گھٹنے کو لیٹے لیٹے سینے تک لے جاتے ہوئے افق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"نہیں۔ میں سولہ سال کی عمر سے یوگا کر رہی ہوں۔"

"تب ہی تم اپنی عمر سے کم دکھتی ہو۔" وہ اب بائیں گھٹنے کو آہستہ آہستہ اوپر نیچے کر رہا تھا۔

"شکریہ۔۔۔ میں کتنے کی دکھتی ہوں؟"

"سولہ سال کی!"

"میرا خیال ہے' اب تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"جھوٹ نہیں' مبالغہ آرائی۔" وہ ہولے سے ہنسا۔ "تم اکیس بائیس برس تک کی دکھتی ہو۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

وہ یوگا چھوڑ کر لان میں رکھی سفید کرسی پر جا بیٹھی۔

"کیا ناراض ہوگئیں؟" وہ ماؤنٹین پوز کرنے کے لیے کھڑا ہوگیا تھا۔

"اونہوں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں ہفتے میں صرف تین دفعہ یوگا کرتی ہوں' آج وہ دن نہیں ہے۔"

وہ سر ہلا کر خاموشی سے یوگا کرتا رہا۔ کتنی ہی دیر خاموشی چھائی رہی۔ دور جنگل سے جانوروں کے بولنے کی آوازیں وقفے وقفے بعد سنائی دے رہی تھیں۔ "کتنے بجے جانا ہے کالام؟" وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی' سو یہی پوچھ لیا۔

"ظفر نے آٹھ بجے کا کہا تھا۔" اپنی مشق ختم کرکے اس نے گھاس پر رکھی کیپ' جو اس نے لیٹنے سے پہلے اتار دی تھی' اٹھا کر سر پر رکھی اور میز پر پڑی گھڑی اپنی بائیں کلائی میں پہننے لگا۔

"تم پہلے کتنی دفعہ ان علاقوں میں آچکے ہو؟"

"دو دفعہ پہلے آیا تھا' ایک دفعہ تب جب گیشر بروم ٹو سر کرنے آیا تھا اور دوسری دفعہ دو سال پہلے۔" وہ گھاس پر بیٹھا جوگرز پہن رہا تھا۔

"دو سال پہلے کیوں آئے تھے؟"

"یونہی۔" وہ سر جھکائے جوگرز کے تسمے بند کرتا رہا۔

پریشے جواب کے انتظار میں اس کے ہاتھوں پر نگاہیں مرکوز کیے رہی، بائیں کلائی میں پہنی گھڑی کو آج پہلی دفعہ اس نے غور سے دیکھا تھا۔ اس کے سیاہ چمکتے ڈائل کے درمیان میں ہیروں کا چھوٹا سا اہرام بنا تھا۔

"اچھی ہے نا میری گھڑی؟ اسکندریہ سے لی تھی۔ مصری اپنا ٹریڈ مارک ہر چیز میں بہت شوق سے ڈالتے ہیں۔" وہ ہنس کر کہتا ہوا پینٹ جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ ہمارے وائٹ پیلس میں آخری دو گھنٹے ہیں۔ آؤ یہاں گھومتے پھرتے ہیں۔" وہ اس کے ہمراہ سیڑھیوں کی طرف چلی آئی۔

"تم نے وہ کمرہ دیکھا ہے پہلی منزل پر جس کو رائل سوئٹ کہتے ہیں، اس میں ملکہ الزبتھ ٹھہری تھی۔" وہ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس کو اس تین سو سال قدیم وائٹ پیلس کی تاریخ بتا رہا تھا، اس نے بے اختیار جماہی روکی۔

"یہ ہوٹل پہلے والئ سوات کا محل تھا۔ پھر۔۔۔" وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے بہت کچھ بتا رہا تھا، وہ بور ہونے لگی تھی۔ اسے وائٹ پیلس کی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر محض اس کا دل رکھنے کو وہ سنتی رہی۔

موروں کا پنجرہ پیچھے چھوڑ کر وہ نیچے روش پر آئے تو وہ بڑا سا لان خاموشی میں ڈوبا تھا۔ روش کے اختتام پر ناشپاتی کا درخت تھا، جس کے ساتھ کرسی ڈالے وہ بوڑھا سیکیورٹی گارڈ بیٹھا تھا۔

"تم کیا ہر سال یونہی سیر و سیاحت کے لیے نکل جاتے ہو؟" وہ دونوں چلتے چلتے روش کے ایک طرف، بنے نیلی ٹائلز والے فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔

"ہر سال؟ میں تو سال کے دس مہینے نگر نگر پھرتا ہوں۔ میں پیدائشی سیاح ہوں۔ مجھے دنیا کو ایکسپلور (دریافت) کرنے کا شوق ہے، اس کو گھوم پھر کر دیکھنے کا شوق ہے۔ سیاحت انسان کی زندگی بدل ڈالتی ہے آپ ایک دفعہ پہاڑوں پر نکل جائیں تو واپسی پر آپ ویسے نہیں ہوتے، آپ بدل جاتے ہیں پہاڑوں کا سفر انسان کو بدل ڈالتا ہے۔ اس کے بعد

" Life is Never the same again

"میسنر نے کہا تھا، اگر عالمی لیڈرز چند دن کسی پہاڑ پر اکٹھے چڑھتے گزار دیں، تو دنیا کے تمام معاملات اور مسائل حل ہو سکتے ہیں۔"

"اگر دوا چھے کو وہ پیا بھی چند دن راکاپوشی پر ساتھ گزار دیں، تو یقین کرو ان کے بھی سارے مسائل ہو سکتے ہیں۔" اس نے بڑی سنجیدگی بھری معصومیت سے کہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"ہو سکتا ہے، مسائل بڑھ جائیں۔"

"کم آن تم ایک کلائمبر ہو، تمہیں دنیا کا سب سے خوب صورت پہاڑ دیکھنا چاہیے۔"

"میں نے تصویروں میں دیکھ رکھا ہے۔"

"تمہیں اسے سر کرنا چاہیے!"

"وہ میں خیالوں اور خوابوں میں کئی دفعہ کر چکی ہوں۔"

"مگر تمہیں "میرے" ساتھ سر کرنا چاہیے۔" اس نے "میرے" پر زور دیا۔

"ناممکن ہے کیونکہ پاپا مجھے قراقرم کی شکل دوبارہ نہیں دیکھنے دیں گے، میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ گارڈ کہاں جا رہا ہے؟" اس کے اصرار سے بچنے کی خاطر اس نے اس کی توجہ بوڑھے گارڈ کی طرف دلائی جو کسی کام سے ہوٹل کی عمارت کی طرف جا رہا تھا۔ افق نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ "اس کو شاید کسی نے بلایا ہے۔"

"تم نے کبھی چوری کی ہے؟"

افق نے گردن واپس گھما کر آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"نہیں!"

"میں نے بھی نہیں کی۔ مگر اب میرا دل کر رہا ہے۔"

"چوری کرنے کا؟"

"نہیں، تم سے کروانے کا۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" افق نے اسے گھورا۔

"تم جانتے ہو، تم بہت گڈ لکنگ ہو۔"

"میں خوشامد سے متاثر نہیں ہوتا۔ سوری!"

"اور تم ایک بہت اچھے انسان بھی ہو۔"

"میں سچ سن کر بھی غلط کام نہیں کرتا۔"

"اور میں دعا کروں گی کہ تم راکاپوشی سر کر لو۔ اگر تم مجھے اس درخت پر سے ایک ناشپاتی توڑ کر لا دو تو!"

وہ چند لمحے خاموشی سے اسے گھورتا رہا، پھر بولا۔ "بہت بہتر۔ لاتا ہوں!" وہ چند قدم کے فاصلے پر اگے درخت تک گیا، اور ہاتھ بڑھا کر ایک شاخ کو اتنی زور سے پکڑا کہ اس پر بیٹھی نیلی چڑیا سہم کر اڑ گئی۔

"اوہ۔ تم نے اسے ڈرا دیا۔" پری نے تاسف سے

آسمان پر اڑتی چڑیا کو دیکھا۔

شاخ ہاتھ میں پکڑے، افق نے رک کر بغور اسے دیکھا۔ پھر مسکرا دیا۔ "تم میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو جو چڑیا کی پروا اور موروں سے سوری کرتی ہے۔"

(زندگی میں؟ کیا وہ اس کی زندگی میں آچکی تھی؟)

"ادھر ترکی میں ہوتی ہیں ناشپاتیاں؟" اس نے بے تکا سا سوال کیا۔

"ترکی میں سب کچھ ہوتا ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک موٹی تازی رسیلی سی ناشپاتی توڑی۔

"اس کو میں مبالغہ آرائی کہوں؟"

"نہیں، تم اس کو ایک محب وطن ترک کا فخر کہو۔" وہ مسکراتا ہوا ناشپاتی لیے اس کے قریب آگیا۔

"یور ہائنیس، ایک ترک سیاح کی طرف سے یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمائیں۔" اس نے جھک کر ناشپاتی ہتھیلی پر رکھے اس کی طرف بڑھائی۔

"شکریہ، ویسے کیا سارے ترک چوری کے تحفے دیتے ہیں؟" اس نے اسے چڑاتے ہوئے ناشپاتی اٹھالی۔

"اے ہیلو، زیادہ بنو نہیں، تمہارے ہی کہنے پر لایا ہوں۔" وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ دونوں فوارے کے کنارے بیٹھے تھے اور ٹانگیں نیچے لٹکا رکھی تھیں۔

"یہ ایک یادگار ناشپاتی ہو گی۔ میں شروع کروں گی اور تم ختم۔ ٹھیک؟" پریشے نے ناشپاتی کی ایک بائٹ لی، اس کا ذائقہ منہ میں محسوس کیا اور اگلے ہی پل اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ہنس کیوں رہی ہو؟"

"یہ ناشپاتی نہیں ہے، افق! ہمارے ساتھ تو دھوکا ہو گیا۔ یہ تو بگو گوشہ ہے۔" وہ مسلسل ہنستی جا رہی تھی۔

"اور کرواؤ چوریاں۔ دیکھ لیا، یہ ہوتا ہے چوری کا انجام۔ تم ناشپاتی سے ملتے جلتے پھل کو ناشپاتی سمجھ کر دھوکہ کھا گئیں۔ بہت اچھا ہوا۔" وہ مصنوعی انداز میں ڈانٹ رہا تھا۔ وہ ہنستی جا رہی تھی۔

"اچھا سنو، مجھے بھی چکھاؤ اور اس کو ختم نہیں کرنا۔ یہ ہم اس فوارے کے پیچھے رکھ دیں گے۔ یہ ایک یادگار ہے۔ کبھی ہم دوبارہ ادھر آئے تو اسے ضرور ڈھونڈیں گے۔" اس نے ایک بائٹ لے کر ادھ کھائے بگو گوشے کو فوارے کے پیچھے کر کے ایک جگہ چھپا دیا، اور وہ جو ہنسے جا رہی تھی یک لخت رک گئی۔

"کبھی ہم دوبارہ ادھر آئے۔۔۔؟" "ہم۔۔۔؟" افق نے "ہم" بولا تھا؟ مگر کیوں؟

اس نے ایک نگاہ اپنی انگلی میں پہنی ایمرلڈ کی انگوٹھی پر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔ مستقبل کسی آٹھ ہزار میٹر بلند پہاڑ کی چوٹی کی طرح دھند میں لپٹا تھا۔

☆ ☆ ☆

جمعہ 29 جولائی 2005ء

"ارسہ، تم اپنے ناول میں یہ بھی لکھنا کہ جب ہم لوگ۔۔۔ میرا مطلب ہے جب ہمارے کردار کالام کی مال روڈ پر پہنچے تو وہاں مری مال روڈ کی طرح کا رش تھا، پورے پاکستان کے لوفر لوگ وہاں جمع تھے، اور یہ بھی لکھنا کہ کالام سے روز صبح نو بجے کرائے کی لینڈ کروزرز، جیپیں اور پجارو دو مختلف "روٹس" پر جاتی ہیں، اور سنو، تم یہ بھی لکھنا کہ تمہارے کردار آنسو جھیل والے روٹ کے بجائے ماہو ڈھنڈ جھیل والے روٹ پر جا رہے تھے، ہماری طرح۔۔۔ اور۔۔۔"

وہ چاروں آگے پیچھے مال روڈ کے کنارے پر چلتے ہوئے دائیں طرف بہتے دریا پر بنے اس لکڑی کے پل کی طرف جا رہے تھے جس کے دوسری طرف سڑک پر لینڈ کروزرز اور پیراڈوز کی ایک لمبی قطار کھڑی تھی، ان کرائے کی گاڑیوں کے ماہر ڈرائیور اپنے اپنے مسافروں کا انتظار کر رہے تھے۔

"آگے میں بتاتا ہوں ارسہ! آگے تم لکھنا، ان کے پاؤں کے نیچے سڑک تھی، اور سر پر آسمان تھا۔ اور دریا کا پانی شور بہت مچاتا تھا۔۔۔" وہ ارسہ کو جس طرح آئیڈیاز دے رہی تھی، اس طرح اس کے انداز کی نقل کرتے ہوئے وہ بولا تو پریشے نے برا سا منہ بنایا۔

"زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ میں اسے صرف مشورہ دے رہی تھی!"

"ہاں تو میں بھی مشورہ ہی دے رہا ہوں۔" وہ اسے چڑا رہا تھا، وہ خفگی سے سر جھٹک کر رفتار تیز کر کے آگے نکل گئی۔

"سنو ارسہ! ایک خبر سناؤں؟" پیچھے آتے افق نے دانستہ بلند آواز میں محض اسے سنانے کی غرض سے کہا، پریشے نے چلتے ہوئے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔

"ارسہ، تو ماز ہومر پاکستان میں ہے۔"

کانوں پر ہاتھ رکھنے کے باوجود اسے سنائی تو دیا تھا، خبر ہی

ایسی تھی کہ وہ جھٹکے سے مڑی اور پوری آنکھیں کھول کر اس کو دیکھا۔ "واقعی؟ کدھر؟ کالام میں ہے؟"

"میں تو ارسہ کو بتا رہا تھا۔" وہ تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ہاں تو اسے ہی بتاؤ' میں کون سا سن رہی ہوں۔" اس نے شانے جھٹکے اور آگے ہولی۔

"ویسے ارسہ' وہ نانگا پربت جا رہا ہے۔"

"میں نہیں سن رہی!" پریشے نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اتنی بلند آواز میں کہا کہ قریب سے گزرتے دو لڑکے رک کر اسے دیکھنے لگے۔

"تم لوگ کیا سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر ٹین ایجز والی حرکتیں کر رہے ہو؟ تیز چلو!" نشاء نے گھر کا تو اسے احساس ہوا سو پل پار کرنے تک وہ سارا راستہ خاموش رہی۔

وہ اس گرے اور سلور پیراڈو پر ماہوڈھنڈ کے روٹ پر جا رہے تھے۔ زیادہ تر گاڑیاں ماہوڈھنڈ ہی جا رہی تھیں' آنسو جھیل کی طرف ٹورسٹ بہت کم جاتا تھا۔ کرائے کی ان گاڑیوں کے ڈرائیور پُر خطر راستوں پر ڈرائیونگ میں مہارت رکھتے تھے۔ لاہور' کراچی میں گاڑی چلانے والا عام ڈرائیور کالام سے آگے کے ان راستوں پر گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔

وہ پیراڈو کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور اسے پہچان گیا تھا۔ کل شام' کالام پہنچنے کے بعد' یہ پریشے ہی تو تھی جس نے ظفر کے ساتھ اس ڈرائیور سے آج کی سواری کا سودا طے کیا تھا۔ ظفر بارہ سو دینا چاہتا تھا' جبکہ ڈرائیور پندرہ سو مانگ رہا تھا۔ پریشے کو تین سو روپے کے لیے اتنی تکرار اچھی نہیں لگی' سو اس نے معاملہ خود ہی سیٹل کرا دیا تھا۔

وہ پیراڈو کے ساتھ کھڑی پل کی جانب دیکھنے لگی' جہاں وہ تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے آ رہے تھے۔ افق سب سے آگے تھا' بلیک جینز' میرون شرٹ' سفید ٹورسٹ جیکٹ' گردن میں سرخ مفلر' سر پہ پی کیپ' پاؤں میں جوگرز اور کندھے پر بیک پیک اٹھائے' چیونگم چباتا وہ اس کی جانب آ رہا تھا۔

رنگوں کے اس امتزاج پر پریشے کو حیرت ہوئی تھی کیونکہ اس نے خود بھی سیاہ ٹراؤزرز کے اوپر میرون' کشمیری کڑھائی والا کرتا اور بڑا سا دوپٹہ لے رکھا تھا۔ بالوں کو اس نے کیچر میں باندھ رکھا تھا اور پاؤں میں پنک اور وائٹ جوگرز تھے۔

افق پیراڈو کی فرنٹ سیٹ پر جبکہ وہ تینوں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے بالکل پیچھے بیٹھی تاکہ اسے افق کا چہرہ ٹھیک سے دکھائی دے۔ اسے خود پر بھی حیرت ہوئی کہ جب وہ مری میں ملے تھے تو وہ اس سے بات تک نہیں کر رہی تھی اور اب وہ کتنے اچھے دوست بن چکے تھے؟ اس سفر میں اسے پانچ دن بھی نہیں ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا کہ جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔

پیراڈو پُر خطر راستوں پر دوڑنے لگی تو وہ کھڑکی سے باہر دائیں طرف بہتے نیلے دریا کو دیکھنے کے بجائے افق سے پوچھنے لگی۔ "تمہیں کیسے پتا کہ توماز پاکستان آیا ہوا ہے؟"

"میں اس کا میڈیا ایڈوائزر تو ہوں نہیں' ظاہر ہے اخبار میں ہی پڑھا ہے۔"

"تم اس سے کبھی ملے ہو؟" اسے جاننے کا بہت اشتیاق تھا۔

"پریشے جہاں زیب' یہ کلائمبنگ ورلڈ بہت چھوٹی اور گول ہوتی ہے' یہاں درجنوں بار آپ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ میں توماز سے پچھلی بار نانگا پربت پر ٹکرایا تھا' وہ آ رہا تھا اور میں جا رہا تھا۔"

"کیسا ہے دیکھنے میں؟ اتنا ہی گڈ لکنگ جتنا تصویروں میں آتا ہے؟"

"اب میں اس سے جیلیس ہو رہا ہوں' اس لیے پلیز اس کے ٹاپک کو بند کر دو۔" وہ مسکین سی صورت بنائے ہاتھ جوڑ کر بولا' تو وہ بڑبڑاتی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"ویسے پری۔" اس نے محض چھیڑنے کی غرض سے اسے پکارا۔ "تمہاری گورنمنٹ ان علاقوں میں گیس کیوں نہیں لاتی؟ یہ لوگ دیار کی قیمتی لکڑی کو ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔"

"گورنمنٹ وردی اتار دے' یہ بہت ہے۔ گیس بھی آتی رہے گی۔" نشاء گورنمنٹ کے ذکر پر بدمزہ ہو گئی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔ پریشے خاموش رہی کیونکہ غیر ملکیوں کے سامنے وہ اپنے ملک کی کسی خامی کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی' اس نے دل ہی دل میں دعا کی کہ افق اس ٹاپک کو بند کر دے' چور نظروں سے اس نے ارسہ کو بھی دیکھا' ارسہ نے بات سنی ہی نہیں تھی' وہ مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

"کیا ہوا ارسہ؟"

"وہ... ابھی آتا ہے تو دکھاتی ہوں... پچھلے سال تو ادھر ہی تھا۔ پتا نہیں کدھر گیا۔" وہ دور دور تک پھیلے پہاڑی سلسلے کو متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"مگر تھا کیا؟"

"پہاڑ تھا، پتا نہیں کدھر گم ہو گیا ہے۔" وہ فکر مند سی تھی۔

"لیں... ان کی سنیں۔ پہاڑ کبھی گم ہوئے ہیں' ارسہ میڈم؟" افق خوب ہنسا تھا' ارسہ نے سنا ہی نہیں۔

"مجھے لگتا ہے اس ڈرائیور کی گاڑی کے مالک سے کوئی دشمنی ہے' تب ہی اتنے کنارے پر ڈرائیو کر رہا ہے۔ ابھی بہہ ادھر ہوا اور ہم گئے نیچے۔" نشاء نے پریشے سے انگریزی میں کہا' اس نے کھٹ سے وہی بات ڈرائیور سے کہہ دی۔

"باجی! یہ امارہ روز کا روٹ ہے' آپ نہیں گروگی' اللہ خیر کرے گا۔" وہ جھینپ کر بولا۔

"آپ" ایسے کہہ رہا ہے جیسے ہم اکیلے کریں گے' خود بھی تو ساتھ ہی گرے گا نا!" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ اسے اتنے پُر خطر راستے سے بہت خوف آ رہا تھا۔

افق تصویریں بنا رہا تھا' ارسہ ابھی تک پریشانی سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی' پریشے نے گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کتنا فاصلہ رہ گیا ہے؟"

"گھنٹے تک اشو ویلی پہنچ جائیں گے۔" جواب افق نے دیا تھا۔ وہ آج بہت بول رہا تھا' اور خاصے ہشاش بشاش موڈ میں تھا۔ "پہلے اشو ویلی رکیں گے' پھر گلشنر' پھر آبشار پر اور آخر میں جھیل' جہاں ہم آج رات گھاس پر گزاریں گے۔ پری! تم اس ملک میں رہتی ہو اور تم نے ابھی تک یہ جگہیں..."

"وہ آگیا۔ وہ دیکھو۔ بالکل سامنے۔" ایک دم ارسہ خوشی سے چلائی تھی۔ "وہ سامنے ہے' وہ دیکھو... جھگوری!"

"جھگوری؟ ادھر؟ کالام میں؟" پریشے نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا' جہاں بالکل سامنے جامنی پہاڑوں کے سلسلے کے درمیان ایک الگ سا برف سے ڈھکا سفید پہاڑ کھڑا تھا۔

"یہ جھگوری ہے؟ مگر جھگوری تو اسکردو سائیڈ پر ہے... قراقرم کے پہاڑوں میں... ہے نا افق؟" اس نے الجھ کر افق کو مخاطب کیا' مگر وہ اپنی گود میں رکھے کیمرے کو دیکھ رہا تھا' اس نے جواب نہیں دیا۔

"یہ جھگوری نہیں ہے' مگر مقامی لوگ اسے جھگوری کا چھوٹا بھائی کہتے ہیں۔ بالکل وہی اہرام والی شکل ہے اس کی۔ ویسا ہی دکھتا ہے نا؟" ارسہ بڑی خوشی خوشی بتا رہی تھی۔

"واقعی... بالکل ویسا ہی ہے۔" اس کے لہجے میں فخر اتر آیا تھا۔ آخر کو جھگوری' دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی اس کے ملک میں تھی' وہ فخر کیوں نہ کرتی؟

"ویسے افق! جھگوری کا نام کے ٹو کس نے رکھا تھا؟" افق اپنے کیمرے میں مصروف تھا' اس نے جواب نہیں دیا۔

"افق!" پریشے نے پھر اسے پکارا۔

"پتا نہیں' مجھے یہ سیٹ کرنے دو نا۔" وہ کیمرے پر جھکے بے زار سی آواز میں بولا۔ پریشے نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا۔

"میں بتاتی ہوں پری آپی! جب کیپٹن ٹی جی منٹگمری نے قراقرم کے پہاڑوں کا سروے کیا تھا تو اس نے جس ترتیب سے پہاڑ دیکھے تھے' اسی ترتیب سے ان کا نام رکھ دیا تھا۔ کے ون' کے ٹو' کے تھری اور کے فور وغیرہ۔"

"کے سے کیا مراد ہے؟" نشاء نے پوچھا۔

"Kis for karakorams" وہ مزے سے بولی۔ "ہے نا پری آپی؟" اس نے تائید چاہی۔

"ہوں!" پریشے نے تو اس کی بات ٹھیک سے سنی بھی نہیں تھی۔ وہ تو افق کو دیکھ رہی تھی جو سر جھکائے کیمرے کے بٹنز خوامخواہ پریس کر رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا ذہن کہیں اور ہے۔ وہ ایک دم اتنا بے زار اور اکتایا کیوں گیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔

اشو ویلی پہنچنے تک سارا رستہ وہ اور افق خاموش رہے تھے۔ وہ اپنے کیمرے پر جھکا رہا اور پریشے خالی الذہنی کی کیفیت میں کھڑکی سے باہر' نیچے بہتے نیلے دریا کو دیکھتی رہی۔

کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ افق اس سے کچھ کہے' اپنے اور اس کے نامعلوم' ان کہے تعلق کی وضاحت کرے' اسے بتائے کہ وہ اس کے لیے کیا سوچتا ہے۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ ان دونوں کے درمیان اگر کچھ ہے تو وہ کیا ہے' مگر یہ سب وہ اس سے کہنے سے قاصر تھی۔

اشو' فلک بوس پہاڑوں کے درمیان بنی ایک چھوٹی سی وادی تھی' جس کے درمیان سے اشو کا دریا بہتا تھا۔ وادی میں سیاحوں کی خاصی گہما گہمی تھی۔ ان کی پیراڈو کے ساتھ پجارو اور جیپوں کا جو ایک پورا قافلہ کالام سے نکلا تھا' ان میں سے تقریباً سب ہی گاڑیاں اشو میں رک گئی تھیں' مزید پیچھے آ رہی تھیں۔

"آؤ۔ اس کیبن میں چلتے ہیں۔" یہ پہلی بات تھی جو ادھر آ کر افق نے کی تھی' اس نے چونک کر اسے دیکھا' پھر اس کے پیچھے چل دی۔

سڑک کے دائیں طرف نیچے شور مچاتا نیلا دریا بہہ رہا تھا۔ سڑک کے بالکل دہانے پر' حقیقتاً" دریا کے اوپر لکڑی کا ایک کیبن سا بنا تھا۔ اس کا فرش لکڑی کے تختوں کا تھا' جن کی درزوں سے کئی فٹ نیچے بہتا نیلا دریا دکھائی دیتا تھا۔

وہ جس طرف سے کیبن میں داخل ہوئے' وہ کھلی تھی' باقی تین اطراف میں نیچے کر کے لکڑی کے پھٹے لگے تھے' اور وہ کیبن بالکل بالکونی لگ رہا تھا۔

کیبن میں دونوں طرف لکڑی کے بنچ اور درمیان میں لکڑی کی ہی میز رکھی تھی' وہ ایک بنچ کے آخری سرے پر ٹک گئی' تاکہ بائیں طرف بہتا دریا اچھی طرح دیکھ سکے۔ نشاء اور ارسہ وہاں نہیں آئی تھیں' وہ کولڈ ڈرنک لینے چلی گئی تھیں۔ افق لکڑی کی ریلنگ کو تھامے جھک کر نیچے بہتے دریا کو دیکھ رہا تھا۔

"سنو!" اس نے افق کو پکارا' مگر دیو قامت سرمئی پتھروں سے ٹکراتے نیلے پانی کا شور اتنا بلند تھا کہ وہ سن نہ سکا۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

"سنو' تمہارا موڈ کیوں خراب ہوا تھا؟" لکڑی کی ریلنگ سے پشت ٹکا کر ایسے کھڑی ہوئی کہ دریا پشت پر' اور افق سامنے تھا۔

وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ "میرا موڈ؟ نہیں تو۔"

"کبھی کبھی تم اتنے اجنبی بن جاتے ہو کہ..." وہ رک گئی اور گردن پھیر کر پیچھے بہتے دریا کو دیکھنے لگی۔

"کہ؟" وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"کہ مجھے خوف آنے لگتا ہے۔" نیچے بہتے نیلے پانی اور اس کے سفید جھاگ پر نظریں جمائے وہ سرگوشی میں بولی۔

"اچھا؟" وہ ہولے سے ہنس دیا۔

پریشے نے رخ موڑ کر سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "اس روز جلیل کے ریسٹورنٹ میں بھی تم ایسے ہو گئے تھے۔ مجھے دکھانے کو بلی کو پیار کر رہے تھے۔ ہے نا؟"

"تمہیں وہ بات ابھی تک یاد ہے؟" وہ جواب دیے بنا گردن پھیر کر پانی کو دیکھنے لگی۔

"آئی ایم سوری فار ڈیٹ پری' میں... بس... پتا نہیں کبھی مجھے کچھ ہو جاتا ہے۔" اس نے گردن موڑ کر اسے نہیں دیکھا' وہ یونہی پیچھے دریا کو دیکھتی رہی۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پتھروں سے سر پٹختے پانی کے شور کے باوجود اسے بہت خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔

"جانتی ہو پری! جب میں نے تمہیں مارگلہ کی پہاڑیوں پر پہلی دفعہ دیکھا تھا تو مجھے کیا لگا؟ مجھے لگا میں واقعی کسی پری کو دیکھ رہا ہوں۔ تم نے وائٹ اور پنک رنگ پہن رکھا تھا' تمہیں یاد ہے؟ میں یوں بھی کبھی اجنبیوں سے فرینک نہیں ہوتا' میری طبیعت کچھ اور ہے۔ موڈی کہہ لو' اکھڑ کہہ لو... مگر تم سے بات کرنے کو میرا دل چاہا تھا۔"

کیبن کے دائیں طرف سے دھوپ اندر آنے لگی تھی' سورج کی شعاعیں ڈائریکٹ پریشے کے چہرے پر پڑ رہی تھیں' وہ اس کے دائیں طرف سے آ کر کھڑا ہو گیا' دھوپ کا راستہ رک گیا تھا۔

"تمہیں دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میں تمہیں جانتا ہوں' ہزاروں برس سے جانتا ہوں' تم میری ذات کا وہ گمشدہ حصہ ہو جو ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا' ہم دونوں صدیوں پہلے کسی اور دنیا میں بچھڑے تھے اور اس روز مارگلہ کی پہاڑیوں پر پھر سے مل گئے تھے۔ تمہیں ایسا لگتا ہے پری؟"

پریشے نے سر جھکا لیا' اپنے جوگرز تلے لکڑی کے تختوں کی درزوں سے اسے جھاگ اڑاتا نیلا پانی نظر آ رہا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا' وہ کچھ نہ بولی۔ تب ہی اسے ارسہ کی آواز سنائی دی' وہ افق کو بلا رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا' وہ چند گز کے فاصلے پر کھڑی دور ہی سے' بہت بلند آواز میں اسے کسی ٹریک کا بتا رہی تھی۔ وہ سر ہلا کر پریشے کے دائیں طرف سے ہٹ گیا۔ سورج کی تیز شعاعیں اس کے چہرے سے ٹکرائی تھیں' اسے لگا وہ اس کے جانے سے ایکدم تنہا رہ گئی ہو۔ بھری دھوپ میں بالکل تنہا۔

ارسہ کی طرف جاتے افق کی پشت کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگتے چلے گئے۔

ان دونوں کا سات دنوں کا ساتھ تھا' دو دن مزید رہ گئے

"نہیں۔ ارسہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ گھبرا کر وضاحت دینے والے انداز میں کہنا چاہ رہی تھی' ارسہ نے تو جیسے سنا ہی نہیں تھا' وہ نیچے سے آتے ایک گلابی رخساروں والے بچے کی طرف متوجہ ہو چکی تھی جو ہیٹ بیچ رہا تھا۔

پریشے نے سر جھکا کر خشک لبوں پر زبان پھیری۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے ارد گرد کے لوگ کیا واقعی سب کچھ جان گئے تھے؟

"میں کیسی لگ رہی ہوں؟" وہ بچے سے ایک ہیٹ لے کر سر پر ٹرائی کر رہی تھی۔

"بالکل ٹائی ٹینک والی کیٹ ونسلٹ!"

"میں اتنی موٹی لگ رہی ہوں؟ بس رہنے دو' مجھے نہیں چاہیے ہیٹ۔" اس نے فوراً" ہیٹ اتار کر بچے کو واپس کر دیا' اس کی گلابی رنگت پر مایوسی چھا گئی' وہ بجھے چہرے کے ساتھ پلٹنے لگا۔

"سنو' مجھے تو دکھاؤ ہیٹ!" اس سے رہا نہ گیا تو بچے کو بلالیا۔ وہ فوراً" پلٹا اور سارے ہیٹ اس کے سامنے رکھ دیے۔

"میں اسے پہن کر کچھ اوور تو نہیں لگ رہی؟" اس نے ایک اسکن کلر کا سادہ ہیٹ جس میں ادھ کھلا اصلی' بے حد سرخ گلاب لگا تھا' خرید لیا۔

"نہیں' بہت اچھا۔ ہیٹ ہے۔" افق نے مسکرا کر کہا۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ "تم اچھی لگ رہی ہو۔" اس نے ایک دفعہ غلطی سے اس کی ہنسی کی تعریف کر دی تھی' وہ بھی شاید مذاق میں کی تھی۔ وہ کبھی اس کی میغلنی آنکھوں' رسیلے ہونٹوں' یا سیاہ چمک دار بالوں کی تعریف نہیں کرتا تھا' وہ شاید اس کو غور سے دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ ظاہری چیزوں کی پوجا کرنے والوں سے بہت مختلف تھا۔

افق ہاتھ پانی میں ڈالے اس ہیٹ والے بچے کی طرف پانی اچھال رہا تھا' بچہ اپنا ہیٹ ایک طرف رکھ آیا تھا اور آبشار کے بالکل کنارے پر اپنی پنڈلیاں ڈالے "ایک انگورے" ٹورسٹ کے مذاق کو انجوائے کر رہا تھا' ساتھ ساتھ وہ بھی پانی اس پر پھینک رہا تھا۔

"مت کرو تم دونوں' میرے اوپر پانی آرہا ہے۔" اپنا کڑھائی والا نیا کرتا خراب ہوتے دیکھ کر وہ غصے سے بولی۔

"ہم کھیل رہے ہیں۔"

"بہتر..... تم شاید بیس سال پہلے' اپنے بچپن میں چلے گئے ہو' مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں جا رہی ہوں۔" وہ کسی صورت پانی پھینکنے سے باز نہیں آرہا تھا' یہ دیکھتے ہوئے وہ اپنے جوگرز ہاتھ میں اٹھائے پتھروں سے نیچے اترنے لگی۔

وہ لوگ خاصی دیر تک آبشار پر بیٹھے رہے' یہاں تک کہ سورج ان کے سروں پر آگیا اور آبشار کا پانی سنہری دھوپ میں مزید چمکنے لگا۔ بہت سے ٹورسٹ آبشار سے جا رہے تھے' کچھ اب آرہے تھے' غرض آبشار پر ہر وقت رونق لگی رہتی تھی۔

دوپہر میں جب وہ وہاں سے روانہ ہوئے تو پریشے اتنی تھک چکی تھی کہ گاڑی میں بیٹھتے ہی سو گئی۔ اسے نیند سے نشاء نے تب اٹھایا جب ماہوڈھنڈ آگئی تھی۔

وہ گاڑی سے نکلی تو اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں' مگر سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی نیند تو غائب ہوئی ہی' ساتھ ہی سانس بھی ایک دم رک گیا تھا۔

سامنے تاحد نگاہ سبزہ پھیلا تھا' جیسے کوئی ہزاروں ایکڑوں پر پھیلا کوئی لان ہو' سبزے کے اختتام پر اشو کے دریا کا پانی ایک جگہ اکٹھا ہو جاتا تھا اور وہاں اس کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی' اس جھیل کی صورت اکٹھے ہوئے پانی کو ماہو ڈھنڈ جھیل کہتے تھے۔

جھیل کا پانی سبزی مائل نیلا تھا' اس کی سطح پر ڈوبتے سورج کی آخری' سنہری پروں والی پریاں رقص کر رہی تھیں۔ جھیل کے پیچھے بلند و بالا سبز پہاڑ تھے جنہوں نے پورے علاقے پر سایہ سا کر رکھا تھا۔ پہاڑوں کے ساتھ' ماہوڈھنڈ کے دائیں طرف دیار کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ وہ اس سبزہ زار میں واحد درخت تھے۔ بالکل ایسے جیسے کرسمس ٹریز ہوتے ہیں۔

ٹولیوں کی صورت میں ٹورسٹ دور دور تک گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ٹوپی والا پٹھان گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر پریشے کو بے اختیار مصری مال روڈ والا واقعہ یاد آیا۔ افق نے کیپ سیدھی کرتے ہوئے گھوڑے والے کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ "اللہ کا انگلش راجی کا؟" قریب آنے پر اس نے شلوار قمیص میں ملبوس چھوٹی چھوٹی داڑھی والے پٹھان سے پوچھا۔

"نہ..... انگلش نہ راجی کا۔ پختو راجی کا؟"

افق نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلادی۔

"تم پشتو بول رہے ہو؟" اس نے حیرت سے افق کو دیکھا۔

"ارے نہیں' یہ تو ایمبیسی والوں نے دو' چار لفظ لکھا دیے تھے۔ تم اس سے کہو کہ صبح اپنا گھوڑا لے آئے' میں اس پر سواری کروں گا۔"

پریشے نے یہ جاننے کے بعد کہ اس گھوڑے بان' جس کا نام امیر حسن تھا' کو اردو آتی ہے' اس تک افق کا پیغام پہنچا دیا' ورنہ پشاور اور اس سے آگے لوگوں کی اکثریت اردو سے نابلد تھی۔

"آج ہمارے ٹرپ کا آخری دن ہے' کل واپسی ہے' سو آج رات ہم کیمپ فائر کریں گے۔" گھاس پر ایک ساتھ بیٹھتے ہوئے' اپنے بیک پیکس کسی بوجھ کی طرح ایک طرف اتار پھینکتے ہوئے پریشے نے کہا۔

"اور میرے پاس منا پلی بھی ہے' وہ بھی کھیلیں گے۔ بس یہ ٹورسٹ یہاں سے چلے جائیں' پھر یہ پورا سبزہ زار ہمارا ہو گا۔ اور ہاں' افق بھائی' آپ نے پریشے آپی کو dare دینا تھا۔"

"اوہ۔ میں تو بھول بھی چکا تھا۔" وہ کہنیوں کے بل گھاس پر نیم دراز تھا' مفلر اس کے بیگ اور کیپ بینچ پر رکھی تھی۔ اس کی شرٹ سامنے سے ابھی تک گیلی تھی۔

"تو پھر کیا ہے آپ کا ڈیر؟" پریشے کے لاکھ گھورنے پر' (کہ اگر وہ بھول چکا تھا تو بھولا رہنے دو) بھی ارسہ کہہ اٹھی۔

"ایسا ہے پریشے جہاں زیب' آپ کل صبح ہمیں ماہو ڈھونڈ سے مچھلیاں پکڑ کر دیں گی' پکا میں خود لوں گا۔"

"اور ہم بھی کھائیں گے؟"

"ہاں' بالکل۔۔۔" وہ چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے شانے اچکا دیے۔

"پکڑ دوں گی' بنسیاں اور کنڈیاں ہیں؟"

"میرے پاس سب ہے' مادام!"

پھر جب شام کا مٹیالا اندھیرا پھیلنے لگا اور سورج کی کرنیں ماہو ڈھونڈ کے پانیوں سے روٹھ کر مغرب میں روپوش ہونے لگیں اور سیاحوں کی گہما گہمی ماند پڑنے لگی' ایسے میں وہ چاروں کھلے آسمان تلے گزارنے والی رات کی تیاری کرنے لگے۔ اپنے بیک پیکس سے کیمپنگ کا سامان نکالا' ہنستے بولتے' باتیں کرتے خیموں کے پولز اور جوائنٹس سیٹ کیے' ان پر شیٹ ڈالی' سلیپنگ بیگز بچھائے' اور خود خیموں کے ایک طرف کھلے آسمان تلے دائرہ بنا کر بیٹھ گئے' درمیان میں امیر حسن کے توسط سے منگوائی لکڑیوں سے آگ جلالی۔

"میں بینکر ہوں گی۔ بینکر کم پلیئر۔" ارسہ مونوپلی کا بورڈ اور کارڈز وغیرہ سیٹ کرتے ہوئے بولی۔ الاؤ کے ایک طرف وہ اور نشاء تھیں' دوسری طرف پریشے اور افق مونوپلی کا بورڈ درمیان میں ہی آگ کے قریب کسی طرح ایڈجسٹ کر ہی لیا تھا۔

مونوپلی جیسی گیم میں گھنٹے منٹوں کی طرح گزرتے ہیں' دو گھنٹے گزر گئے اور انہیں پتا ہی نہیں چلا۔

"یہ پکاڈلی کس کی ہے؟" پریشے کی گوٹ پیلے رنگ کی پکاڈلی پر آئی تھی' اس کے اپنے پاس صرف چار زمینیں تھیں۔ قسمت اتنی خراب کہ ہر باری پر وہ افق یا نشاء کی کسی زمین پر چڑھ جاتی' یا پھر سیدھی جیل جاتی۔

"میری ہے۔" نشاء نے مطلوبہ کرایہ بتایا۔ اس نے منہ بناتے ہوئے چند پاؤنڈز نکال کر اسے تھمائے۔ افق نے نظر اٹھا کر اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا' پھر دھیرے سے اپنے کارڈز میں سے آکسفورڈ اسٹریٹ کا گرین کارڈ نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑایا' پریشے نے چونک کر اسے دیکھا۔

"رکھ لو' ابھی نشاء اس پر آئے گی تو تم اس سے کرایہ لے لینا۔" اس نے سرگوشی میں کہا' پریشے نے چور نظروں سے الاؤ کے اس پار بیٹھی ارسہ اور نشاء کو دیکھا' وہ اس جانب نہیں دیکھ رہی تھیں۔ "شکریہ" اس نے جھٹ کارڈ رکھ لیا۔

نشاء کی گوٹ ریجنٹ اسٹریٹ پر آئی' ارسہ کی سے فیر پر' پھر نشاء کی کنگ کراس اسٹیشن پر' اور وہ تمام افق کی زمینیں تھیں' مگر وہ بڑے حق کے ساتھ کرایہ وصول کرتی رہی۔

"میرا خیال ہے یہاں کوئی بے ایمانی کر رہا ہے۔" آدھے گھنٹے بعد ارسہ کو تب احساس ہوا جب وہ واٹر ورکس پر آئی۔ اور پریشے نے کرایہ مانگا۔

"یہ واٹر ورکس اور الیکٹرک کمپنی تو افق بھائی آپ کی تھیں' مجھے اچھی طرح یاد ہے' میں بینکر ہوں!" پریشے نے قدرے بوکھلا کر افق کو دیکھا۔

"اوہو ارسہ! میری کہاں تھیں؟ میری تو صرف الیکٹرک کمپنی تھی۔"

"پری آپی! ذرا کارڈ نکال کر دکھائیں واٹر ورکس کا۔" اس کا انداز قطعی تھا' پریشے اب پھنس چکی تھی کہ کارڈ افق کے پاس تھا۔

"کیا کرتی ہو ارسہ! پری جھوٹ تھوڑی بول رہی ہے۔

میں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے اسے یہ زمین خریدتے دیکھا ہے۔"

"گناہ گاروں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ پری آپی! مجھے کارڈ دکھائیں۔" وہ بضد تھی۔

"ارسہ! تمہاری گردن پر کوئی کیڑا چل رہا ہے۔" افق نے فلمی اور تھرڈ کلاس سٹ کامزوالا حربہ آزمایا' جو ٹھیک نشانے پر بیٹھا' ارسہ اپنے کارڈز چھوڑ کر گردن جھاڑنے لگی۔

"کیڑا؟ کدھر ہے؟"

"ابھی تک تمہاری گردن پر بیٹھا ہے۔ کتنا خون پی چکا ہو گا اب تک تمہارا۔ ویسے تمہارا بلڈ گروپ کیا ہے؟" وہ بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہا تھا' صرف پریشے کو بچانے کے لیے۔ اس نے ممنونیت سے افق کو دیکھا' الاؤ کی زرد روشنی اس کے چہرے کے نقوش کو مزید تیکھا بنا رہی تھی۔

"اے پازیٹو... اور نہیں ہے کیڑا۔"

"اے پازیٹو؟ ہوں... میرا او نیگیٹو ہے۔" وہ یونہی بولا تو مجرموں کی طرح گردن جھکائے بیٹھی پریشے نے چونک کر سر اٹھایا۔ "سیف کا بھی او نیگیٹو ہے۔" اس نے بے اختیار زبان دانتوں تلے کر لی' نشاء نے بڑبڑا کر اسے دیکھا۔

"سیف کون؟" افق نے تجسس سے نہیں' محض ارسہ کی توجہ واٹرورکس والی بات سے ہٹانے کو پوچھا تھا۔ اور اب وہ پری کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی ڈائس ہاتھ میں لیے باری کرنے لگا تھا۔

مگر جواب تو پریشے کو دینا ہی تھا۔ نشاء نے خاموش نگاہوں سے التجا کی تھی کہ وہ چپ رہے' مگر اس کو ہر صورت افق کو وہ بتانا تھا جو بتانے کا اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔

"سیف میرا کزن ہے' پھپھو کا بیٹا' اور میرا...." وہ لمحے بھر کو رکی' افق کی ڈائس کی ڈبی کو رول کرتی انگلیاں تھمیں' اس نے گردن اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے پریشے کو دیکھا۔

"اور میرا منگیتر بھی.... تین ماہ بعد میری اس سے شادی ہے۔" بہت پراعتماد انداز میں اس نے کہہ ڈالا۔

وہ جو کچھ کہنے لگا تھا' یک دم رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت در آئی' پھر الجھن اور بالا آخر واضح بے یقینی۔

پل بھر کو ماہوڈھنڈ کے کنارے اس وسیع و عریض سبزہ زار میں سکوت سا چھا گیا۔ اونچے الاؤ سے چنگاریاں نکل کر فضا میں گم ہو رہی تھیں۔

"آپ... انگیجڈ ہیں؟" واٹرورکس کو بھول کر بے یقینی سے ارسہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں' تین سال سے۔" اس کے دل سے کوئی نادیدہ بوجھ ہٹ گیا تھا' مگر پھر افق کا زرد چہرہ دیکھ کر اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔

"اوہ اچھا۔" وہ سنبھل گیا تھا' اور پھر اپنی نگاہیں ہاتھ میں پکڑی ڈبیا پر مرکوز کیے جیسے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ پھیکی رنگت اور پھیکی مسکراہٹ۔

"مبارک ہو' تم نے.... تم نے کبھی بتایا نہیں.... تو.... تمہاری شادی ہو رہی ہے.... ہوں گڈ۔ تو کیا کرتا ہے وہ...؟" وہ رکا۔ "وہ... سیف؟" وہ اپنے لہجے میں کچھ ٹوٹنے کا کرب نہ چھپا سکا تھا۔

"بزنس!"

"آہاں! ویری نائس۔" افق نے ڈبیا رکھ دی۔ اسے شاید بھول چکا تھا کہ اس کی باری تھی۔

الاؤ کے اس پار نشاء سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ اداس تھی' پریشے سمجھ سکتی تھی۔ مگر اس کو ہر صورت میں کسی بھی قسم کی غلط فہمی' اگر تھی تو ختم کرنی تھی۔ لکڑیوں میں سے بار بار چٹخنے کی آواز آ رہی تھی۔

"چلیں' گیم دوبارہ شروع کریں۔" ارسہ کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔

"کل کھیل لیں گے' اب سوتے ہیں۔" نشاء نے افق کی مشکل آسان کر دی۔ وہ غالباً" وہاں سے ہٹنا چاہ رہا تھا' نشاء کے کہنے پر کارڈز رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ واٹرورکس کا کارڈ سامنے ہی تھا' مگر کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے گھاس پر رکھی اپنی "ہیل ٹو طیب اردگان" والی کیپ اٹھائی اور ان سے دور جھیل کی طرف چلا گیا۔

"صبح آبشار پر میں نے.... آئی ایم سوری پری آپی.... وہ میرے منہ سے یونہی' غلطی سے نکل گیا تھا' میں نے صرف مذاق کیا تھا' مجھے نہیں علم تھا کہ آپ انگیجڈ ہیں' ورنہ.... آئی ایم سو سوری!" تذبذب' اور شرمندگی اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔

"اٹس او کے ارسہ! میں نے برا نہیں مانا' تم یہ گیم سمیٹ لو۔"

"تھینکس" بے دلی سے گیم سمیٹ کر ارسہ اپنے خیمے کی طرف چلی گئی۔ پریشے نے گردن موڑ کر افق کو دیکھا۔ وہ جھیل کے کنارے' سر جھکائے' جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

صبح وہ کتنا خوش تھا' اور اب بھی اس کے ساتھ مل کر بے ایمانی کرتے ہوئے وہ کتنا فریش لگ رہا تھا' پھر ایک لفظ "منگیتر" سن کر یوں اس کے چہرے کی مسکراہٹ کیوں غائب ہو گئی تھی؟ پریشے نے گہری سانس لے کر گردن سیدھی کی' نشاء شاکی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ نظریں چراتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی۔ دور کشمیر سے آنے والی تیز' سرد ہوائیں ان کے خیمے کے کپڑے کو پھڑپھڑا رہی تھیں۔ وہ اپنے سلیپنگ بیگ میں چت لیٹی خیمے کی چھت کو گھور رہی تھی۔

"پری!" باہر سے کسی نے اسے پکارا تھا۔ وہ یک لخت اٹھ بیٹھی' پکارنے والا افق تھا۔ اس نے سلیپنگ بیگ کھولا' قریب پڑا ہیٹ اٹھا کر سر پر رکھا اور خیمے کی زپ کھول کر باہر نکل آئی۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوچا کچھ دیر اکٹھے واک کرتے ہیں۔"

وہ کچھ کہے بنا افق کے ساتھ گھاس پر چلنے لگی۔ وہ دونوں ایک ہی انداز میں سر جھکائے چل رہے تھے' پریشے نے ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے' جبکہ اس کے ہاتھ جیبوں میں تھے۔

"کیسا ہے وہ؟ تمہارا منگیتر؟" چلتے چلتے بغیر تمہید کے افق نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں عجیب بے بسی اور شکست خوردگی تھی۔ "اچھا ہے؟"

"سیف؟" اس نے پل بھر کو سوچا۔ "امیر ہے' ہینڈسم ہے' ویل مینرڈ ہے' مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔"

وہ چلتے چلتے جھیل کے کنارے تک پہنچ گئے تھے۔ رات کے اس پہر وہاں چھائی خاموشی کو دور پہاڑوں سے جنگلی جانوروں کے بولنے کی آواز چیر رہی تھی۔

"مگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں نے پوچھا تھا' وہ اچھا ہے؟" "یہ لفظ "اچھا" بہت عجیب ہوتا ہے افق! ایک ظالم جابر بادشاہ رعایا کے لیے جتنا برا ہوتا ہے' اپنی اولاد کے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے' پھر ہم اسے کیا کہیں؟ برا یا اچھا؟ یہ لفظ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے شاید میں تمہیں یہ نہ بتا سکوں کہ وہ اچھا ہے یا نہیں' البتہ پسند اور ناپسند کی بات اور ہوتی ہے۔"

وہ جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ پریشے بھی اس کے بائیں طرف' اس سے ذرا پیچھے گھاس پر گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر ان پر تھوڑی ٹکائے بیٹھ گئی۔ بے قابو' تیز ہوا اس کا ہیٹ اڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تم اسے پسند کرتی ہو؟" وہ سامنے' چاندنی میں نہائی جھیل کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ میری پھپھو کا بیٹا ہے' پاپا کو بہت پسند ہے' انہوں نے منگنی سے پہلے میری مرضی نہیں پوچھی تھی۔ پھپھو نے رشتہ مانگا' انہوں نے فوراً" ہاں کر دی۔ تم ہمارے ہاں کی "رشتوں کی بلیک میلنگ" کو نہیں جانتے۔ پاکستان کے رسوم و رواج ترکی سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں اگر رشتہ مانگنے پر کسی پھوپھی' چچا یا ماموں کو انکار کر دیا جائے تو وہ انا میں آ کر خون کے رشتے تک توڑ ڈالتے ہیں۔ پھپھو کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ پاپا کی اکلوتی بہن ہیں' پاپا کی واحد بلڈ ریلیٹو جو اس دنیا میں ہیں' میں اس وقت شاید انکار کر بھی دیتی' اگر مجھے سیف کا رشتہ آیا تھا تو وہ مالی طور پر اتنا مستحکم ہو چکا تھا کہ پاپا سے تعلق توڑ لینا مالی مدد کے لحاظ سے کوئی گھاٹے کا سودا نہ ہوتا۔ پھر وہ پاپا کو بہت پسند ہے۔ اور میں پاپا کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔"

وہ گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگی۔ وہاں ہر سو جگمگاتے تارے بکھرے تھے۔

جمادی الثانی کی آخری تاریخوں کا ہر پل گھٹتا چاند پوری جھیل کو چمکا رہا تھا۔

"تمہیں کبھی نہیں لگا کہ تمہاری زندگی میں کبھی نہ کبھی کوئی ایسا آئے گا' جو تم سے محبت کرتا ہو گا' جس کو دیکھ کر تمہیں یہ لگے گا کہ یہی ہے' جس کا ساتھ تمہیں عمر بھر کے لیے چاہیے؟"

پریشے نے مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی چوڑی پشت اور جھکے سر کو دیکھا۔

"بعض لوگ زندگی میں بہت دیر سے ملتے ہیں' افق ارسلان! اتنی دیر سے کہ ہم چاہیں بھی تو انہیں اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنا سکتے۔"

"تو جو لوگ زندگی میں بہت دیر سے ملتے ہیں' ان کو آپ اپنی ترجیحات میں کس مقام پر رکھتی ہیں' ڈاکٹر پریشے جہاں زیب؟"

پری نے چونک کر اسے دیکھا' گردن اس کی طرف موڑے' سختی سے لب بھینچے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ شکوہ کرتی

خفا آنکھیں 'طنزیہ لہجہ... وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"میرے نزدیک ہر فرد کی اہمیت...." تیز ہوا کا جھونکا اس کا ہیٹ اڑا کر لے گیا' وہ دانستہ بات روک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میرا ہیٹ!"

چند قدم دور جا کر اس نے گھاس پر پڑا ہیٹ اٹھایا۔ وہ بھی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

"چلو خیر۔ جانے دو' تم منگنی شدہ ہو تو کیا ہوا' ہمارے درمیان ایک اور تعلق تو ہے ہی نا!"

وہ چونکی۔ "وہ کیا؟" اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"ہم اچھے دوست تو ہیں نا۔" وہ ایکدم پھر سے پرانا افق ارسلان لگنے لگا تھا۔ وہی فریش ہنس مکھ' اور اپنا اپنا سا۔

"ہاں' وہ تو ہیں۔" وہ کھل کر مسکرا دی۔

"تو پھر تم اس اچھے دوست کے ساتھ راکا پوشی آ رہی ہو نا؟" وہ پھر سے پرانے موڈ میں آ گیا تھا۔ وہ دونوں ماہو ڈھنڈ کے چمکتے پانیوں کے کنارے ٹہلنے لگے۔

"یہ میرے لیے ناممکن ہے۔ مجھے پاپا کبھی اجازت نہیں دیں گے۔"

"وہ بہت کنزرویٹو ہیں کیا؟"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تو وہ بہت لبرل ہیں۔"

"اچھا... پھر؟"

"چار سال پہلے میں "اسپانتک" کی ایکسپیڈیشن پر گئی تھی۔ بنیادی طور پر ملٹری ایکسپیڈیشن تھی' پاکستان نیوی کی' میں ایکسپیڈیشن ڈاکٹر کے طور پر یوں ہی ساتھ فٹ ہو گئی تھی۔" وہ جیسے یاد کر کے ہنسی۔ "بہت منتیں کی تھیں نذیر صابر کی' انہوں نے ہی ایڈجسٹ کرایا تھا مجھے پاک بحریہ کے ساتھ۔ ہم نے بڑے کم وقت میں اسپانتک کو سر بھی کر لیا' مگر واپسی پر' چوٹی سے چند فٹ دور میں نیچے گر گئی۔ میرا بایاں کندھا بری طرح زخمی ہو گیا۔ اس کے بعد پاپا نے میری climbing (کوہ پیمائی) پر پابندی لگا دی۔ وہ میرا اسکردو سے آگے' قراقرم کا پہلا تجربہ تھا۔ میں اور کرنا چاہتی تھی' مگر پاپا اجازت نہیں دیتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ میں گر نہ پڑوں۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں گا تو تم کیوں گرو گی؟" بہت اپنائیت سے افق نے کہا' وہ ہنس دی۔

"یہ بات تم میرے پاپا کو نہیں سمجھا سکتے۔"

"کوشش تو کر سکتا ہوں۔"

"نن۔ نہیں۔ نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ گھبرا کر تیزی سے بولی' پھر فوراً اپنی کیفیت کو چھپا کر وضاحت کرنے والے انداز میں کہا۔ "وہ نہیں مانیں گے' اس قصے کو چھوڑ دو۔"

"اچھا۔ ٹھیک۔ اور اگر زیادہ پرسنل نہیں ہو رہا تو ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"تم نے کبھی بتایا نہیں۔ تم کہاں رہتی ہو مری میں؟"

"ہم نے شاید اپنے بارے میں ایک دوسرے کو کچھ بھی نہیں بتایا افق!" وہ مسکرا کر بولی۔

"شاید۔ مگر تم کہاں رہتی ہو؟"

یہ وہ سوال تھا جس کا وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ پرسوں شام وہ اپنی تمام کشتیاں جلا کر واپس جانا چاہتی تھی کہ جلی ہوئی کشتیوں پر سواری کر کے افق ارسلان اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

"میں اس ملک اور ان ہی پہاڑوں میں رہتی ہوں۔ قراقرم کے پہاڑ ہی میرا گھر ہیں۔" وہ سمجھ گیا کہ وہ بتانا نہیں چاہ رہی' سو مسکرا کر بولا۔

"ہاں' میں نے سن رکھا تھا کہ قراقرم کے پہاڑوں پر پریاں اترتی ہیں۔"

"اور تم نے اس روز یہ بات جینیک یقین سے بھی کہی تھی نا؟"

"میں اس بات سے بے خبر تھا کہ تم پیچھے بیٹھی ہو۔"

"مگر میں پری نہیں ہوں۔" اس نے اداسی سے ہاتھ میں پکڑے ہیٹ پر کھلے سرخ گلاب کو دیکھا۔

"تم پری ہو!"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "نام سے کوئی پری نہیں بن جاتا۔ میرا صرف نام پری ہے۔"

"جانتی ہو پری! جب میں نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا تو مجھے کیا لگا تھا؟ یوں جیسے قراقرم کے پربتوں سے رستہ بھول کر مارگلہ کی اس پہاڑی پر برستی بارش میں پناہ لینے والی کوئی معصوم سی' خوف زدہ سی پری ہو۔"

"میں نے عرصہ ہوا خوابوں کی دنیا میں رہنا چھوڑ دیا ہے۔ ٹوٹے خواب بہت اذیت دیتے ہیں' افق!"

وہ خاموش رہا' پھر چند ثانیے بعد آسمان کو دیکھ کر بولا۔

"رات بہت گہری ہو چکی ہے۔ ہمیں سونا چاہیے۔"

"تم جاؤ' میں ابھی جھیل کے کنارے بیٹھنا چاہتی ہوں۔" وہ اس سے دور جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھ گئی' جوتے اتار کر ایک طرف رکھے اور ماہو ڈھنڈ کے سیاہ نظر آنے والے پانی میں' جس پر چاندنی کی تہہ چڑھی تھی' پاؤں لٹکا دیے۔

وہ اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا' البتہ خیمے کی زپ کھولنے سے پہلے ایک لمحے کو اس نے گردن کو خم دے کر پیچھے ضرور دیکھا تھا' جہاں وہ پانی میں پاؤں لٹکائے' چاند کی میٹھی چاندنی کا کوئی خاموش گیت سن رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہفتہ 30 جولائی 2005ء

گھوڑے کی تیز دوڑتی ٹاپوں کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دور خیموں کے قریب سے گھوڑا دوڑاتا اس کی طرف رہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھی تھی جہاں رات کو افق نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ چاندنی واپس چلی گئی تھی' اندھیرا چھٹ چکا تھا۔ نیلی روشنی ہر سو پھیلنے لگی تھی۔ دور افق پر ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ جھیل کا پانی سبزی مائل لگ رہا تھا' ابھی تک سورج کی کرنوں نے اس پر اپنا رقص نہیں شروع کیا تھا۔

"تم ادھر کیا کر رہی ہو؟" گھوڑا اس کے قریب لے جا کر افق نے رفتار کم کر دی۔

"زندگی میں پہلی دفعہ ہارنے کی سزا پوری کر رہی ہوں' مگر یا تو ماہو ڈھنڈ کی مچھلیاں بہت ہوشیار ہیں' یا پھر میری قسمت ہی خراب ہے۔" اس نے ہاتھ میں فشنگ راڈ پکڑ رکھی تھی۔

"او خدایا۔ تم رات بھر یہی کرتی رہی ہو کیا؟" شہد رنگ آنکھوں میں حیرت در آئی۔ "سوئی نہیں ہو کیا؟"

"کسی دانشور نے کہا تھا' سونا وقت کا ضیاع ہے۔" وہ کیا کہتی کہ رات بھر نیند ہی نہیں آئی تھی۔

"بہت معذرت' مگر میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ آج کل ماہو ڈھنڈ میں مچھلیاں نہیں ہوتیں۔" گھوڑے کی لگام تھامے' آنکھوں میں شوخی لیے' وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ ابھی تک گھوڑے پر بیٹھا تھا۔

"کیا؟" وہ چلا کر کھڑی ہوئی' گود میں رکھا ہیٹ نیچے گھاس پر گر پڑا۔ "تم نے مجھے dare کیوں دیا؟"

"مجھے بھی اسی دانشور نے بتایا تھا کہ وقت ضائع کروانے کے اور بھی طریقے ہوتے ہیں۔" وہ ہنسا۔

"بہتر۔ اب تم نئی راڈ خریدنا۔" غصہ اتنا شدید چڑھا تھا کہ اس نے افق کی راڈ اٹھا کر جھیل کی طرف اچھال دی' راڈ نے ایک غوطہ کھایا اور پھر پانی میں ڈوب گئی۔

"میں یہ راڈ دریا سے ٹراؤٹ کا شکار کرنے کے لیے لایا تھا' مگر تم نے خود کو ٹراؤٹ کھانے سے محروم کر لیا ہے۔"

"میں ٹراؤٹ کھائے بغیر بھی ایک اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔" وہ ہیٹ سر پر رکھ کر آگے چل پڑی۔

"سنو' قراقرم کی پری!"

پریشے کے قدم زنجیر ہوئے تھے' اس نے پلٹ کر گھوڑے پر بیٹھے افق کو دیکھا۔ "تمہارا ایک یادگار تصویر کھنچوانے کا دل چاہ رہا ہے؟"

"نہیں!" وہ دو قدم مزید آگے چل دی۔

"مگر میرا چاہ رہا ہے۔" وہ جست لگا کر گھوڑے سے اترا اور بھاگ کر اس کی طرف آیا۔ پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کا ہیٹ اتار دیا۔

"کیا ہے؟" وہ ایڑیوں کے بل گھومی۔ افق نے اپنی کیپ اس کے سر پر رکھی۔ "تم یہ پہنو۔"

اپنی جیکٹ' گھڑی اور مفلر اس نے پریشے کو تھما دیے اور اس سے اس کی گھڑی لے لی۔

"تم کرنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی میں ہمارے آخری دن میں نے اور جینیک نے ایک دوسرے کی ٹوپیاں' جیکٹیں' ٹائیاں' گھڑیاں اور سن گلاسز پہن کر تصویر کھنچوائی تھی۔ بہت یادگار تھی وہ۔" اس نے افق کی چیزیں پہن کر اس کو اپنا ہیٹ پہنے دیکھا' اور بے اختیار ہنس دی۔

"ہم مضحکہ خیز لگ رہے ہیں' افق!"

"ہم نہیں' صرف تم!" مسکراتے ہوئے اسے چڑا کر اس نے دور کھڑے امیر حسن کو آواز دی۔ وہ پاس آیا تو اشاروں سے تصویر کھینچنا سکھا کر اپنا پولارائیڈ کیمرہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

تصویر کے لیے دونوں گھوڑے کے ساتھ کھڑے ہو گئے' افق نے ایک ہاتھ سے گھوڑے کی لگام تھام لی۔

"تصویر بن کر آئے تو اوپر لکھ دینا کہ گھوڑا میرے دائیں طرف ہے۔" پچھلی بات کا بدلہ اتار کر وہ خود ہی ہنس دی' اسی لمحے گھوڑے والے نے بٹن دبا دیا۔ فلیش چمکی اور چند ہی لمحوں بعد تصویر باہر نکل کر آ گئی۔

"ایک فوٹوگرافر کی حیثیت سے تمہارا مستقبل بہت

"اوکے' اب سنو۔" نشاء کہہ رہی تھی' "اس کے بھائی کے کسی دوست کا باپ تمہاری کسی انٹیلی جنس ایجنسی کا چیف ہے؟"

"ہاں ہے۔ پھر؟"

"تم اس سے کہو' اپنے صدر سے کہہ کر مجھے گورنمنٹ آف پاکستان کی طرف سے کوئی صدارتی ایوارڈ دلوا دے۔" وہ بچوں کے سے انداز میں ضد کر رہا تھا۔

اس کو ہنسی آ گئی۔ "تمہیں ہماری گورنمنٹ کی طرف سے ایوارڈ لینے کا شوق کیوں ہے؟"

"میں بیس سال بعد اپنے سفرنامے میں لکھنا چاہتا ہوں کہ جب میں اسلامی دنیا کے سب سے طاقت ور ملک میں گیا تو اس کے "بادشاہ" نے میری خوب آؤ بھگت کی وغیرہ وغیرہ۔ سمجھا کرو نا' شو آف!"

"خیر' حبیب کے دوست کا باپ ایک سرکاری ملازم ہی ہے' رچرڈ آرمینیج نہیں جو اس کی بات مان لی جائے گی۔"

افق ہنس پڑا۔ "کیا خوب بات کہی۔ عراق' امریکہ جنگ میں امریکہ ہماری منتیں کرتا رہا تھا مگر ترکی نے' اور طیب اردگان نے اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔" وہ دونوں گھاس پر چلتے ہوئے اردگان' مشرف اور افغان جنگ کی باتیں کرتے رہے۔ خیموں کے بجائے وہ جھیل کی طرف آ گئے تھے۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا' فجر کا وقت باقی تھا۔

"میں نے نماز نہیں پڑھی۔ تم ٹھہرو میں وضو کر لوں۔" وہ جھیل کے پانی کے قریب چلا گیا' اور گھاس پر پنجوں کے بل بیٹھ کر چلتے صاف پانی سے ہاتھ دھونے لگا۔

وہ اس کے ساتھ کھڑی مسکراتے ہوئے اسے وضو کرتے دیکھنے لگی۔ بازو کہنیوں تک دھو کر اس نے کیپ اتاری اور مسح کیا' پھر دونوں پاؤں کی جرابیں اتار کر انہیں پانی میں ڈبو کر دھونے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کی انگلیوں کی حرکت کو دیکھ رہی تھی' یک دم اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ جھٹکے سے دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"افق... یہ..." وہ بے یقینی سے اس کے بائیں پاؤں کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ کوہ پیماؤں کی زندگی ہے' مادام جہاں زیب۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔" وہ بہت اطمینان سے اپنا بایاں پاؤں دھو رہا تھا جس کی آخری دو انگلیاں نہیں تھیں۔

"مگر... کیسے... یہ کیسے ہوا؟" اس سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔

افق نے لاپروائی سے شانے اچکا دیے۔ "فراسٹ بائٹ۔" اب وہ جرابیں واپس پہن رہا تھا۔

"نماز قضا ہو گئی ہے شاید' مجھے جانے کیوں دھیان ہی نہیں رہا۔" وہ افسوس کرتا گھاس پر سے کیپ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کتنی دیر رکنا پڑے گا ادھر؟" پریشے نے قدرے جھنجلا کر پوچھا۔ یہ ماہوڈھنڈ سے واپسی کے دوران پہلی بات تھی جو اس نے کہی تھی' ورنہ وہ افق کی طرح بالکل خاموش آ رہی تھی' مگر اب جب لینڈ کروزر سڑک کے درمیان میں رک گئی تھی تو اسے پوچھنا ہی پڑا۔

"جب تک یہ پتھر راستے سے نہیں ہٹے گا' ہم آگے نہیں جا سکتے۔"

ابھی آدھا گھنٹہ پہلے' محض پانچ منٹ کی بوندا باندی ہوئی تھی جس سے سڑک کے بالکل بائیں طرف' پہاڑ سے چپکا ایک دیو قامت پتھر ذرا سا سرک کر دائیں طرف ہو گیا تھا۔ اور اس کے ذرا سے سرکنے پر گاڑیوں کی ایک لمبی قطار جو دوسری جانب سے آ رہی تھی' رک گئی تھی۔ وہ جگہ اتنی تنگ تھی کہ اگر پتھر کے سائیڈ سے گاڑی نکالنے کی کوشش کی جاتی تو وہ سیدھا کھائی میں بہتے اشو میں گرتی۔

یہ جگہ آبشار اور اشو ویلی کے درمیان میں تھی' ان کی گاڑی کے پیچھے آبشار سے پلٹنے والوں کی لمبی قطار تھی' اور دوسری جانب سے آبشار پر آنے والی گاڑیوں کا قافلہ تھا۔ لوگ گاڑیوں سے نکل کر اس وزنی پتھر کو دھکا لگانے لگے تھے' مگر وہ ہل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔

"اس کو امریکہ سمجھ کر دکا (دھکا) لگاؤ۔" ایک گاڑی کے پٹھان ڈرائیور نے جوش سے کہا تو ماحول کشت زعفران بن گیا۔ "آؤ نیچے دریا پر اترتے ہیں۔" وہ افق کے کہنے پر خاموشی سے اس کے پیچھے پہاڑ سے نیچے اترنے لگی۔

"اتنی دیر سے کیا سوچ رہی ہو؟" مسلسل خاموشی جس سے وہ جلدی ہی اکتا گیا تھا۔

"یہی کہ ہم کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ ان حسین وادیوں' اور مرغزاروں کو چھوڑتے ہوئے میں بہت اداسی محسوس کر رہی ہوں۔"

"تم حسین یادیں ساتھ لے کر جا رہی ہو۔"

"بچھڑنے کا دکھ حسین یادوں کو دل پر لگا گھاؤ بنا دیتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ناسور بن جاتا ہے اور ناسور کوئی مسیحا نہیں بھر سکتا' وقت بھی نہیں۔" وہ سر جھکائے' احتیاط سے پتھروں پر پاؤں رکھ رہی تھی۔ چلتے چلتے اس نے جوتے کی نوک سے ایک پتھر کو ہٹایا' نیچے بے تحاشا سیاہ موٹے موٹے کیڑے تھے' اس نے فوراً" پتھر واپس رکھ دیا۔ کیڑے دب گئے۔

"ہم بچھڑ نہیں رہے۔ ہم پھر ملیں گے۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے۔"

وہ چونکی' "کدھر؟"

"راکاپوشی بیس کیمپ میں۔ 8 تاریخ کو بیس کیمپ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"کم آن!" اس نے سر جھٹکا۔ ایک زخمی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ "میں دمانی نہیں آؤں گی۔"

"تم دمانی ضرور آؤ گی۔" وہ پر یقین تھا۔

ہنزہ کے باسی راکاپوشی کو پیار سے دمانی کہتے تھے۔

"تمہیں کیسے اتنا یقین ہے۔"

"ایسے کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"تم بے جا انتظار کرو گے۔ میں نہیں آؤں گی۔ چلو اوپر چلتے ہیں شاید امریکہ۔ میرا مطلب ہے پتھر اب تک سرک چکا ہو۔" وہ واپس اوپر چڑھنے لگی۔ دریا ان سے کئی فٹ نیچے نشیب میں بہہ رہا تھا۔

"ہم اچھے دوست بھی تو ہیں' پری؟"

(ہم اچھے دوست "بھی" تو ہیں؟ ہم اور کیا ہیں؟) وہ پوچھنا چاہتی تھی' اس کے جذبات کی شدت' ان کے تعلق کی نوعیت' مگر بولی تو بس یہ کہ "میری شادی ہے' اور مجھے اس کی تیاری کرنی ہے' میں نہیں آ سکوں گی' تمہیں بیس کیمپ سے سی آف کرنے بھی نہیں۔"

"مجھے بلاؤ گی اپنی شادی میں؟"

وہ ایک لمحے کو چپ سی ہو گئی۔ وہ ہنس پڑا۔ "مذاق کر رہا تھا' جانتا ہوں تم مجھے اپنی خوشیوں میں شریک نہیں کرو گی۔"

"خوشیوں میں؟" اس نے یاسیت سے سوچا۔ کتنا بڑا مذاق کیا تھا نا افق نے بچھڑتے لمحوں میں؟

"مگر اس نے کہا تھا' وہ بچھڑ نہیں رہے۔ اور اگلی شام' 31 جولائی کو پشاور ایئرپورٹ پر نشاء اور اسے سی آف کرتے ہوئے بھی اس نے یہی کہا تھا۔

"میں تم سے دوبارہ ملنے کا منتظر ہوں۔"

"میرا خیال ہے' میں تمہیں زندگی میں آخری دفعہ دیکھ رہی ہوں۔"

افق نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے کہا نا۔ ہم بچھڑ نہیں رہے۔ میں راکاپوشی بیس کیمپ میں ایک بہت اچھی کوہ پیما کا منتظر رہوں گا۔"

اپنے بیگز کی ٹرالی دھکیل کر ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھتے وقت پریشے نے ایک آخری اداس نظر اس پر ڈالی۔

"میں نہیں آؤں گی' افق! کوہ پیما کو اب پری کو بھلا دینا چاہیے۔"

"کوہ پیما اور پری کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ میں قراقرم کے تاج محل پر قراقرم کی پری کا انتظار کروں گا۔" وہ مسکرایا' شہد رنگ آنکھیں چھوٹی ہو گئیں' پھر اس کی مسکراہٹ دھندلا گئی' اس کے چہرے کا ہر نقش پریشے کی آنکھوں میں چھائی دھند میں دھندلا ہوتا چلا گیا۔ وہ تیزی سے مڑی اور بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی' اس سے پہلے کہ قدیم یونانی دیومالا کے اس کردار کا کوئی لفظ روایات میں جکڑ کر اس کے قدموں کو زنجیر کر دے۔

☼ ☼ ☼

منگل' 2 اگست 2005

وہ "میں کھانے کو دیکھ لوں" کہہ کر لاؤنج سے جانے ہی لگی تھی کہ بابا نے روک کر قدرے آہستگی سے کہا۔ "وحید سے کہو' بازار سے چپلی کباب بنوا لائے۔"

"جلیل کے؟" وہ بے خیالی سے بولی۔

"کیا؟" وہ سمجھ نہ پائے تھے۔

"نہیں نہیں۔ کچھ نہیں۔ میں وحید سے کہتی ہوں۔" وہ گڑبڑا کر سنبھلی۔ بھلا جلیل کہاں سے آ گیا درمیان میں؟

"کتنی کمزور ہو گئی ہو پری بیٹا۔ خوامخواہ اتنی دور چلی گئیں۔ بھلا کیا رکھا ہے ادھر؟" پھپھو پاپا کے سامنے پیار جتاتی اسے بہت مصنوعی لگ رہی تھیں۔ (ادھر کیا رکھا تھا؟ ادھر ہی تو سب کچھ رکھا تھا)۔

"بس یونہی۔" وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی اور کچن میں آگئی۔ پھپھو ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ اس نے کچن کے کیبنٹ کے شیشے میں اپنا عکس دیکھ کر سوچا، وہ واقعی بہت کمزور اور الجھی الجھی لگ رہی تھی۔ یہ اسے کیا ہو گیا تھا؟

"میں قراقرم کے تاج محل پر قراقرم کی پری کا انتظار کروں گا۔" وہ آواز جو کسی نغمہ ساز کی دھن سے زیادہ خوب صورت تھی، پچھلے تین دن سے اس کی سماعتوں میں گونج رہی تھی۔

وہ اس کا انتظار کرے گا اور اسے نہ پا کر واپس چلا جائے گا۔ قراقرم کی پری اور کوہ پیما کی کہانی کا یہی منطقی انجام تھا پھر وہ کس کے لیے اداس تھی؟ اس کے لیے جس نے ایک دفعہ بھی نہیں کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے، جس نے یہ تک نہیں بتایا تھا کہ اس کا گھر ترکی کے کس شہر میں ہے؟ پھر وہ اتنی جذباتی کیوں ہو رہی تھی؟

ان دو تین دنوں میں خوش گمانی کے سارے رنگ اس کی آنکھوں سے اتر چکے تھے۔ وہ بے شک اس سے محبت کرنے لگی تھی، مگر وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے، یہ اس نے کیسے اخذ کر لیا تھا۔ اب غیر جانب داری سے معاملے کو دیکھتی تو اسے لگتا کہ وہ یک طرفہ محبت کا شکار تھی۔

"پری، کیسی ہو؟" وہ سلاد کاٹ رہی تھی جب سیف بغیر کسی دستک کے اندر داخل ہوا اور عین اس کے پیچھے آ کر بولا۔ وہ چونک کر پلٹی۔ سیف کو اتنے قریب دیکھ کر ناگواری سے اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"آپ اندر جا کر بیٹھیں، میں کھانا لگانے ہی لگی ہوں۔" وہ واپس پلیٹ پر جھک گئی۔

"میں ادھر ٹھیک ہوں۔ تم نے فون ہی نہیں کیا وہاں سے؟"

"پاپا کو کرتی تھی روزانہ، یہ بہت تھا۔" اس کا انداز اتنا روکھا تھا کہ سیف چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"پھر بھی..... خیر گنوار قسم کے پہاڑی لوگوں میں جا کر رہنا کیسا تجربہ تھا؟"

اس نے زور سے چھری رکھی۔ "پہاڑی لوگ گنوار نہیں، مخلص اور بہادر ہوتے ہیں۔"

"مگر میں نے تو سنا ہے کہ حیات آباد کے دکان داروں سے زیادہ چرب زبان اور بے ایمان کوئی نہیں ہوتا۔"

"دکان دار تو سب ہی ایک جیسے ہوتے ہیں، چاہے حیات آباد کے ہوں یا اسلام آباد کے۔" وہ سلاد میں لیموں نچوڑنے لگی۔

"پریشے!" پاپا نے اسے آواز دی، وہ "جی" کہہ کر سیف کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے باہر آ گئی۔

"اپنے ماموں، ممانی کو بلا لاؤ۔" وہاں اس کی شادی کی تاریخ رکھی جا رہی تھی، اور ماموں ممانی کی موجودگی لازمی تھی۔

"ہاں ہاں، ان کو بھی ہونا چاہیے۔ آخر کو اکلوتی بھانجی ہے۔" پھوپھو نے فوراً خوش دلی سے کہا۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

"جاتی ہوں پاپا!" وہ دانستہ لاؤنج کے دروازے سے باہر گئی، نہ کہ کچن سے، کیونکہ وہاں سیف تھا۔

اسے سیف اور پھوپھو جتنے برے اور منافق آج لگ رہے تھے، اتنے پہلے کبھی نہیں لگے تھے۔ پہلے وہ ان کو پسند نہیں کرتی تھی، اب ناپسند کرنے لگی تھی۔ ان کے ساتھ اس کا رویہ اتنا پھیکا اور روکھا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، جتنا آج وہ اختیار کیے ہوئے تھی۔ پچھلے آٹھ دنوں نے اس کی زندگی بدل ڈالی تھی۔ ایک دفعہ انسان پہاڑوں پر چلا جائے، تو پھر زندگی کبھی پہلے جیسی نہیں رہتی۔

نشاء کے لان میں آج پھر وہ لڑکا..... حسیب کے ساتھ بیٹھا کاغذ پر کوئی لسٹ بنا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"السلام وعلیکم پری آپا۔"

"ڈونٹ کال می آپا۔" وہ ناک سکوڑ کر کہتی اندر چلی آئی۔ وہ اسے بہت برا لگتا تھا۔

ماموں اور ممانی لونگ روم میں ہی تھے، اس نے چہرے کے زاویے درست کر کے انہیں سلام کیا۔

"وہ آپ کو پاپا بلا رہے ہیں، دراصل پھوپھو آئی ہوئی ہیں تو پاپا نے کہا کہ آپ لوگ بھی آ جائیں۔"

"اچھا ڈیٹ فکس کرنے آئی ہوں گی۔ تم جاؤ پری، ہم آ رہے ہیں۔" ماموں نے کہا۔

"اور کھانا وغیرہ سب ٹھیک ہے نا، کوئی ہیلپ چاہیے تو بتاؤ، بنوا دوں تمہارے ساتھ کچھ؟" ممانی بالکل ماؤں والے انداز میں فکر مند ہو رہی تھیں، وہ مسکرا دی۔

"مامی، سب کچھ ریڈی ہے۔ بس آپ لوگ آ جائیں۔" وہ وہاں سے جا رہی تھی جب ممانی نے دھیرے سے ماموں سے کہا۔

"میرا بیٹا بڑا ہوتا تو میں کبھی پریشے کو ان ناقدروں میں نہ جانے دیتی۔"

"کبھی میں سوچتا ہوں کہ جہاں زیب سے ایک دفعہ تو پوچھوں کہ سیف میں اچھی شکل اور پیسے کے علاوہ اسے کیا نظر آیا ہے جو اس نے....." اس سے آگے وہ سن نہ سکی کہ باہر آ گئی تھی۔

وہ دونوں لان میں بیٹھے تھے، اس کو دیکھ کر بولتے بولتے رک گئے۔

"ویسے نام کیا ہے تمہارا؟" وہ ان کے قریب سے گزر کر جانے ہی لگی تھی، مگر کسی خیال کے تحت رک کر پوچھ لیا۔ وہ اس کا نام ہمیشہ بھول جایا کرتی تھی۔

"مصعب..... مصعب عمر....." وہ کھڑا ہو گیا۔

"تم وہی ہو نا، تمہارے ابا شاید کور کمانڈر تھے، اور پچھلے سال شاید ان کو ایک ایجنسی کا اعلا عہدہ دے دیا گیا ہے، ہے نا؟"

"بالکل! پنڈی کو ان جیسا ہینڈسم کور کمانڈر آج تک نہیں ملا۔" وہ اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

"میں نے سنا ہے ان کو آگے بھی "بہت زیادہ" ترقی ملنے کے چانسز ہیں، اور یہ کہ وہ صدر کے خاص دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔" وہ بڑے اکھڑے اکھڑے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"میں نے کبھی ان سے پوچھا نہیں۔"

"کم آن۔ اتنا تو مجھے بھی پتا ہے کہ پنڈی کا کور کمانڈر آرمی چیف کا فیورٹ ہوتا ہے۔"

"فیورٹ کی بات نہیں ہے، بعض لوگوں میں اتنی خوبیاں ہوتی ہیں کہ آپ کے لیے انہیں نظر انداز کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور مجھے زیادہ نہیں پتا ہوتا۔ یو سی، میں ادھر نہیں گھوڑا گلی میں ہوتا ہے!" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

پریشے نے کھڑے کھڑے اسے گھور کر دیکھا۔ "ویسے باجیوں کی عمر کی لڑکیوں کو دیکھ کر سیٹی بجانا بھی لارنس کالج میں سکھایا جاتا ہے؟"

"وہ پریشے آپی، میں....."

"جسٹ ڈونٹ کال می آپی۔" وہ کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

بدھ، 30 اگست 2005ء

"میں گھنٹے تک تمہیں پک کر لوں گا، ڈنر ساتھ کریں گے۔" سیف کا اس کے موبائل پر فون آیا تھا۔

"کدھر؟"

"کسی ریسٹورنٹ میں یار!"

"نمبر ایک میں کوئی "یار" نہیں ہوں۔ دوسری بات، میں ابھی بہت بزی ہوں، سوری۔" اس کا انداز کھردرا سا تھا۔

"تم اپنی مصروفیت ملتوی کر دو اور....."

"سیف، میری کال آ رہی ہے، میں بعد میں بات کرتی ہوں۔" اس نے موبائل آف کر دیا۔

اسے یاد آیا، افق نے گہری رات میں اسے جھیل کے کنارے واک کرنے کا کہا تھا تو وہ فوراً ساتھ چل پڑی تھی، مگر سیف پر اسے ذرہ بھر بھی اعتبار نہ تھا۔

"کیا وہ شخص اس کی قسمت میں نہیں ہو سکتا تھا؟ اگر ایسا تھا تو وہ دونوں برستی بارش میں مارگلہ کی پہاڑیوں پر ایک دوسرے سے کیوں ٹکرائے تھے؟" وہ ہمیشہ یہ بات سوچتی تھی۔

☼ ☼ ☼

چائے کا مگ اس نے ٹرے میں رکھا اور پاپا کے کمرے کے قریب آ کر دروازے پر دستک دی۔

"آؤ پریشے۔" وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کوئی بزنس میگزین دیکھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر رکھ دیا۔

"کیا پڑھ رہے تھے آپ؟" ان کو چائے کا مگ تھما کر وہ بیڈ کی پائنتی پر ٹک گئی۔

"شوکت عزیز کی بتائی گئی گروتھ ریٹ میں اضافے کی فگرز کا رئیل فگرز سے موازنہ کر رہا تھا، یہ آدمی اسٹاک مارکیٹ اسکینڈل کا حصہ رہا ہے، یہ تو اس ملک کی اکانومی تباہ کر دے گا، اور اوپر سے اتنا جھوٹ....." وہ کہتے کہتے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر رک گئے۔ "تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"پاپا..... وہ..... اگر آپ اجازت دیں تو وہ البرتو ہے نا..... میں نے آپ کو بتایا تھا نا، البرتو کی گیارہ افراد کی ایکسپیڈیشن ٹیم راکاپوشی Summit کرنے جا رہی ہے۔ ایک ترک برٹش ایکسپیڈیشن اور بھی ہے۔ بائیس دن کی کوہ پیمائی ہو گی اور....."

"تم ان کے ساتھ آٹھ ہزار میٹر بلند پہاڑ پر جانا چاہتی

ہو؟" ان کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔
"آٹھ ہزار کہاں، راکاپوشی تو بس سات ہزار اور چند میٹر بلند ہے۔" (اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ چند میٹر 788 میٹر تھا۔" اور اس کی Climb تو خاصی مختصر ہے۔" (اس نے دعا کی کہ ان کو علم نہ ہو کہ راکاپوشی کا شمار مغربی Ridge دنیا کا طویل ترین رج ہے) "اور موسم تو ادھر بالکل بھی خراب نہیں ہوتا۔" (اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ البرتو اپنی ٹیم کے ساتھ کئی دن سے راکاپوشی بیس کیمپ میں موسم ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔) "میں چلی جاؤں پاپا؟"
"تم جانتی ہو، میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا۔" ان کا لہجہ قطعی تھا۔ "جی!" وہ مایوس ہو کر وہاں سے چلی آئی۔
باہر برآمدے میں آ کر وہ ستون سے ٹیک لگا کر سیاہ آسمان کو دیکھنے لگی۔ تاریکی کے پردے کی اوٹ سے کمان سا باریک چاند جھانک رہا تھا۔ پریشے نے اداسی سے چاند کو دیکھا، یہ چاند ہنزہ کے آسمان پر بھی روشن ہوگا، نگر کے دریا کے پانی پر بھی چاندی کی پریوں نے رقص کیا ہوگا، ہوسکتا ہے اس وقت افق ارسلان بھی اسے ہی دیکھ رہا ہو، اس کے روشن وجود میں کسی اور کو تلاش کر رہا ہو۔
"میں قراقرم کے تاج محل پر قراقرم کی پری کا انتظار کروں گا۔" یونانی دیومالا کا وہ کردار قراقرم کے تاج محل پر اس کا انتظار کر رہا تھا، مگر وہ وہاں نہیں جاسکتی تھی۔ پری کے پر کاٹ دیے گئے تھے۔
پھر پتا نہیں اس کے دل میں کیا سمائی، وہ اپنے کمرے میں آئی اور دیوار پر لگے پوسٹرز اتارنے لگی۔ ان کو اتار کر وہ کچن میں آگئی اور چولہا جلایا۔
مایہ ناز کوہ پیما، اور دنیا کے بلند پہاڑ اس نے آگ میں ڈالنے شروع کر دیے 'ایورسٹ'، کے ٹو، براڈ پیک، گیشر برم ٹو، Nuptse Annapurna II کی دیوار، سب اس کے چولہے میں جل رہے تھے، زندگی میں ایک مقام ایسا آجاتا ہے جہاں انسان کو اپنے تمام خوابوں سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔
"پری!" اس نے چونک کر بھیگے چہرے کے ساتھ پیچھے دیکھا، پاپا دروازے میں حیران سے کھڑے تھے۔ اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے۔
"یہ کیا کر رہی ہو؟" انہوں نے آگے بڑھ کر چولہا بند کیا اور اس کے ہاتھ میں موجود آخری پوسٹر تھاما۔ تو مار ہیو مرنا نگاریت کے سامنے کھڑا تھا۔
"انہیں کیوں جلا رہی ہو؟ یہ تو تم نے بہت شوق سے خریدے تھے۔"
"بس پاپا، اس شوق کا کیا فائدہ جو صرف خوابوں تک محدود رہے۔" زبردستی مسکرانے کی کوشش میں اس کی آنکھیں مزید بھیگتی چلی گئیں۔ کتنی ہی دیر وہ اس کو دیکھتے رہے، وہ ان کی اتنی پیاری اور فرماں بردار بیٹی یوں رو رہی تھی، وہ بھی ایک چھوٹی سی خواہش کے پیچھے؟
"تم جاسکتی ہو، پری!"
"جی، میں سونے جا ہی رہی تھی۔" وہ سر جھکا کر ان کے سامنے سے ہٹنے ہی لگی تھی کہ وہ بولے۔
"تم راکاپوشی جاسکتی ہو۔"
وہ جاتے جاتے تیزی سے ایڑیوں کے بل گھومی، اسے لگا اس نے کچھ غلط سنا ہے۔ "آپ نے کیا کہا پاپا؟"
"تم راکاپوشی Climb (کوہ پیمائی) کے لیے جاسکتی ہو مگر صرف 22 دن کے لیے، سمجھیں؟" وہ ہلکے سے مسکرائے۔
وہ ہکا بکا سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ "میں...... میں جاسکتی ہوں؟"
"ہاں۔ مجھے آج اندازہ ہوا ہے کہ اگر میں نے اپنی بیٹی کو اس کا سب سے بڑا خواب نہ دیا تو یہ اس کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوگا۔" انہوں نے ہولے سے اس کا سر تھپکا۔ "مگر تم جاؤ گی کیسے؟ سیف کو کہوں، تمہارے ساتھ چلا جائے؟"
"نہیں، سیف نہیں، پاپا!" اس سے تو بہتر تھا وہ نہ ہی جاتی۔ "نشاء اور حسیب ساتھ ہوں گے نا، حسیب کے فرینڈز کا گروپ ویسے بھی پرسوں ہنزہ جا رہا ہے، راکاپوشی بیس کیمپ کا ٹریک کرنے، میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پاپا اتنی جلدی اجازت دے دیں گے۔
"تم نے تو پوری پلاننگ کر رکھی ہے۔" انہوں نے مشکوک انداز میں اسے گھورا تو وہ ہنس دی۔
اچھا، مجھے بتاؤ۔ کتنے پیسے چاہیے ہوں گے، تمہاری ٹور کمپنی نے تو گیارہ ہزار لیے تھے نا؟" انہوں نے والٹ جیب سے نکالا۔
"راکاپوشی کے لیے پاپا، سات، آٹھ......" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔
"بس آٹھ ہزار؟" وہ ہزار ہزار کے نوٹ گننے لگے۔

"آٹھ لاکھ پاپا۔" اس نے تھوک نگل کر کہا، پہلے ہمیشہ وہ اسپانسرز اور فنڈڈ ایکسپیڈیشن کے ساتھ جاتی تھی، اب دو دن میں وہ فنڈز ریز کرنے سے یا اسپانسرشپ حاصل کرنے سے تو رہی!
"پری، آر یو سیریس؟" وہ حیران ہوئے تھے، ان کا نہ دل تنگ تھا، نہ ہاتھ، مگر انہیں حیرانی ہوئی تھی۔
"بس پاپا، تھوڑا مہنگا شوق ہے نا۔" وہ جھینپ کر ہنس دی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب اتنا آسان ہوگا، اگر ہوتا تو وہ تو کافی عرصہ پہلے ہی پوسٹرز جلانا شروع ہو جاتی۔ اسے تو مازہو مر کا وہ پوسٹر پہلے کبھی اتنا اچھا نہیں لگا تھا جتنا آج لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

8 اگست 2005

"کدھر پھنسا دیا ہے آپ نے پریشے آپا؟ میں تو پتا نہیں کتنا رومانٹک سفر سوچ کر آیا تھا کہ ہنزہ پہنچ کر چار پانچ پورٹرز لیں گے، سامان گدھوں پر، اور پھر آئے گا جگلت کے دریا کے کنارے سفر کرنے کے بعد تغافری کا بیس کیمپ خوب صورت دریا، گھنا جنگل، سبزہ ہی سبزہ، وہ جیسے عماد نے بتایا تھا، مگر اللہ بھلا کرے آپ کا، آپ ہمیں رومانٹک قسم کے راکاپوشی کے ویسٹ فیس کے بجائے کدھر برف زاروں میں لے آئی ہیں؟ اتنی برف اور اتنے کریوس ہیں ادھر۔ یہاں تو گدھے بھی نہیں آتے ہم تو پھر انسان ہیں۔"
"خیر تمہارے انسان ہونے پر مجھے شک ہے، حسیب!" شاہراہ قراقرم سے راکاپوشی کے شمال مغربی رخ کا فاصلہ دو دن کی پیدل مسافت پر تھا اور پچھلے دو دن میں حسیب یہ بات کوئی چھ سو دفعہ کہہ چکا تھا، سو بے حد تنگ آ کر نشاء نے کہا۔
"یہ اتنا خطرناک علاقہ ہے، اس ایکسپیڈیشن ٹیم کی مت ماری گئی ہے، جو راکاپوشی نارتھ ویسٹ سپر سے سر کرنا چاہتی ہے؟ اس راستے سے کوئی بھی چوٹی تک نہیں پہنچ سکا۔"
"وہ سب ایک گلیشل وادی میں آگے پیچھے ایک قطار میں چل رہے تھے، پریشے، نشاء اور حسیب سے پیچھے اس کے دوست اور ان سے پیچھے اٹھائیس پورٹرز تھے، جو انہوں نے ہنزہ سے ہی لیے تھے۔
"حسیب! تمہیں تکلیف کیا ہے؟ تمہارا "بوجھ" تو پورٹرز نے اٹھایا ہوا ہے۔" حسیب کی مسلسل چلتی زبان پر پریشے غصے سے بولی، دو دن پورٹرز کے ساتھ رہ کر وہ بھی سامان اور کندھے پر اٹھائے رک سیک کو "بوجھ" بولنے لگی تھی۔
پورٹرز پاکستان میں وہی کام کرتے ہیں جو نیپال میں sherpas کرتے ہیں۔ سیزن میں جب سیاحوں کی آمد و رفت عروج پر ہوتی ہے یہ پورٹر ان کا سامان اٹھاتے ہیں، اور ان کو ان کی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔ نشاء نے اتنے سارے پورٹرز لینے پر دو دن پہلے پریشے سے حیرت سے کہا تھا۔
"ان پر اتنے پیسے خرچ کرنے کے بجائے ہم ان کے بغیر چلے جاتے ہیں...... کیا فرق پڑے گا؟"
"فرق تو کوئی نہیں پڑے گا، بس ہم دو دن تو کیا، دو مہینوں میں بھی راکاپوشی نہیں پہنچ سکیں گے۔"
پچھلے دو دن سے وہ پیدل ان برفیلی وادیوں میں سفر کر رہے تھے۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں آپ فاصلے کو کلومیٹر، میٹر یا میل سے نہیں، دنوں، ہفتوں اور مہینوں سے ناپتے ہیں۔
پریشے نے دو دن پہلے جب پیدل سفر شروع کیا تھا تو اسے اسلام آباد، کراچی، ٹیک ڈسٹرکٹ، سب بھول گیا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ سینکڑوں سال پہلے وقت میں پیچھے چلے گئے ہوں، جب انسان پیدل پتھروں اور برف پر سفر کرتا تھا۔
"ویسے مجھے لگتا ہے ہم سا پاگل کوئی نہیں ہوگا، جو گھروں کا سکون چھوڑ کر پہاڑوں میں ٹریکنگ پر نکل جاتے ہیں، اور آپا جیسا پاگل تو کوئی نہیں ہوگا، جو پہاڑوں کو سر کرنا چاہتی ہیں۔"
"اب کتنا فاصلہ رہ گیا ہے؟" وہ حسیب کے مذاق کو نظر انداز کر کے عقب میں اس تنگ راستے پر چلتے پورٹرز کے سردار سے پوچھنے لگی۔
"بس میڈم، آدھا گھنٹہ اور!" پورٹرز کے سردار نے پورٹرز کے دستور کے مطابق بوجھ نہیں اٹھا رکھا تھا۔
"پچھلے 12 گھنٹوں سے یہ بلڈی چیپ "آدھا گھنٹہ اور" کہہ رہا ہے۔" عقب میں کوئی انگریزی میں بڑبڑایا، پریشے نے گردن پھیر کر دیکھا۔ حسیب کا وہی دوست ایک برفانی نالے کے کنارے پر چلتا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ وہ کوئی سخت بات کہنا چاہتی تھی، مگر سامنے سے آتے انسان دیکھ

کران کی طرف متوجہ ہوگئی۔

وہاں گلیشئر پر ان کے سامنے سے ایک ٹیم آرہی تھی، پریشے اپنی ٹریکنگ اسٹک کی مدد سے چلتی تیز قدمی سے ان تک جا پہنچی۔ یوں لگتا تھا جیسے سالوں بعد ان تنہا سنسان وادیوں میں کسی انسان کو دیکھا ہو۔

"السلام علیکم۔ پاکستانی؟" ان کے چہروں سے ظاہر تھا، پھر بھی قریب پہنچنے پر اس نے پوچھ لیا۔ وہ پانچ تھے' ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا' ان سے کئی گز پیچھے ان کے پورٹرز کی فوج آرہی تھی۔

"جی میڈم۔ پاکستانی الحمدللہ!" وہ خاصا تھکا ہوا لگ رہا تھا' پھر بھی بہت رعب مگر شائستگی سے بولا۔ وہ اس کی کٹنگ سے ہی پہچان گئی تھی کہ فوجی تھا۔ باقی بھی آرمی کے ہی تھے' وہ چاروں خاصے تھکے تھکے لگ رہے تھے' البتہ پانچواں بہت فریش اور ریلیکسڈ تھا' اس کی کیپ' گلاسز اور مفلر کی وجہ سے وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے دیکھ نہیں سکی تھی۔

"بیس کیمپ سے آرہے ہیں آپ؟ وہاں موسم کیسا ہے؟"

"موسم؟" تازہ دم پانچویں ساتھی نے ہنس کر سر جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔

لیڈر جس کا نام میجر اطہر تھا' کہنے لگا۔

"موسم کی مت پوچھیں' مس! ہم پاکستان آرمی کی ملٹری ایکسپیڈیشن کر رہے تھے' سات دن راکاپوشی کے اوپر پانچ ہزار میٹر کی بلندی پر خیموں میں قید ہو کر موسم کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے رہے' آٹھویں دن ہار مان کر نیچے اتر آئے۔ جس دن بیس کیمپ پہنچے' موسم بالکل ٹھیک ہوگیا۔" اس کی بات پر پریشے ہنس پڑی۔

"اب کون کون ہے بیس کیمپ میں؟" اس نے میجر اطہر سے پوچھا۔

"البرتو کی ٹیم ہے مگر وہ بھی ہمت ہار کر جانے لگے ہیں' اس کے علاوہ دو پاگل اور بھی موجود ہیں۔"

"افق ارسلان کی ٹیم؟" اس کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے ایک نظر میجر اطہر کی پشت پر سیاہ قراقرم کے پہاڑوں کی اوٹ سے جھانکتے "بگ وائٹ ماؤنٹین" راکاپوشی پر ڈالی۔" وہ قریب ہی تھا۔

"جی وہی' یہ میجر عاصم' جو ابھی آگے گیا ہے' افق ارسلان کا دوست بھی ہے اور لیزان آفیسر بھی۔ ارسلان کو کچھ چاہیے تھا' اس کے لیے ہی ہنزہ جا رہا ہے۔" پریشے نے پلٹ کر دیکھا' میجر عاصم خاصا دور جا چکا تھا۔

وہ پاک آرمی کی ملٹری ایکسپیڈیشن ٹیم کو خدا حافظ کہہ کر اپنی ٹیم کے ساتھ چلنے لگی۔ نگر اور ہنزہ کے دریاؤں کو کافی پیچھے چھوڑ آئے تھے' ہنزہ کے دریا کے پانی سے اس نے سونے کے ذرات ڈھونڈنے کی کوشش کی' مگر اسے ناکامی ہوئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ سکندر اعظم کی فوج کی نسل جس وادی میں آباد ہے (ہنزہ کی وادی) وہاں کے دریائے ہنزہ سے سونا نکلتا ہے۔

"اف کتنا لمبا راستہ ہے نا! حکومت کو چاہیے' راکاپوشی تک سڑک بنا دے' بندہ آرام سے پہنچ تو جائے۔" حسیب کا دوست جس کا نام وہ پھر بھول چکی تھی کہہ رہا تھا۔

"ہاں تاکہ مری کی طرح ہر بندہ منہ اٹھائے ادھر چلا آئے؟ نہیں بیٹا' راکاپوشی کا حسن خراج مانگتا ہے' اس کو ایک نظر دیکھنے کے لیے پیدل میلوں کی مسافتیں طے کرنی پڑتی ہیں۔"

"ثابت ہوا کہ بندہ "پربتوں کی دیوی" راکاپوشی کو دیکھ کر عقل مند ہو جاتا ہے' مثلاً "حسیب" جس نے زندگی بھر کوئی عقل مندی کی بات نہیں کی' مگر بیس کیمپ پہنچتے ہی۔۔۔"

وہ آگے سن نہ سکی' کیونکہ بیس کیمپ کے قریب پہنچ کر اس نے اپنا رک سیک برف پر پھینکا' اور اپنی ٹیم سے آگے بھاگ پڑی۔

اس کے سامنے پربتوں کی دیوی اپنے تمام تر حسن کے ساتھ کھڑی تھی' مگر اسے اس کی تلاش تھی' جس کے لیے وہ یہاں آئی تھی۔

برف سے ڈھکے راکاپوشی کے قدموں میں پتھروں کے "Moraine" پر ایک عمودی بالکونی کی صورت بیس کیمپ تھا۔ ہر طرف نیلے' پیلے اور سرخ خیمے لگے تھے۔ بیس کیمپ سے 100 میٹر نیچے ایک دیو قامت بے ترتیب گلیشئر تھا۔ یہ تمام "برو" کا گلیشئر تھا اور برف گلیشئر پر افق ارسلان اور البرتو کی ٹیم نے بیس کیمپ ٹھیک اس جگہ لگایا تھا' جہاں 1979 میں ایک پوشی پاکستانی ٹیم نے نصب کیا تھا' جس پر اگلے دن ہی راکاپوشی سے برف کی ایک دیوار ٹوٹ کر گری تھی' اور ایولانچ سے پیدا ہونے والی ہواؤں سے ہی تمام خیموں کی میخیں اکھڑ گئی تھیں' مگر پریشے کو برو کے خطرناک گلیشئر پر اپنے

ہلکے' واٹر پروف ٹریکنگ بوٹس کی مدد سے بھاگتی ہوئی خیموں کی طرف آئی۔ وہاں درجنوں خیمے نصب تھے۔

"افق ارسلان کہاں ہے؟" دھڑکتے دل سے اس نے سامنے سے آتے اطالوی لڑکے سے پوچھا۔

"ان دی میس ٹینٹ۔ دی لاسٹ ون!" وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتا کر عجلت میں آگے نکل گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی آخری نیلے خیمے کے قریب آئی' باہر رک کر تنفس درست کیا۔ سر پر سے اونی ٹوپی اتار کر پونی ٹھیک سے باندھی' پھر ٹوپی پہنی' سن گلاسز اتار کر اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے' اور خود کو نارمل کرلینے اور اندرونی خوشی کو چھپاتے ہوئے خیمے کی کھلی زپ سے اندر جھانکا۔

وہ میس ٹینٹ کے اندر کرسی پر بیٹھا تھا' اس کی پشت پریشے کی جانب تھی' دمانی سے آنے والی سرد ہوا کے تھپیڑوں کے باعث خیمے کا کپڑا پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ اندر آگئی۔

"کیسے ہو' افق؟" اس کے عقب میں' بازو سے پر باندھے' اس نے مسکرا کر پوچھا۔ اس نے چونک کر گردن گھمائی اور اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایم فائن۔" اس کی توقع کے برعکس وہ حیران نہیں ہوا تھا' اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ کسی گہری سوچ سے چونکا تھا' اور پھر دوبارہ اس میں کھو گیا تھا۔

وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کیسا ہے' اس نے اتنے دن کیسے گزارے' اس کا انتظار کیا یا نہیں' اور اسے اس کا سرپرائز کیسا لگا؟ مگر کچھ بھی پوچھنے سے پہلے' اس کی نظر افق کے ہاتھ میں موجود ایک چھوٹی سی پاسپورٹ سائز تصویر پر پڑی۔

"یہ کیا ہے؟" پچھلے دو دن سے اس نے اپنی اور افق کی جو گفتگو تصور کی تھی' وہ بالکل بھی ویسی نہیں تھی' وہ جو بہت سی باتیں بتانا اور پوچھنا چاہتی تھی' اب اچنبھے سے اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ؟" افق نے گردن جھکا کر تصویر کو دیکھا' ہولے سے مسکرایا اور تصویر اس کی جانب بڑھا دی۔ "یہ حنا دے ہے۔"

"کون حنا دے؟" اس نے تصویر کے لیے ہاتھ بڑھایا' جس میں ایک سنہری بالوں اور خوب صورت آنکھوں والی لڑکی مسکرا رہی تھی۔

"حنا دے۔۔۔ میری بیوی۔"

تصویر تھامنے کو بڑھا پریشے کا ہاتھ نیچے گر گیا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"بیوی؟"

ہمالیہ اور قراقرم کے سارے پہاڑ اس کے سر پر گرے تھے۔

دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ

نمرہ احمد

یہ کہانی ڈاکٹر پریشے جہانزیب کی ہے، جو خوابوں کے حقیقت بننے پر یقین رکھتی ہے۔ وہ طبیعتاً "مشکل پسند ہے اور ہر چیز میں خوب صورتی تلاشتی ہے۔ پریشے' والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ پریشے کو یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن کوئی شہزادہ اس کے خوابوں کو تعبیر کا روپ دے گا۔ اسے جھٹکا اس وقت لگتا ہے جب اس کے والد اس کی منگنی پھوپی زاد سیف سے کر دیتے ہیں۔ سیف اور پھوپھو کی فیملی کی طبیعت حاکمانہ ہے' مگر والد کے فیصلے پر پریشے سر جھکا دیتی ہے۔ ماموں زاد کزن نشاء سے اس کی گاڑی چھنتی ہے۔ ماموں کی پوری فیملی بھی پریشے کے رشتے پر ناخوش ہیں۔ پھوپھو کو ہر وقت پریشے کا رشتہ ہاتھ سے نکل جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس لیے وہ جلد شادی پر زور دیتی ہیں۔ شادی دو مہینے بعد طے پاتی ہے۔ کچھ دن آزاد زندگی گزارنے کے لیے وہ' نشاء کے ساتھ نادرن ایریاز جانے کا پلان بنا لیتی ہے۔ جس پر سیف ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔

مکمل ناول

مال روڈ پر پریشے اور نشاء کی ملاقات ایک ترک انجینئر افق ارسلان سے ہوتی ہے، جو راکاپوشی پہاڑی سر کرنے پاکستان آیا ہے۔ اس کی ساحرانہ اور پراسرار شخصیت پہ پریشے ٹھٹک سی جاتی ہے۔ بظاہر وہ بسردمہری کا مظاہرہ کرتی ہے' بعد میں پتا چلتا ہے کہ افق بھی پریشے اور نشاء کے ساتھ ہی ٹور کمپنی کے تحت نادرن ایریا جا رہا ہے۔ ٹور کے دوران ان کی ملاقات ایک لڑکی ارسہ سے ہوتی ہے جو ادیبہ بھی ہے۔ پریشے اور افق ارسلان کی نوک جھونک غیر محسوس انداز میں دونوں کو ان کہے خوب صورت جذبے میں جکڑ دیتی ہے۔ افق کا خصوصی لگاؤ دیکھتے ہوئے پریشے اسے اپنی منگنی کا بتا دیتی ہے۔ جس پر وہ ساکت رہ جاتا ہے۔

واپس آکر بھی پریشے اپنے آپ کو ایک سحر گرفتار میں محسوس کرتی ہے۔ وہ جہانزیب صاحب سے راکاپوشی کی ایکسپیڈیشن پر جانے کی اجازت مانگتی ہے' حیرت انگیز طور پر اسے اجازت مل جاتی ہے۔ نشاء' حبیب (نشاء کا بھائی) کے دوستوں کے گروپ کے ساتھ پریشے محض افق ارسلان سے ملنے راکاپوشی آتی ہے۔ افق بے حد نارمل انداز میں اس سے ملتا ہے۔ اس ملاقات میں افق ارسلان' پریشے کو ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر دکھاتا ہے۔ پریشے کے استفسار پر افق بتاتا ہے کہ یہ اس کی بیوی حنا دے ہے۔ پریشے اس خبر پہ گم صم ہو جاتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

دوسری قسط

"بیوی؟"

وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی حیرت، صدمہ کچھ بھی چھپانے کی سعی نہیں کی تھی۔ کسی نے جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے تکے جا رہی تھی۔

"ہاں، یہ اس کی پکچر یونہی نکال لی تھی۔ خیر، تم کب آئیں؟" تصویر واپس والٹ میں رکھ کر جیب میں ڈالتے ہوئے افق کا انداز بہت نارمل تھا۔

"ابھی۔" اس کا لہجہ ایک دم روکھا سا ہو گیا تھا۔ اس نے گردن دوسری جانب پھیر لی۔

"مجھے علم تھا، تم ضرور آؤ گی۔ میں نے تمہارا انتظار کیا، اور دیکھ لو، بے جا انتظار نہیں کیا۔" وہ مسکرایا۔

کوئی دھوکا کھا جائے تو دھوکا دینے والا ایسے ہی مسکراتا ہے۔ پریشے کا نسوانی وقار بری طرح مجروح تھا۔

"ٹھہرو، میں اپنی باقی ٹیم کو دیکھ آؤں۔" افق نے اس کا خشک اور رکھائی بھرا انداز نوٹ نہیں کیا۔ وہ اسے چھوڑ کر قدرے بددلی سے باہر آ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے آ گیا۔

"یہ تمہاری سپورٹ ٹیم ہے، ٹریکرز ہیں یا یہ بھی کلائمب کریں گے؟"

"ٹریکرز ہیں۔" وہ اس سے دور ہٹ کر پتھروں پر چلتے ہوئے نیچے کی سمت سے آنے والی اپنی ٹیم کے افراد تک آئی۔ وہ سب پُر جوش سے ہو کر اپنے رک سیک اتار کر نیچے برف پر پھینک رہے تھے اور راکا پوشی کی حسین چوٹی کو گھوم پھر کر دیکھ رہے تھے۔ صرف وہ تھی جس کی دلچسپی وہاں موجود ہر شے سے ختم ہو گئی تھی۔

دور ایک پتھر پر ارسہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گھٹنوں پر کاغذ رکھے تھے اور ان پر کچھ لکھ رہی تھی۔ شور، ہلچل اور ٹریکرز کی آوازیں سن کر اس نے سر اٹھایا۔ پریشے کو سامنے دیکھ کر وہ سارے کاغذ وہاں چھوڑ کر بھاگتے ہوئے اس کی جانب آئی۔

"پریشے آپی! آپ ادھر؟ اوہ گاڈ، مجھے یقین نہیں آ رہا۔" وہ خوشی کے مارے اس سے لپٹ گئی، پھر الگ ہو کر اسے کندھوں سے تھام کر خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی۔ "یقین کریں، آج صبح سے میں آپ کے متعلق سوچ رہی تھی۔ بہت اچھا کیا جو آپ آ گئیں۔ ویسے اتنی جلدی کلائمبنگ پرمٹ کیسے بنا آپ کا؟"

"کم آن، میں پاکستانی ہوں، مجھے کلائمنگ پرمٹ کی ضرورت نہیں ہے۔" اپنی آواز میں بشاشت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

بیس کیمپ کے ہنگامے ٹریکرز کی آمد کے باعث جاگ اٹھے تھے۔ چند پورٹرز خیمے لگا رہے تھے، لڑکے ان کی مدد کرنے لگے۔ پریشے اپنے ساتھ ایک لک "شفالی" بھی لائی تھی، جو چولہا جلا کر چپاتیاں بنا رہا تھا۔ شفالی کے قریب بیٹھے پورٹرز پانی میں ستو گھول کر پی رہے تھے

Paulo Alberto (پالوالبرتو) کی اطالوی ٹیم بھی ان کے قریب آ گئی تھی۔ البرتو انگریزی سے نابلد تھا، باقی اطالویوں میں سے ایک کو تھوڑی بہت انگریزی آتی تھی۔ وہ سب کو بتا رہا تھا کہ کل صبح اس کی ٹیم واپس جا رہی ہے اور وہ راکا پوشی کو چھوڑ کر بلتورو کی کسی چوٹی کو سر کرنے کا سوچ رہے ہیں۔

پریشے نے پورٹرز کی مزدوری کی تمام رقم "سردار" پورٹر کے ہاتھ میں رکھ دی اور اپنے خیمے میں چلی آئی۔ یہ پورٹرز کا دستور تھا کہ ہمیشہ رقم سردار کو ملتی تھی، وہ پھر آگے اس کو تمام پورٹرز میں تقسیم کرتا تھا۔

اپنے خیمے میں آ کر اس نے میٹ بچھایا، اوپر سیلپنگ بیگ ڈالا اور اس میں لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی سماعتوں سے باہر ہونے والا شور و غل اور قہقہوں کی آوازیں ٹکرا رہی تھیں مگر اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

حنادے... افق کی بیوی... وہ شادی شدہ تھا۔ کسی اور کے ساتھ کمٹڈ تھا تو پھر اسے کیوں قراقرم کے تاج محل پر بلایا تھا؟ وہ غلط سمجھی تھی اسے؟ اس نے دھوکا کھایا تھا؟ جانے کب اسے نیند نے آن گھیرا۔ افق

اسے رات کے کھانے پر بلانے آیا مگر سوتا خیال کر کے واپس چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

9 اگست 2005ء

ہر سو گہری دھند چھائی تھی۔ وہ کسی بادل کے وسط میں پھنسی کھڑی تھی۔ دھند میں اسے اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ سبز آنکھوں اور سنہری بالوں والی لڑکی۔ وہ پریشے کو دیکھ کر تمسخر سے مسکرائی۔ پھر زور زور سے چلانے لگی۔ "افق میرا ہے۔ وہ صرف میرا ہے۔" اسے لگا اس کی آواز سے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ نہایت طیش میں آ کر وہ آگے بڑھی اور دونوں ہاتھوں سے زور سے حنادے کو دھکا دیا۔ وہ چیختی، زور زور سے چلاتے ہوئے اس برفیلی چوٹی سے نیچے لڑھک گئی۔ اگلے ہی پل کسی چھوٹی سی گڑیا کی مانند اس کا جسم نیچے کھائی میں گر رہا تھا، وہ بلند آواز میں چیخ رہی تھی، اتنی بلند گڑگڑاہٹ نما آواز کہ اس کو لگا وہ بہری ہو جائے گی۔ ہوا کو آری کی طرح چیرتی بھاری گڑگڑاہٹ...

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنے چہرے کو چھوا اور گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اپنے خیمے میں تھی۔ یہ سب ایک بھیانک خواب تھا۔ مگر وہ آواز ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ ہوا کے زور سے اس کے خیمے کا گور ٹیکس پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ تیزی سے زپ کھول کر باہر آئی۔

ہنزہ اور گلگت کے درمیان واقع کریم آباد گاؤں پر صبح طلوع ہو رہی تھی۔ نیلاہٹ مائل سنہری روشنی سے راکا پوشی کا دودھ کی طرح سفید اور اطراف کے سیاہ دیوہیکل پہاڑ چمک اٹھے تھے۔

پریشے نے ارد گرد دیکھا۔ سامنے ہی خالی قطعے پر پاکستان آرمی کا سبز ہیلی کاپٹر لینڈ کر رہا تھا۔ اس کے گھومتے پروں کی تیز ہوا سے اطراف کے تمام خیموں کے گور ٹیکس پھڑپھڑا رہے تھے۔

دور نصب نیلے خیمے کے سامنے کھڑے افق ارسلان نے شناسا انداز میں ہیلی کاپٹر کی جانب ہاتھ ہلایا۔ وہ سیاہ فلیس جیکٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس گرے اونی ٹوپی سے سر ڈھکے مسکراتے ہوئے پائلٹ کو دیکھ رہا تھا۔

ہیلی کاپٹر کے پر ساکت ہو چکے تھے۔ کھلے دروازے سے پستہ قد پھیکے نقوش کے حامل ٹورسٹ اتر رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کا چہرہ اسے دور سے ٹھیک سے دکھائی نہیں دیا تھا، نہ اسے دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ اپنے کھلے بال انگلیوں سے سنوارتی، آنکھیں ملتی ان سے دور ہٹتی گئی۔ اس کا ذہن حنادے اور اپنے خواب کے درمیان پھنسا تھا۔

یہاں نرم گدلی برف کے درمیان ایک برفانی نالہ بہہ رہا تھا۔ سورج کے چمکنے کے باعث نالے کا آدھا پانی پگھل چکا تھا، اور اس میں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ نالے کے اس طرف حسیب کا دوست بیٹھا تھا۔

"یہ ہیلی پر کون آیا ہے پری آپا؟"

وہ اپنے خیالات سے چونکی، پھر ناگوار شکنیں ماتھے پر ابھریں۔ "جسٹ ڈونٹ کال می آپا۔ پہلے آپا اور بہن جیسے رشتوں کی تمیز سیکھو اور پھر یہ لفظ کہو۔" اپنے نئے ٹراؤزر اور جیکٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ وہیں گدلی برف پر بیٹھ گئی۔

"آپ مجھ سے ہر وقت خفا کیوں رہتی ہیں؟"

"مجھے زہر لگتے ہیں تمہارے جیسے لاابالی قسم کے نوجوان جو لڑکیوں کو دیکھ کر سیٹی بجاتے ہوئے...." وہ رخ پھیر کر پہاڑوں پر بنی قدرتی چراگاہوں کو دیکھنے لگی جہاں جانور چرتے پھر رہے تھے۔ البرتو کے ٹیم ممبرز اور اس کے پورٹرز سامان کندھوں پر اٹھائے، چیونٹیوں کی طرح سیدھی قطار میں چلتے ہوئے بیس کیمپ سے واپس نیچے جا رہے تھے۔

"یہ عمر ایسی ہوتی ہے۔ سب اس عمر میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"سب نہیں ہوتے۔ محمد بن قاسم نے اس عمر میں

سندھ فتح کیا تھا۔"

"وہ تو میں نے بھی کرلینا تھا اگر یہ تلواروں کا دور ہوتا!" وہ لاپروائی سے ہنسا۔

"شٹ اپ!" اس نے اسے جھاڑ دیا۔ "اور آئندہ مجھے آپا مت کہنا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے ناشتہ بھی کرنا تھا' بال بھی باندھ کر کان بھی ڈھکنے تھے۔ کیونکہ ہلکی ہلکی چلتی برفیلی ہوا اس کے کانوں میں گھس رہی تھی۔ وہ جانے کے لیے مڑی' تب اسے خیال آیا۔

"سنو' تمہارا نام کیا ہے؟"

نالے کے اس پار برف پر بیٹھا لڑکا مسکرایا۔

"مصعب عمر۔"

"فائن۔" وہ سر جھٹک کر بیس کیمپ کی جانب بڑھ گئی۔

بیس کیمپ جاگ رہا تھا۔ ناشتے کی خوشبو' چہل پہل' پورٹرز کی واپسی' پستہ قد ٹورسٹس کی آمد۔ وہ کچن ٹینٹ کی طرف جاتے جاتے رک کر افق کو دیکھنے لگی جو ہیلی کاپٹر کے دروازے کے قریب کھڑا ہنس ہنس کر اندر بیٹھے پائلٹ سے بات کر رہا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ ان کے قریب چلی آئی۔

"ایکسکیوزمی آفیسر! یہ کون لوگ ہیں؟" افق کو یکسر نظرانداز کر کے اس نے پائلٹ سے سوال کیا۔

"یہ کچھ امیر و کبیر جاپانی سیاح ہیں جو راکاپوشی کے N W Supr (شمال مغربی رج) کی فوٹو گرافی کرنے کے لیے دو دن پیدل چل کر بیس کیمپ آنے کے بجائے پاکستان آرمی کا ہیلی کاپٹر افورڈ کر سکتے ہیں۔" مسکراتے ہوئے افق نے جواب دیا۔

"کیا واقعی توماز ہیومر کو نانگا پربت سے ابھی آپ لوگوں نے ہی نکالا ہے؟" دوبارہ پائلٹ کو مخاطب کیے اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

"میم! اس میں بے یقینی کی کوئی بات نہیں ہے۔ پاکستان آرمی کے پہاڑوں پر سرچ اینڈ ریسکیو آپریشنز دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ توماز کو ہم نے ہی نکالا ہے اور وہ ابھی بیس کیمپ میں ہے۔" پروفیشنل مگر شائستہ لب و لہجے میں آفیسر نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ سیاہ گلاسز اور کیپ کے باعث واضح نہ تھا۔

"پری! یہ میرا دوست ہے۔ میجر عاصم اور عاصم! یہ میری ساتھی کلائمبر ہیں ڈاکٹر پریشے جہاں زیب۔"

"نائس ٹو میٹ یو ڈاکٹر! آپ کو کل بیس کیمپ کے راستے میں دیکھا تھا۔"

"جی' مگر بیس کیمپ تو ہنزہ سے دو دن دور ہے۔ آپ اتنی جلدی واپس جا کر ادھر کیسے پہنچ گئے؟ اور میجر اطہر کہہ رہے تھے آپ ترک ٹیم کے لیزان آفیسر ہیں۔ حالانکہ لیزان آفیسر کا قانون تو پچھلے سال نومبر میں ختم ہو گیا تھا۔ سوائے بلتورو کے۔"

"میں ہیلی سے پہنچ گیا تھا اور ارسلان کا لیزان آفیسر دو سال پہلے بلتورو میں تھا۔ اب جاپانیوں کو لانا تھا' ساتھ ارسلان کی کچھ چیزیں بھی بغیر فیس لیے لے آیا ہوں۔" وہ ہنسا۔

"اچھا!" وہ افق کو بغیر لفٹ کرائے وہاں سے اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

ناشتے کے بعد وہ اس کے پاس آیا۔ وہ اپنے خیمے کے باہر پتھروں پر بیٹھی تھی۔

"تم نے آج اور کل ٹھیک سے ریسٹ کیا؟" وہ اپنائیت اور فکرمندی سے کہتا اس کے ساتھ پتھروں پہ بیٹھ گیا یوں کہ دونوں کے سامنے راکاپوشی کا پہاڑی سلسلہ تھا۔

"ہوں۔" اس نے نظر بھی اس کی جانب نہ اٹھائی۔

"ابھی گھنٹے تک میں اور فرید (پورٹر) کیمپ ون 4800 میٹر تک جائیں گے۔ راکا کا موسم آج بہتر ہو رہا ہے۔ تمہیں اپنی Acclimatization شروع کر دینی چاہیے۔"

"بہتر۔"

"تم اتنی فکرمند تھیں کہ تمہیں اجازت نہیں ملے گی اور دیکھو' ذرا لگن سے تم نے ریکوئسٹ کی اور تمہارے پاپا نے فوراً "تمہیں۔۔۔

"میں چینج کر لوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بولتے بولتے رک گیا' پھر سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

(ہونہہ۔ انتظار تو میں نے کیا تھا۔) وہ اسے نظرانداز کیے اپنے اورنج خیمے میں چلی آئی۔

گھنٹے بعد وہ فرید اور افق کے ہمراہ ہاتھ میں آئی ایکس اور کمر پر بیس کلو وزنی "بوجھ" اٹھائے اکاپوشی کے قدموں پر چڑھنے لگی۔ اسے acclimatization کی شدید ضرورت تھی۔ اس کو اپنے جسم اور پھیپھڑوں کو کم آکسیجن اور ہائی ایٹی ٹیوڈ کا عادی بنانا تھا' مگر ابھی تک تو اس کا ذہن نئی حقیقتوں کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ سارا راستہ خاموش رہی۔ افق بولتا رہا' اس کو ڈھلوان پر راستہ سمجھاتا رہا۔

"راکاپوشی سر کرنے کے تین روٹ تھے' جنوب مشرقی فیس' جو "جو گلت گوہ" کے گلیشئر سے ہو کر جاتا تھا' طویل مگر آسان ترین تھا۔ دوسرا مغربی فیس (پسان گلیشئر) اور نارتھ فیس اور پھر تھا "نارتھ ویسٹ رج" "NW Ridge" دنیا کا طویل ترین رج جو آج تک کوئی سر نہیں کر سکا تھا۔ افق ارسلان کی ٹیم یہی کرنے ادھر آئی تھی۔

دوپہر تک کیمپ ون میں پہنچ کر افق اور فرید نے تمام سامان خیموں میں بھرنا شروع کر دیا۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی جو پوری مستعدی سے سامان نکال رہا تھا۔ اس کے سر پر گہرے اونی ٹوپی پر سفید بنائی سے "Rakaposhi 2005" لکھا تھا۔

وہ رخ پھیر کر اطراف کا جائزہ لینے لگی۔

وسیع برفیلا میدان' تین شوخ رنگوں کے خیمے' ارد گرد کہیں کہیں سے گدلی برف جو انگریزی فلموں کی طرح صاف ستھری نہیں تھی۔ بیس کیمپ سے کیمپ ون تک برف کم تھی' کیمپ ون سے اوپر راکاپوشی کی بلندیاں برف سے ڈھکی تھیں۔

پریشے نے گلیشئر گلاسز آنکھوں پر چڑھائے اور گردن پوری طرح اٹھا کر چوٹی کو دیکھا۔

پہاڑ کی "گردن" سے اوپر برف سے ڈھکی چوٹی کے گرد بادلوں کا ہالہ تھا' ایسے کہ چوٹی دھند اور بادلوں میں گم ہو جاتی تھی اوپر آسمان نیلا اور صاف تھا' مگر چوٹی دھند میں لپٹی تھی اور یہی راکاپوشی کی سب سے بڑی خوب صورتی تھی جس کے باعث اسے دنیا بھر کے پہاڑوں میں خوب صورت ترین پہاڑ کہا جاتا تھا۔ چوٹی سے نیچے پہاڑ کئی ہزار میٹر تک ایک خاص زاویے سے نیچے آتا تھا جیسے کسی نے سانچے میں ڈھال کر مہارت سے بنایا ہو۔ دنیا کا کوئی پہاڑ ایسی انوکھی اور منفرد ساخت نہیں رکھتا۔ یہ خصوصیت صرف رومانی کے پاس ہے۔ راکاپوشی کا مطلب ہنزو کثر زبان میں چمکتی دیوار ہے' اور دومانی "دھند کی ماں" The Mother Of Mist کو کہتے ہیں۔ وہ واقعی دھند کی ماں تھی۔

واپسی کا سفر' کمر پر خالی رک سیک کے باعث آسان تھا۔ وہ افق کے آگے آگے اتر رہی تھی۔ اس کا جوتا کاٹ رہا تھا' جس کے باعث اسے چلنے میں دقت کا سامنا تھا۔

"جس طرح پیپر کبھی نئے پین سے حل نہیں کرتے' اسی طرح کوہ پیمائی یا کوہ نوردی (ٹریکنگ) کا آغاز نئے جوتے سے کبھی نہیں کرتے۔" اس کی ذہنی رو سے بے خبر وہ اس کے عقب میں کہہ رہا تھا "تم نے غالباً" نئے ٹریکنگ بوٹس لیے ہیں اور۔۔۔"

"مجھے پتا ہے۔" اس نے اتنی درشتی سے اس کی بات کاٹی کہ وہ خاموش ہو گیا۔ پریشے نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ افق نے اس کے رویے کو ماحول کی تبدیلی پر محمول کیا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ بیس کیمپ کے رنگ برنگے خیموں میں واضح کمی آ چکی تھی۔ اطالوی جاتے جاتے اپنا کچرہ بھی سمیٹ کر نہیں گئے تھے۔ خالی بوتلیں' کین' بے کار سامان ان کے خیموں کی جگہ بکھرا پڑا تھا۔ سرمئی اندھیرا پہاڑ کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ خیموں کے اندر روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ وہ تیز قدموں سے کچن ٹینٹ میں آئی۔

شفالی چپاتیاں پکا رہا تھا۔ نشاء اور ارسہ قریب ہی پلاسٹک چیئرز پر بیٹھی تھیں۔

"ارسہ باجی! آپ اپنی کتاب میں یہ ضرور لکھنا کہ یہ گورا لوگ دال چاول اور چپاتی کو مکس کر کے کیسے مزے سے کھاتے ہیں۔ پھر کہہ رہا ہوتا ہے "نو کارب' نو فیٹ چپاتی از دی بیسٹ!" شفالی ارسہ کو مشورہ دیتے ہوئے البرتو کے کسی اطالوی ٹیم ممبر کی نقل اتار کر دکھا رہا تھا۔ پریشے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور ایک اسپورٹس ڈرنک اٹھا کر منہ سے لگالی۔

"ارسہ! تم اتنا رومنٹک ناول اس پہاڑ کے بارے میں کیسے لکھ سکتی ہو؟ اس بلندی پر تمہاری کرداروں کی قلفی جمی ہوگی' ناکہ وہ رومانس جھاڑ رہے ہوں گے۔"

نشاء ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی' دفعتاً پریشے کو خاموش دیکھ کر سنجیدہ ہوئی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" وہ ڈرنک کے گھونٹ لیتی رہی۔

"میں جا رہی ہوں ادھر سے۔ ایک تو لوگ بھی نا' جدھر رائٹر دیکھتے ہیں' مشورے دینا شروع کر دیتے ہیں۔" ارسہ کافی دیر سے تنگ آئی بیٹھی تھی' بالآخر اٹھ کر چلی گئی۔ شفالی کسی کام سے باہر گیا تو نشاء نے کہا۔

"تم نے خوامخواہ اتنا ہوّا بنا رکھا تھا کہ انکل اجازت نہیں دیں گے' بالکل نہیں دیں گے' وغیرہ مگر انہوں نے اتنی جلدی اجازت دے دی' مجھے تو یقین نہیں آیا تھا۔"

"یقین؟ یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا۔" اس کی نگاہوں کے سامنے حنادے کی تصویر گھوم گئی۔

"پری! اگر ممی اور پاپا' انکل سے بات کریں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ممی کو بتا دوں یہ سب؟ آخر ماؤں سے کیا پردہ ہوتا ہے۔"

پریشے چونکی "کیا بتا دوں؟"

"جو تمہارے اور افق کے درمیان ہے۔"

"ہمارے درمیان کیا ہے؟" اس نے الٹا سوال کیا۔ نشاء نے بغور اسے دیکھا۔ "پری کیا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ تم بتاؤ۔ ہمارے درمیان کیا ہے؟" اس نے خالی بوتل میز پر رکھ دی۔

"تمہارے درمیان... تم دونوں..." نشاء ابھی۔ وہ زور سے ہنس دی۔

"ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں ہے۔ تم پاگل ہو نشی۔" وہ اٹھی اور خیمے سے باہر نکل آئی۔

نشاء اس کی بہت اچھی دوست تھی مگر ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔ وہ نشاء کو نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ شادی شدہ تھا۔ اگر بتا دیتی تو نشاء اس کا چہرہ پڑھ کر جان جاتی کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ اس کی نسوانی غرور اور انا مجروح ہوتی' سو اس نے نشاء کو کچھ نہیں بتایا۔

وہ سر جھکائے اپنے خیمے کی طرف بڑھنے لگی۔ راستے میں اسے وہ برفانی نالہ نظر آیا جس کے کنارے وہ صبح مصعب کے ساتھ بیٹھی تھی۔ صبح اس میں پانی تیر رہا تھا' مگر رات کو درجۂ حرارت گرنے کے باعث اب وہ مکمل برف ہو چکا تھا۔ وہ ہر چند گھنٹوں بعد روپ بدل لیتا تھا۔

"بالکل افق کی طرح۔ ہونہہ۔" اس نے سر جھٹکا اور اپنے قدم خیمے کی طرف تیز کر دیے۔

☆ ☆ ☆

10 اگست 2005ء

بیس کیمپ میں آج پورٹرز نے بہت اچھا ناشتہ دیا تھا۔ پورج' انڈے' چپاتی' جوس' پنیر' جس کے باعث اگلی صبح جب وہ کیمپ ون تک فرید اور افق کے ساتھ چڑھ رہی تھی' تو اس کا دل بوجھل سا تھا۔ افق اس سے آگے تھا اور مسلسل اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی اس کے جوتوں کے متعلق پوچھتا تو کبھی کھانسی کے بارے میں کیونکہ وہ مسلسل کھانس رہی تھی۔ "تم احمت کو دکھا لیتیں تو اچھا تھا۔" اس نے بیس کیمپ منیجر اور ڈاکٹر احمت دوران کا نام لیا۔ وہ جواب دیے بنا سر جھکائے اپنے "سکی پولز" کی مدد سے برف پر چلتی رہی۔

افق کی Acclimatization مکمل تھی مگر

محض پریشے کے لیے کہ وہ گر نہ جائے' اس کی طبیعت نہ خراب نہ ہو جائے' اس کو کوئی مسئلہ نہ ہو' وہ روز اتنا بوجھ لے کر اس کے ساتھ چڑھتا تھا۔ اس کا ارادہ آج تمام سامان کیمپ ون پہنچا کر' پوری شام ریسٹ کر کے اگلی صبح بالکل تازہ دم ہو کر بیس کیمپ کو الوداع کہہ کر چڑھائی شروع کرنے کا تھا۔

سورج ابھی چمک ہی رہا تھا جب انہوں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ وہ آگے پیچھے ڈھلوان سے نیچے اتر رہے تھے۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ پریشے نے دستانے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے تھے۔ تقریباً سات ہزار میٹر تک سورج جب چمکتا تھا تو گرمی شدید ہو جاتی تھی اور رات کو درجہ حرارت ایسا گرتا کہ بوتلوں میں موجود پانی بھی برف ہو جاتا۔

اونچائی کم ہو رہی تھی مگر اس کی کھانسی شدید ہوتی جا رہی تھی۔ چکر آ رہے تھے' سر میں درد تھا' Nousea بھی ہو رہا تھا' ایک جگہ کھڑے ہونے کی کوشش میں وہ پھسلنے لگی تو افق نے پیچھے سے اس کا بازو تھام کر اسے سہارا دیتے ہوئے قریب پتھر پر بٹھایا۔

"تمہیں Altitude Sickness ہو رہی ہے۔"

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" گھومتے سر کو اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"سر میں بہت درد ہو رہا ہے کیا؟" اس کو اپنی کنپٹی سہلاتے دیکھ کر وہ فکر مندی سے کہتا اس کے بالکل سامنے آ گیا' سورج اب افق کی پشت پر تھا' اس کی نارنجی شعاعیں اس کے اطراف سے نکل کر پریشے تک پہنچ رہی تھیں۔

"میں Diamor لے لوں گی۔" وہ اس کی فکر کر رہا تھا' وہ چڑ سی گئی۔ اسے اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتا تھا؟

"Diamor سے کام نہیں چلے گا۔ اگر یہ ایلٹی ٹیوڈ سک نہیں ہے تو یہ سیربرل ایڈریما پلمنری ایڈلما میں تبدیل ہو سکتی ہے اور....."

"اُفوہ افق... کیا مسئلہ ہے؟ میں ڈاکٹر ہوں' مجھے پتا ہے۔ تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اتنے غصے سے بولی کہ افق نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"پری! کیا ہوا ہے؟ میں کل سے نوٹ کر رہا ہوں۔ تم کچھ اپ سیٹ ہو۔"

"مجھے جو بھی ہو' یہ تمہارا دردِ سر نہیں ہے۔ تم میری فکر مت کرو' سمجھے تم۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ سر درد بڑھتا جا رہا تھا۔

"کیوں نہ کروں تمہاری فکر؟ تم میری....."

"میں کچھ نہیں ہوں تمہاری۔" وہ ایک دم حلق پھاڑ کر چلائی۔ "تمہاری صرف حنادے ہے۔ تم اس کی فکر کرو۔"

افق کے ماتھے پر ناگوار سی شکن در آئی۔ "حنادے کا یہاں کیا ذکر؟ تمہیں اس سے کیا مسئلہ ہے؟" اس کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

"ہونہہ! مجھے تمہاری بیوی کے ساتھ کیا مسئلہ ہوگا؟"

"شٹ اپ۔ اتنی تحقیر اور بدتمیزی سے اس کا نام مت لو۔"

پریشے نے پہلی دفعہ اسے غصے میں دیکھا تھا اور اسے غصہ آیا بھی کس بات پر تھا' کہ وہ اس کی بیوی کا نام تحقیر سے نہ لے۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ صرف نام لینے پر....؟

پریشے کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ پھنسنے لگا۔ وہ جھٹکے سے مڑی اور تیزی سے ڈھلوان سے نیچے اترنے لگی۔

"پری! رکو۔" وہ اس کے پیچھے لپکا۔ وہ جتنا تیز دوڑ سکتی تھی دوڑی۔ بیس کیمپ اب نظر آنے لگا تھا۔ برفانی نالہ پگھل چکا تھا۔ اس میں پانی تیر رہا تھا اور برف کے بڑے بڑے ٹکڑے.....

وہ بہت تیزی سے خیموں کی طرف آئی تھی۔ اس کا دماغ ایک نہج پر پہنچ چکا تھا۔ اسے اب کسی صورت وہاں نہیں رہنا تھا۔ اسے واپس گھر جانا تھا۔ بس اب بہت ہو چکا تھا۔ اب وہ کسی دھوکے میں نہیں آ سکتی

تھی۔ وہ راکاپوشی تسخیر کرنے نہیں آئی تھی، وہ تو خود تسخیر ہو کر آئی تھی، مگر اب اور نہیں۔

اپنے خیمے میں آکر اس نے اپنا مختصر سامان اٹھایا اور رک سیک میں بھرنے لگی۔ اس نے سوچا وہ کریم آباد سے کوئی پورٹر اور شفالی کو ساتھ لے لے گی، حسیب لوگ ابھی صبح ہی نکلے تھے، زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ وہ ان کو جا لے گی۔

"پری! تمہیں کیا ہوا ہے؟" وہ بھاگتا، ہانپتا اس کے خیمے میں داخل ہوا۔ پریشے نے جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی چیزیں اکٹھی کر رہی تھی۔

وہ اس کو بیگ تیار کرتے دیکھ کر ٹھٹکا۔ "تم کہاں جا رہی ہو؟"

"گھر۔" وہ اپنی شیل جیکٹ، ڈاؤن جیکٹ اور دوسری واٹر پروف کلورنگ بیگ میں بھر رہی تھی۔

"مگر کیوں؟"

"مجھے تمہارے ساتھ کلائمب نہیں کرنی۔" اس نے دوسرے بیگ میں جرابیں، گلوز اور ہیڈ اسکارف ڈالے۔

"یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم ادھر کلائمب کرنے آئی تھیں اور بہت خوشی سے آئی تھیں۔"

"وہ میری غلطی تھی، حماقت تھی۔" اس نے لوشن اور آخر میں کریمپنز ڈال کر زپ چڑھائی۔

"مگر ہوا کیا ہے؟" وہ حیران تھا اور جھلا بھی گیا تھا۔

بیگ ایک طرف رکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اس کی جانب مڑی۔ "ہوا کیا ہے؟ مجھ سے پوچھتے ہو کہ ہوا کیا ہے؟ تم..... تم دھوکے باز ہو..... تم نے دھوکہ دیا ہے مجھے۔ بہت ہرٹ کیا ہے تم نے مجھے افق! بہت زیادہ۔"

اس نے اسے پرے دھکیلا۔ وہ حیران سا دو قدم پیچھے کو ہٹا۔ "کیا دھوکہ دیا ہے میں نے؟"

"تم شادی شدہ ہو اور تم نے..... تم نے مجھے کبھی یہ نہیں بتایا۔ تمہاری ایک بیوی بھی ہے اور تم نے مجھے اندھیرے میں رکھا۔" وہ چلائی تھی۔

"تم نے بھی تو مجھے نہیں بتایا تھا کہ تم انگیجڈ ہو۔" وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی۔

"ہاں نہیں بتایا تھا کیونکہ منگنی اور شادی میں فرق ہوتا ہے۔"

"کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ساری بات کمٹمنٹ کی ہوتی ہے۔"

"کوئی فرق نہیں ہوتا افق؟" "کوئی" "فرق نہیں ہوتا؟" تم..... تم اس فضول عورت کے ساتھ....."

"اسے کچھ مت کہو!" وہ پھر غصے میں آ گیا۔

پریشے نے بہت بے بسی سے اسے دیکھا۔ سامنے کھڑا وہ شاندار سا مرد اس کا تھا، نہ ہو سکتا تھا۔ اور جس کا تھا، اس کا نام بھی احترام سے لینے کو کہتا تھا۔

"اتنی محبت ہے تمہیں اس سے افق؟" اس کا گلا رندھ گیا۔ "اتنی محبت ہے اس سے تو پھر مجھے کیوں بلایا تھا ادھر؟ ہاں..... بولو..... جواب دو۔" اس کی بھیگی آواز بلند ہونے لگی۔ "تم اس کے ہو اور صرف اس کے ہی ہو۔ باوجود اس کے تم نے مجھے بلایا اتنی دور، صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے؟ کیا چاہتے تھے تم؟ ایک لڑکی دو دن پیدل چل کر تم سے ملنے، محض تمہارے ایک فقرے کا مان رکھ کر آئے اور تم اس کا استقبال یہ کہہ کر کرو کہ "اسے دیکھو، یہ میری بیوی ہے۔" تمہیں ایک لمحے کو بھی نہیں لگا کہ تم کسی کا دل توڑ رہے ہو۔ کسی کی روح چھلنی کر رہے ہو؟ پھر کہتے ہو، میں اسے کچھ نہ کہوں؟ کیوں نہ کہوں، وہ گھٹیا ہے اور تم بھی گھٹیا ہو۔"

وہ رونے لگی تھی۔ وہ بری طرح ہاری تھی۔ پیار کی پہلی بساط پر ہی اسے چیک میٹ کر دیا گیا تھا۔ "چلے جاؤ تم ادھر سے۔ مجھے تمہاری صورت سے بھی نفرت ہے۔ چلے جاؤ۔ خدا کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

وہ بالکل خاموشی سے کھڑا اس کی ہر بات، نفرت کا ہر اظہار سن رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو وہ اس کے قریب آیا، اتنا قریب کہ اس کے عقب میں پریشے کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بالکل سامنے آکر افق نے اس کے دونوں شانوں کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔

"تمہیں مجھ سے نفرت ہے؟ میری صورت سے بھی نفرت ہے؟ یہ نفرت اس وقت سے ہوئی جب سے تمہیں حنادے کا علم ہوا ہے، ہاں؟ تو پھر میری بات غور سے سنو۔ مزید کچھ کہنے سے پہلے یہ بات سنو۔ تم حنادے کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ دو سال پہلے کے ٹو پر ایولانچ آیا تھا۔ حنادے اس میں دب کر مر گئی تھی۔ اس کا نام اتنی تحقیر سے مت لو۔ وہ میری بیوی تھی۔"

اس نے پریشے کے کندھوں کو ایک جھٹکا دے کر چھوڑ دیا، پھر ایک آخری نظر اس پر ڈال کر تیزی سے پلٹا اور خیمے کا گور ٹیکس اٹھایا۔ باہر سے راکاپوشی کے سرمئی قدموں کی جھلک نظر آئی، ساتھ میں سرد ہوا کے تھپیڑے بھی اندر آئے۔ وہ باہر نکلا، خیمے کا پردہ گرا دیا۔ راکاپوشی چھپ گیا، سرد ہوا کا راستہ رک گیا اور وہ..... وہ..... جہاں تھی، ابھی تک وہیں منجمد سی کھڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

بیس کیمپ پر رات اتر آئی تھی۔ اندھیرے میں دمانی کی سفید چوٹی کسی ہیرے کی طرح جگر جگر چمک رہی تھی۔ پہاڑ کے قدموں میں، خیموں سے ایک طرف ہٹ کر، خالی جگہ پر آگ کا الاؤ جلا تھا۔ اس الاؤ کے گرد افق کی سپورٹ ٹیم کے افراد، مقامی پورٹرز اور کریم آباد کے باسی جمگھٹا لگائے بیٹھے تھے۔ بیس کیمپ کی پر رونق فضا میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز کے ساتھ بلند و بانگ قہقہے بھی گونج رہے تھے۔ کریم آباد کے لوگوں نے افق سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ راکاپوشی سر کر لے گا تو اس کے اعزاز میں پورا گاؤں دعوت دے گا۔

کبھی اس محفل سے ہنزہ کے روایتی نغموں کی صدا گونجنے لگتی تو کبھی ترک اپنے گیت سنانے لگتے۔ ان عروج پر پہنچی رونقوں میں دو افراد کی کمی تھی۔ ایک ارسہ جو اپنے خیمے میں بیٹھی اپنا ناول لکھنے میں محو تھی اور دوسری پریشے جو ان سب سے دور اس برفانی نالے کے اس پار سوگوار سی بیٹھی تھی۔ وہ کہنی گھٹنے پر رکھے اور مٹھی تھوڑی تلے جمائے سامنے خیموں کو دیکھ رہی تھی۔ خیموں کے اس پار بون فائر کا منظر آدھا نظر آ رہا تھا، آدھا خیموں کے باعث چھپ گیا تھا۔

تب دفعتاً اس نے افق کو محفل میں سے اٹھتے دیکھا۔ وہ خیموں کے درمیان میں سے جگہ بناتا، اپنی گرے فیس جیکٹ کی زپ بند کرتا اس کی جانب آ رہا تھا۔ پریشے نے سر جھکا دیا۔ اسے اس وقت افق سے بے انتہا شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ "تم کیا ادھر بور لوگوں کی طرح بیٹھی ہو؟ آؤ وہاں چلو سب ادھر اتنا انجوائے کر رہے ہیں۔ صرف تمہارے لیے اتنا شغل چھوڑ کر آیا ہوں۔" وہ اتنے فریش انداز میں مخاطب تھا جیسے صبح کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

پریشے نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے سامنے ایک پتھر پر کہنی جمائے آرام سے بیٹھ چکا تھا اور اب اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"تم نے ہم ترکوں کے گیت مس کر دیے۔ ابھی میں انہیں اتنا اچھا گانا سنا رہا تھا، وہ پورٹرز کہنے لگے، صاب آپ نے غلط پروفیشن چوز کیا ہے۔ آپ کو تو....."

"افق!" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ اسے ڈانٹنے، یا اس پر خفا ہونے کے بجائے یوں اتنا لاپروا اور ہشاش بشاش کیوں لگ رہا تھا؟

"میں..... میں بہت بری ہوں نا افق؟"

"تمہیں واقعی آج پتا چلا ہے؟"

"افق پلیز! میں سیریس ہوں۔"

"میں بھی ڈیڈ سیریس ہوں، میری پیاری سی پری۔" وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔ دور الاؤ کے قریب سے اٹھتا شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا۔

"پلیز افق! مجھے بات تو کرنے دو۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"کم آن۔ مجھے پتا ہے تم نے کیا کہنا ہے۔ یہی کہ افق مجھے معاف کر دو۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے نہیں پتا تھا وہ مر چکی ہے ورنہ میں وہ سب نہ کہتی۔ یہی کہنا ہے نا تمہیں؟ تو بس ٹھیک ہے میں نے کہہ دیا تمہاری جگہ۔ اب اس قصے کو ختم کرو۔"

"افق! مجھے واقعی نہیں پتا تھا۔ میں اتنا کچھ کہتی رہی اور۔۔۔۔" وہ رو دینے کے قریب تھی۔ وہ جھنجلا گیا۔

"ایک تو تم پاکستانیوں میں یہ بڑی خرابی ہے۔ بات کو چباتے رہتے ہو۔ پلیز' باتوں کو نگل لیا کرو' ہضم کر لیا کرو۔ جو ہوا بھول جاؤ پلیز!"

وہ اسی طرح بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"ویسے مجھے اگر علم ہوتا کہ تم حنادے سے اتنی جیلس ہوگی تو اس کا ذکر بہت پہلے کر دیتا۔ ویسے۔۔۔۔" وہ شرارت سے تھوڑا سا جھکا۔ "میں تمہیں اتنا اچھا لگتا ہوں کیا؟" مسکراہٹ دبائے' بمشکل خود پر سنجیدگی طاری کیے وہ مصنوعی معصومیت سے پوچھتا اتنا اچھا لگ رہا تھا۔

"ہاں' لگتے ہو نا!" خفگی بھرے انداز میں کہہ کر وہ خیموں کو دیکھنے لگی۔ افق کی طرح اس کی ناک بھی سرخ ہو رہی تھی اور منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتا رہا' جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی معصومانہ شرارت پر اسے پیار سے دیکھتا ہے' مگر کہتا کچھ نہیں ہے۔

"پری! آج تک یہ ہوتا آیا ہے کہ کوہ پیما خوب جسمانی مشقیں جھیل کر خود کو ان خوب صورت پہاڑوں کے لیے تیار کرتے ہیں۔ آج رات یہ پہلی دفعہ ہوگا کہ میرے عقب میں موجود یہ پہاڑ خود کو ایک بہت خوب صورت کوہ پیما کے لیے تیار کرے گا۔"

پریشے نے نگاہوں کا زاویہ اس کی جانب واپس موڑا۔ قدرے اتراہٹ' قدرے معصومیت سے وہ بولی "کون' میں؟"

"نہیں یار' اپنی بات کر رہا ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پریشے نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"اچھا اٹھو۔ تمہارا چیک اپ کراتے ہیں احمت سے۔ سارا دن روتی رہی ہو۔ اب تک تمہاری ایلٹی ٹیورسک ہنسی عروج پر ہوگی۔"

کھڑے کھڑے افق نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ وہ نالے کے دوسری طرف تھا۔ پریشے نے پہلے خفگی سے اسے دیکھا' مگر وہ اس سے زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے افق کا ہاتھ تھام لیا اور کھڑی ہو گئی۔ افق نے اس کا ہاتھ تھامے' نالہ کراس کیا۔ دوسری جانب آکر افق نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے خیموں کے قریب آئے۔

کریم آباد کے دیہاتی اب اٹھ کر جا رہے تھے۔ احمت پھر بھی بیٹھا کوئی گانا سنا رہا تھا۔ پریشے کو آتے دیکھ کر جھینپ کر خاموش ہو گیا۔

افق نے اس سے ترک میں کچھ کہا۔ وہ سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور ان کو اپنے ساتھ لیے ایک خیمے میں آ گیا۔

"تمہارا تعارف نہیں کرایا۔ یہ میرا دوست ہے ڈاکٹر احمت دوران۔ جینیک اور کیمین کی طرح کا بہترین دوست' اس سے میری دوستی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ میں ہر ممکن طریقے سے اس کے لیے مریض پکڑ لاتا ہوں۔"

احمت کے خیمے میں کرسی سنبھالتے ہوئے افق نے ہنس کر کہا۔ وہاں بڑی سی میز رکھی تھی۔ پریشے کے مقابل کرسی احمت کی تھی۔ افق اس کے دائیں جانب بیٹھ گیا۔

پریشے کے چیک اپ کے دوران احمت مسلسل ترک زبان میں افق کو کچھ بتاتا رہا۔

"یہ کہہ رہا ہے تم صبح تک بالکل ٹھیک ہو گی اور تمہاری کھانسی تو اب پہلے سے بہتر ہے۔"

پریشے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے احمت کو دیکھتی رہی۔ وہ افق کا ہم عمر تھا مگر بے حد دبلا پتلا اور چہرہ نو عمر لڑکوں جیسا تھا۔ بال سنہری مائل بھورے تھے۔ پریشے کے دیکھنے پر اس نے شرما کر ہونٹ ایسے بند کر لیے کہ جیسے کوئی بچہ غلط کام کرتا پکڑا جائے تو گھبرانے کے بجائے جھینپ کر مسکرا دے۔ وہ اتنا معصوم لگ رہا تھا کہ پریشے کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"تمہارا دوست بہت کیوٹ ہے۔"

افق نے ایک نظر پریشے کو دیکھا' دوسری نگاہ احمت پر ڈالی جو جھینپ کر ہنس دیا تھا اور پھر دوبارہ پریشے کو دیکھا۔ "میرے کیوٹ دوست کو بہت اچھی انگریزی آتی ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔" اب بوکھلانے کی باری پریشے کی تھی۔ "میں سمجھی اسے انگریزی نہیں آتی اور اگر ایسا نہیں ہے تو تم دونوں ترک میں کیوں بات کر رہے تھے؟"

"اب ترک ہو کر ہم فرنچ میں تو بات کرنے سے رہے۔ ویسے یہ اندر سے اچھا خاصا ہے' مادام۔ کسی زمانے میں احمت اومت (رائٹر) بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔"

"اور تم نصوع محروکی کے۔" کھٹ سے احمت کی جانب سے جواب آیا۔ "یہ صاحب کیا شاعر ہیں؟"

"اتنا بڑا ترک کلائمبر ہے تمہیں نہیں علم؟ خیر جتنا بھی بڑا ہو جائے' افق ارسلان جیسا نہیں ہو سکتا۔" وہ مصنوعی تفاخر سے بولا۔ مگر پریشے نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

(صحیح کہتے ہو۔ ہر بندہ افق ارسلان نہیں ہو سکتا۔)

"اس کے علاوہ احمت انتہائی ذلیل قسم کا کمپیوٹر جینئس اور ہیکر بھی ہے۔" اس نے کہا اور "ذلیل" اسی طرح شرما کر مسکرا دیا۔

"کمپیوٹر سے یاد آیا۔ احمت' میں تمہارا کمیونیکیشن ٹینٹ یوز کر لوں؟ مجھے پاپا کو ای میل کرنی تھی۔" پری کو اچانک یاد آیا۔

"کر لو۔ اور اس سے ایسے پوچھ رہی ہو جیسے اس کا پیسہ لگا ہو۔ مادام! یہ میرے باپ حسن حسین ارسلان کی خون پسینے کی کمائی ہے جسے ہم یوں ہمالیہ میں جھونک رہے ہیں۔ جینیک اکثر کہتا ہے' اگر "اور ہمیں یقین" اور حسن حسین ارسلان کے آباؤ اجداد نے اتنی جائیداد نہ چھوڑی ہوتی تو بیس ملک افق اور جینیک کی مہمان نوازی کرنے سے محروم رہ جاتے۔"

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ پورٹرز ادھر ادھر پھرتے' اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ الاؤ سے چند گز کے فاصلے پر البرتو کے کیمپ کی جگہ کل والا کچرا ابھی تک وہاں پڑا تھا۔

"تم اس نیلے ٹینٹ میں چلی جاؤ۔ وہ کمیونیکیشن ٹینٹ ہے۔ میں ذرا یہ صاف کر دوں۔" وہ زمین پر بیٹھ کر بکھرا کچرا چننے لگا۔

"خود کیوں ہلکان ہوتے ہو؟ پورٹرز سے کہہ دو۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ بے چارے تھکے ہوئے ہوں گے میں خود کر لوں گا یہ سب۔" وہ خالی کین' بوتلیں اور یورپین پروسیسڈ فوڈ کے خالی ڈبے سمیٹنے لگا۔

وہ کمیونیکیشن ٹینٹ میں چلی آئی۔ احمت نے اسے زبردست انداز میں ترتیب دے رکھا تھا۔ سیٹلائٹ فون' لیپ ٹاپ کمپیوٹرز' جنریٹرز' بجلی کے لیے سولر پینل' دوسرے کچھ آلات۔۔۔۔ وہ ایک ستائشی نگاہ اس سب پر ڈال کر اس کرسی کے قریب آئی' جس پر ارسہ بیٹھی تھی۔

"تم کیا کر رہی ہو؟"

"فین میل چیک کر رہی ہوں۔ اب تو ایک ہی قسم کی ای میلز سے بور بلکہ زچ ہونے لگی ہوں' پتا نہیں لوگ ہر بات میں "اتنی سی عمر میں ناول کیسے لکھ لیا؟" کیوں کہتے ہیں؟ خود کیا وہ اس عمر میں فیڈر پیتے اور روٹی کو چوچی کہتے تھے؟ میری عمر کے بارے میں ایسے رشک کرتے ہیں کہ نظر لگا دیں گے اور شاید میں لکھنا ہی بند کر دوں۔" وہ سخت بھری بیٹھی تھی۔ "اور ہر میل میں مجھے کہتے ہیں' کیا آپ مجھ سے دوستی کریں گی؟ خدایا' میں نے قلمی دوستی کا اشتہار تو نہیں دیا تھا جو مجھے ہر بندہ یہی کہتا ہے اور میرے پاکستانی فینز کی تو مت پوچھیں۔ چونکہ میں عمر میں ان سے چھوٹی ہوں سو "تم" اور "یار" کہہ کر خود ہی فری ہونے لگتے ہیں۔ پتہ نہیں لوگوں کو اپنے اردگرد فرینڈز نہیں ملتے جو۔۔۔۔"

"اچھا ہٹو نا۔ مجھے کمپیوٹر چاہیے۔" اس نے پیار سے ارسہ کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"بیٹھ جائیں اور کبھی لطیفے پڑھنے کا شوق ہو تو میری فین میل کھول کر پڑھنا۔" وہ کہہ کر باہر چلی گئی۔

پریشے نے میل کھولی۔ سیف کی تین ای میلز تھیں جو اس نے پڑھے بغیر مٹا دیں۔ پاپا کی ایک ہی تھی۔ وہ کچھ دنوں کے لیے کام سے برسلز جا رہے تھے۔ کچھ لمبا کام تھا۔ شکر تھا کہ وہ بزی تھے۔

"بیٹھ جاؤں مادام؟ اگر کچھ پرسنل نہیں ہے تو؟"

افق اندر داخل ہوا۔
"ہوں۔ تم سے کیا پرسنل؟ اور ہو گئی جمعداری؟"
وہ ای میل لکھ کر بھیج رہی تھی۔ افق نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ بہت خاموشی سے اس کے دائیں جانب کرسی پر بیٹھا سوچتی نگاہوں سے لیپ ٹاپ کی چمکتی اسکرین کو دیکھتا رہا۔
"سنو پری۔ تمہیں سائیکک۔ لوگوں پر یقین ہے؟"
"تھوڑا بہت۔ کیوں؟"
"براؤزر کلوز مت کرو۔ تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔ ایڈریس بار میں لکھو
"www.peteranswers.com"
پریشے نے ٹائپ کیا۔ فوراً" ایک صفحہ کھل گیا۔ افق نے لیپ ٹاپ اپنی جانب کھسکا لیا۔
"یہ ایک سائیکک ہے پیٹر! تمہیں تمہارے ہر سوال، ہر پریشانی کا حل بتائے گا۔ کوئی سوال پوچھنا ہے تو پوچھو۔ ہاں ٹائپ میں کرتا ہوں، کیونکہ میری اس سے تھوڑی جان پہچان ہے۔"
"افوہ! مجھے ان چیزوں کا کوئی یقین نہیں ہے۔ خیر تم پوچھو۔ میرا نام کیا ہے؟"
افق کی انگلیاں لیپ ٹاپ کے کی پیڈ پر متحرک تھیں۔ وہ بہت تیز ٹائپ کرتا تھا۔ وہاں دو خانے سے تھے۔ پہلے میں اس نے لکھا۔
"پیٹر پلیز آنسر۔"
اور دوسرے میں لکھا "میرے ساتھ بیٹھی لڑکی کا نام کیا ہے؟"
"پریشے جہاں زیب۔" اسکرین پر سفید رنگ کے دو الفاظ ابھرے افق نے فخر سے اسے دیکھا جو کچھ حیران، کچھ بے یقین سی تھی۔
"اچھا پوچھو، میری عمر کیا ہے؟"
افق نے ٹائپ کیا۔ "پیٹر پلیز آنسر۔ پریشے کی عمر کیا ہے؟"
"پچیس سال۔" اسکرین پر لکھا آیا۔
"اسے کیسے پتا؟" وہ بے یقینی سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔
"یہ سائیکک ہے، اور دماغ پڑھ سکتا ہے۔"
پھر پریشے نے اپنے متعلق کئی سوالات کیے۔ تمام کے جوابات درست نکلے۔ اسے تھوڑا سا خوف محسوس ہونے لگا۔ پیٹر واقعی کوئی عامل تھا۔
"اچھا پوچھو کہ...... کہ کیا میں کسی کو پسند کرتی ہوں؟"
"اس کا جواب مجھ سے پوچھ لو۔ تم راکاپوشی کو پسند کرتی ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا، پھر لکھنے لگا۔
"پیٹر پلیز آنسر۔ کیا پریشے کسی کو پسند کرتی ہے؟"
"تم بار بار پیٹر پلیز آنسر کیوں لکھتے ہو؟" وہ بار بار کی تکرار سے جھنجلائی۔
"اس دنیا میں کام نکلوانے کے لیے منت کرنا شرط ہے۔"
پیٹر کا جواب اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔ "ہاں، اور اس کا نام "K" پر ختم ہوتا ہے۔"
اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے گھبرا کر افق کو دیکھا۔
"K" پر؟ لیکن راکاپوشی تو "K" پر نہیں ختم ہوتا۔" وہ شاید سمجھا نہیں تھا، یا پھر بن رہا تھا۔
پریشے نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "کیا وہ مجھے ملے گا؟"
"ہاں۔ اگر وہ کوشش کرے تو!" جواب آیا۔
وہ بے حد خوف زدہ نگاہوں سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ "اچھا اب...... اب پوچھو، کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے؟"
افق نے فوراً" پوچھ دیا۔ جواب بھی فوراً" آیا۔
"محبت؟ وہ تو عشق کرتا ہے۔"
وہ سانس روکے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ یہ آدمی کون تھا اور کیسے اتنا کچھ جانتا تھا؟
"افق...... افق...... سوزو ہرمک لا......" احمت خیمے کا دروازہ کھول کر تیزی سے اندر داخل ہوا اور افق سے ترک میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ پریشے کو دیکھنے پر فوراً" پیچھے ہٹا۔ اس کے چہرے پر معذرت خواہانہ تاثرات ور آئے تھے۔
وہ پیٹر کے سحر میں ایسے بری طرح جکڑی ہوئی تھی کہ یہ مداخلت بری طرح کھلی۔ افق نے بھی قدرے اکتا کر اسے دیکھا۔ پھر دونوں کچھ دیر ترک میں بات کرتے رہے۔ تب وہ اٹھا اور جیکٹ کی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے بڑبڑاتے ہوئے خیمے سے باہر چلا گیا۔ "ذرا ان پورٹرز کا جھگڑا نمٹا لوں...... پتہ نہیں کیا مسئلہ ہے ان کو؟"
اس کے جانے کے بعد احمت نے پھر پریشے سے معذرت کی۔
"معاف کرنا ڈاکٹر! وہ پورٹرز میں جھگڑا ہو گیا تھا، افق اسے ہی نمٹانے گیا ہے۔ دراصل۔" دفعتاً" اس کی نگاہ اسکرین پر پڑی۔ وہ قدرے قریب آیا اور جس کرسی پر افق بیٹھا تھا، اس کی پشت کو پکڑ کر قدرے جھک کر بغور اسکرین کو دیکھا۔ "اچھا۔ تم Peter Answers کھیل رہی ہو۔"
"کھیل رہی ہوں؟" وہ بری طرح چونکی۔
"ہاں۔ اٹ از اے گریٹ گیم۔" وہ سادہ انداز میں بولا۔
"گیم؟" پریشے کے ذہن میں الارم سا بجا۔ "احمت ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو اور مجھے شروع سے بتاؤ کہ یہ کیسے کھیلتے ہیں۔"
"یہ تو بہت آسان ہے۔" وہ کھڑے کھڑے بتانے لگا۔ "یہ دیکھو اسکرین پر دو خانے بنے ہیں پہلے خانے میں۔"
"مجھے پتا ہے، اس میں "پیٹر پلیز آنسر لکھنا ہے۔"
"نہیں، یہ ہی تو نہیں لکھنا۔ اس میں تم نے فل اسٹاپ دبا کر اصل "جواب" لکھنا ہے۔ فل اسٹاپ دبا کر تم جو بھی لکھو گی، اس جگہ اسکرین پر پیٹر پلیز آنسر ہی لکھا آئے گا۔ پھر دوسرے خانے میں تم سوال لکھو اور اینٹر کرو۔ اب جو تم نے اوپر والے باکس میں چھپا کر لکھا تھا، وہ پیٹر کے جواب کے طور پر لکھا آئے گا۔"
تو...... تو پھر پیٹر کون ہے؟"
"وہی جو بیٹھا ٹائپ کر رہا ہے۔"
"تمہارا مطلب ہے کہ جواب، ٹائپ کرنے والا خود لکھتا ہے اور پیٹر کوئی نہیں ہے۔" وہ آہستہ سے بولی اب اسے سمجھ آ رہا تھا۔
"ہاں۔ اس سے بڑے بڑے لوگ بے وقوف بن جاتے ہیں۔" احمت کا انداز ذہانت مگر معصومیت بھری بے وقوفی سے لبریز تھا۔ "ویسے تم کسے بنا رہی تھیں؟"
"میں بن رہی تھی۔"
"اچھا۔" اس نے شانے جھٹکے۔ "افق اور جینیک کا یہ مشغلہ ہے۔ جب بھی میرے ہاسپٹل آتے ہیں، ڈاکٹرز اور نرسوں کو گھیر گھار کر بے وقوف بناتے رہتے ہیں۔ انہیں ٹائپ نہیں کرنے دیتے، اور کہتے ہیں "ہماری پیٹر سے تھوڑی......"
"تھوڑی جان پہچان ہے۔" پریشے نے فقرہ مکمل کیا۔
"ہاں۔ بڑے عرصے تک ڈاکٹرز بے وقوف بنتے رہے۔"
"پھر انہیں پتا کیسے چلا؟"
"میں نے بتا دیا تھا۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ افق ان کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ تو میں نے ایک ڈاکٹر کو یہ ویب سائٹ کھولتے دیکھا تو سمجھا دیا کہ پیٹر آنسرز کو کیسے کھیلتے ہیں۔ میری آنے کہتی ہے، کوئی کام کی بات ہو تو سب کو بتا دیا کرتے ہیں۔ میں نے اس ڈاکٹر کو بتایا، اس نے باقی سب کو بتا دیا اور پھر......" وہ جھینپ سا گیا۔ "پھر افق اور جینیک نے سخت سردی میں مجھے پول میں پھینک دیا اور مارا بھی بہت۔"
پریشے ہنس دی۔ "چلو آج تمہارا بدلہ لیتے ہیں۔ تم بس افق کو مت بتانا کہ تم نے مجھے بتا دیا ہے۔"
"نو پرابلم۔" وہ شانے جھٹکتے ہوئے چلا گیا۔
افق تھوڑی دیر بعد آیا۔ اس کی ٹوپی اور جیکٹ پر برف کے ذرات پڑے تھے۔ وہ بازو جھاڑتے ہوئے کرسی سنبھال کر بیٹھا۔
"یہ پورٹرز بھی نا، خیر ہم کہاں تھے؟" اس نے اسکرین کو دیکھا۔ "ہوں تو وہ تم سے عشق کرتا ہے۔ کون ہے وہ؟" وہ بڑے لاپروا سے انداز میں بولا۔

"ابھی پتا چل جاتا ہے۔ تم اس سے اس کی ہائٹ اور آنکھوں کا رنگ پوچھو۔" اب وہ افق کے ہاتھوں کی حرکت کو دیکھ رہی تھی۔

" سکس ون ہائٹ اور ہنی کلرڈ آئز۔" پیٹر کا جواب آیا۔

"بس میں سمجھ گئی یہ کس کی بات کر رہا ہے۔ سکس ون ہائٹ، ہنی کلرڈ آئز، اور "K" پر نام ختم ہوتا ہے۔ بالکل ٹھیک۔" وہ خوشی سے بولی۔

"اچھا۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ "پھر کون ہے؟"

"سیف الملوک اور کون۔"

افق کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے قدرے الجھ کر اسکرین، اور پھر پریشے کو دیکھا۔

"نہیں۔ سیف نہیں۔۔۔ یہ تو۔۔۔"

"سیف ہی ہے۔ مجھے پتا تھا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے مگر اتنی زیادہ کرتا ہے، یہ نہیں علم تھا۔ اوہ میں کتنی لکی ہوں نا افق!"

"نہیں نا۔" وہ جھنجلایا۔ "ضروری تو نہیں یہ سیف کی بات کر رہا ہو۔ کسی اور کا نام بھی تو "کے" پر ختم ہو سکتا ہے۔"

"اور کسی کا نہیں ہوتا۔"

"ہوتا ہے۔" اس نے جھلا کر کی بورڈ پر ہاتھ مارا۔

"کس کا؟"

"میرا! اور یہ سب میں لکھ رہا تھا، سمجھیں تم!" وہ غصے سے بولا۔

"اچھا مجھے تو نہیں پتا تھا۔" پریشے نے ٹھوڑی تلے مٹھی جما کر معصومیت سے اسے دیکھا۔ "اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم سیف کے نام سے اتنے جیلس ہو گے تو بہت پہلے اس کا نام لے دیتی۔ ویسے میں تمہیں اتنی اچھی لگتی ہوں کیا؟"

اس کا انداز افق کو بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ تمام ڈرامہ جان گئی تھی، سو ناراضی سے کھڑا ہوا اور کرسی کے پیچھے سے نکل کر خیمے کے دروازے کی جانب بڑھا، پھر پلٹ کر ایک خفگی بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

"ہاں۔ لگتی ہو نا!" کچھ نروٹھے پن، کچھ محبت سے اس نے جیسے بہت ناراضی سے اعتراف کیا۔ وہ ہنس دی۔

"تم اس ٹائم اتنے کیوٹ لگ رہے ہو، مگر میں تعریف کر کے تمہارا دماغ نہیں خراب کرنا چاہتی۔"

وہ اسی طرح برا سا منہ بنا کر سر جھٹکتے ہوئے جانے لگا، پھر رک کر پوچھا۔ "تمہیں پیٹر آنسرز کے سیکرٹ کا پہلے سے پتا تھا؟"

"نہیں، یہ تو ابھی احمت نے۔۔۔" بے اختیار اس نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

"واٹ؟ احمت نے بتایا ہے؟ میں آج اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس گدھے نے پہلے بھی مجھے ڈاکٹروں اور نرسوں سے پٹوایا تھا۔ کدھر گیا یہ۔۔۔"

وہ غصے سے بولتا خیمے سے باہر نکل گیا۔ اور وہ، جسے احمت پر بے انتہا ترس بھی آ رہا تھا، ہنستی جا رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

11 اگست 2005ء

اُس نے میس ٹینٹ کی میز پر رکھے کئی پاور بارز اور انرجی بارز اٹھا کر اپنے رک سیک میں بھر لیے اور جوتوں کے نیچے Crampons چڑھا کر باہر نکل آئی، جہاں ارسہ، فرید اور افق اپنے بیک پیکس کمر پر چڑھائے، بوٹس، کریمپنز، ٹوپیاں اور گلاسز پہنے تیار کھڑے تھے۔

شیڈیول کے مطابق کیمپ فور تک دو پورٹرز ساتھ لے کر جانا تھے، مگر شیر خان نے صبح سویرے سورج نکلنے کے وقت بغیر گلاسز لگائے راکاپوشی کا نظارہ کیا تھا، اور اب وہ سنو بلائنڈ ہو کر اپنے گھر پڑا تھا۔

ان کے پاس اتنا گیئر اور فیول نہیں تھا کہ وہ ایک دن بھی تاخیر کر سکیں۔ فرید خان جانے کے لیے تیار تھا۔ وہ بنیادی طور پر ہنزہ کا باشندہ تھا اور ہنزہ کٹر پورٹرز بلتی پورٹرز سے جسمانی اور ذہنی، دونوں لحاظ سے مختلف ہوتے تھے۔ بلتورو کے بلتی پورٹرز کو غیر ملکیوں خصوصاً "یورپین پروسیسڈ فوڈ کا زیادہ تجربہ ہوتا تھا۔ افق انہیں "شرپاز کا قراقرم ورژن" کہتا تھا۔ پورٹرز کو [...]ہریوں کی طرح سردی کے لیے بہت کچھ محفوظ کرنا [...]تا ہے، جس کے باعث یہ نہ چاہتے ہوئے بھی کوہ [...]یاؤں کے ساتھ ان بلندیوں پر جاتے ہیں۔ کوہ پیمائی [...]ض لوگ پیسہ کمانے کے لیے کرتے ہیں اور بعض [...]یسہ خرچ کرنے کے لیے۔

جب ان چاروں نے بیس کیمپ کو الوداع کہا تو افق [ا]حمت سے گلے ملا، پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے [ا]سے سنجیدگی سے اپنی زبان میں کچھ سمجھاتا رہا۔ احمت [...]پہاڑ پر تقریباً" تین سو میٹر تک ان کے ہمراہ آیا تھا۔ اس [د]وران افق مسلسل اسے کسی لیڈر کی طرح ہدایات دیتا [...]رہا اور احمت اپنے ازلی معصوم انداز میں تابعداری [...]سے سر ہلاتا رہا۔

پھر احمت چلا گیا تو افق اسے نیچے اترتے دیکھتا رہا۔ [...]یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ پریشے [ا]س کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ احمت غائب ہو گیا تو افق [...]نے ایک آخری، الوداعی نگاہ، دور چھوٹے سے دکھائی [...]دینے والے بیس کیمپ پر ڈالی۔

"میری خواہش ہے کہ ہم سب ان خیموں کو دیکھنے [...]کے لیے زندہ رہیں۔" وہ بڑبڑایا۔ پریشے نے بے حد [...]خوف سے اوپر "برو" کے گلیشیئر کو دیکھا اور دل میں [...]دعا کی کہ خدا کرے، برو کو علم نہ ہو کہ کوئی دبے قدموں [...]اس کی راجدھانی میں داخل ہو رہا ہے۔ کاش برو سوتا [...]رہے، وہ کبھی نہ جاگے اور وہ اس کے تخت پر قدم رکھ کر [...]زندہ سلامت واپس آ جائیں۔

اس کی ہراساں صورت دیکھ کر وہ مسکرایا۔ "فکر [...]نہیں کرو۔ ہم راکاپوشی کو سر کر لیں تو کریم آباد کے [...]لوگ ہمیں گرینڈ دعوت دیں گے۔"

پریشے نے ایک نظر برف میں پیوست نوکدار [...]بضوی سے کریمپنز کو دیکھا جو اس کے جوتوں کے نیچے [...]لگے تھے اور جس سے وہ برف پر پھسل نہیں سکتی تھی [...]اور سر جھٹک کر مسکرائی۔ خوف قدرے کم ہوا۔

"ہاں میں نے دیکھا تھا، دعوت کا سن کر تم نے بڑے حریصانہ انداز میں پوری آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تھا۔"

"میری آنکھوں کو کچھ مت کہو۔ ترک لڑکیاں ان آنکھوں پر مرتی ہیں۔"

"ترک لڑکیوں کا ٹیسٹ اتنا خراب ہے؟ سچ سچ مجھے ان سے ہمدردی ہے۔"

"اچھا ابھی لڑو نہیں۔ ابھی لمبا سفر ساتھ کرنا ہے۔" افق نے اپنا بھاری دستانے والا ہاتھ بڑھایا، پریشے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اب اس نے خود کو قدرے محفوظ تصور کیا۔ وہ گرنے لگے گی تو کوئی اسے تھام لے گا، اور گرنے نہیں دے گا۔

وہاں برف گدلی اور بے حد نرم تھی۔ سورج ذرا تیز چمکتا اور برف پگھلنے اور ٹپکنے لگتی۔ راکاپوشی سر کرنے کا آئیڈیل ٹائم جولائی ہوتا ہے اور وہ ایک مہینہ لیٹ ہو چکے تھے۔ اگست میں برف خراب حالت میں تھی۔

ایسی ہی برف کھود کر ایک برفیلے میدان میں کیمپ ون نصب تھا۔ جس میں تین ٹرٹل ٹینٹ لگائے گئے تھے۔ پہاڑ پر مختلف بلندیوں پر باری باری کیمپ لگائے جاتے ہیں۔ یہ کوہ نوردی کا نظم و ضبط ہوتا ہے۔ کیمپ ون تک وہ دوپہر تک پہنچ گئے تھے۔ پہلی رات انہوں نے وہیں گزاری۔

دوسری صبح افق، فرید اور ارسہ کیمپ ٹو تک کے راستے پر رسیاں لگانے چلے گئے۔ افق کا ارادہ اوپر بارہ سو میٹر تک روٹ فکس کرنے کا تھا اور آگے کیمپ ٹو کے لیے کہیں مناسب جگہ ڈھونڈ کر وہاں خیمے بھی لگانے تھے۔ وہ سیمی الپائن اسٹائل سے چڑھ رہے تھے یعنی بعض جگہ رسیاں لگائی تھیں اور بعض جگہ نہیں۔

پریشے اس روز خیمے میں ہی رک گئی۔ اس کی ایلٹی ٹیوڈ سک نیس کم ہو رہی تھی، اور بہت جلدی اوپر جانے سے وہ بڑھ سکتی تھی۔ سو اپنی Acclimatization کو بالکل پرفیکٹ کرنے کے لیے اس نے وہیں رک کر ان کے لیے کھانا بنانے کی ذمہ داری لے لی۔

کچھ دور تک وہ ان کے ساتھ گئی۔ ارسہ کے کندھے پر رسیوں کا گچھا تھا اور ہاتھ میں چند آئس اسکریوز اور Pitons پی ٹونز تھے۔ افق نے زمین پر

بیٹھ پر ایک پی ٹون ٹھونکا' پھر رسی کو اس سے اینکر کیا۔۔۔۔ یہ تمام کارروائی دیکھنا خاصا غیر دلچسپ تھا' سو وہ واپس خیمے میں آکر کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

پریشے کو اپنی ککنگ پر ناز تھا۔ اس کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا' سو ان تمام چیزوں سے جو وہ بطور خاص بریانی بنانے کے لیے لائی تھی' اس نے بڑے پیار اور محنت سے سندھی بریانی بنائی۔ شام تک وہ اس کام سے فارغ ہوئی آگے تمام دن Add -some -hot -water ٹائپ کی یورپین چیزیں ہی کھائی تھیں' سو آج بریانی کھا کر یقیناً افق کو اچھا لگے گا' یہی سوچ کر اس نے یہ بنائی تھی۔

کھانا ڈھک کر وہ باہر چلی آئی۔ وہاں ہر طرف سخت برف کے اوپر پاؤڈر سنو کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ دو تین دن سے نئی برف نہیں گری تھی' اس لیے یہ برف پیلی سی تھی۔ وہاں خیموں سے قدرے دور ایک بڑے گرینائٹ کے پتھر پر بیٹھ کر وہ اس بے حد خوش گوار موسم کو انجوائے کرنے لگی۔

راکا پوشی پر شام اتر رہی تھی۔ ہر سو ٹھنڈی میٹھی سی چھایا تھی۔ وہ پہاڑ کی جانب پیٹھ کرکے' عادتاً کہنیاں گھٹنوں پر جمائے ہتھیلی ٹھوڑی تلے رکھے خاموشی سے ان خوب صورت مناظر کو اپنی آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے ڈھلتی شام کے سحر میں ڈوبنے لگی۔

خیموں کے باہر اس بے حد تنہا اور خاموش برفیلے میدان میں اس حد تک خاموشی تھی کہ سوئی گرنے سے بھی گونج پیدا ہوتی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ارد گرد موجود تمام دیو ہیکل سیاہ و سفید پہاڑ بالکل خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ شام کے اس پہر وہ دنیا کا حسین ترین پہاڑ اس کی راجدھانی تھا۔ سارا کا سارا دمانی اس کا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پاپا' پھوپھو' سیف' نشاء سب کسی دوسری دنیا میں رہتے تھے جہاں بلند و بانگ عمارتیں تھیں' جہاں ٹریفک کا شور اور موسیقی کی بے ہنگم آواز گونجتی تھی۔ یہ کوئی اور دنیا تھی۔ جب اس دوسری دنیا کی رات شروع نہیں ہوتی تھی' اس دنیا کی صبح ہوجاتی تھی۔ منہ اندھیرے کوہ پیما برف پر اپنے کلہاڑے مارتے ہوئے آٹھ کلومیٹر کا وہ سفر شروع کردیتے تھے' جس کی بلندیوں تک جانے کو ان کی روحیں بے کل رہتی تھیں۔ وہ آٹھ کلومیٹر جو دوسری دنیا میں گاڑی پر آٹھ منٹ میں طے ہوجاتے تھے۔ پہاڑوں پر مہینوں میں طے ہوتے تھے۔ جستجو انسان کی فطرت ہے اور یہی جستجو انسان کو ان آٹھ کلومیٹر کا سفر کرنے پر اکساتی ہے۔

وہ اسی طرح پتھر پر بیٹھی کتنی ہی دیر سوچتی رہی۔ کیا وہ سیف جیسے شخص کے ساتھ رہ سکتی تھی جو انسان نہیں ایک اسٹاک ایکسچینج تھا؟ جس کے دل کی جگہ سینے میں کیلکولیٹر نصب تھا۔ بغاوت پریشے کی سرشت میں نہیں تھی مگر صرف ایک دفعہ وہ سیف سے متعلق اپنے تمام تحفظات پاپا کے سامنے رکھے گی ضرور' وہ ان کو افق سے ملوائے گی' ان کی آنکھوں سے رشتے داروں کی اندھی محبت کی پٹی اتارنے کی کوشش ضرور کرے گی۔

وہ بدل رہی تھی۔ پہاڑ اسے تبدیل کررہے تھے۔ وہ خودکشی نہیں کرنا چاہتی تھی' سو سیف سے منگنی ختم کرنے کا فیصلہ اس نے کرلیا تھا۔ وہ الجھنوں کے سرے تلاش کرکے ان کو سلجھانے میں لگی تھی۔

اور افق' جس کی طرف سے اسے پہلے بے یقینی سی تھی' اب مکمل نہیں' تو کسی حد تک اطمینان تھا۔ پیر آنسرز کھیلتے کھیلتے اس نے اعتراف کیا تھا "محبت؟ وہ تو عشق کرتا ہے۔" اور پھر وہ خفت بھرا اظہار "ہاں' لگتی ہونا!" وہ ایک فقرہ اس کے اوپر نرم پھوار برسانے لگا۔ کتنا مان' اپنائیت اور محبت تھی اس ایک فقرے میں۔ ہاں ایک بے کلی بھی تھی۔ کہ وہ براہ راست اظہار کیوں نہیں کرتا تھا۔ تین لفظ کیوں نہیں کہہ سکتا تھا؟ شاید کبھی اس نے حنادے کو یہ بات کہی ہو پتا نہیں ان کی محبت کی شادی تھی بھی یا۔۔۔۔ یہ بات وہ افق سے نہیں پوچھ سکتی تھی' پھر۔۔۔۔

اسے ایک دم ایک خیال آیا۔ اس نے جھٹ اپنی پاکٹ سے ٹرانسیور نکالا۔ اس کا میکنزم بس دو بٹن کا تھا۔ اس نے ٹرانسمٹ بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر بعد احمت لائن پر تھا۔

"گڈ آفٹر نون فرام بیس کیمپ ڈاکٹر! کیسی ہو؟"

احمت اس کی آواز سن کر خوش ہوا تھا۔

"کیمپ ون کے باہر برف پر بیٹھی ہوں۔ باقی سب روٹ فکس کرنے گئے ہیں۔ میں نے چاول بنائے ہیں۔ تم سناؤ بیس کیمپ کیسا ہے؟"

"تمہیں یاد کررہا ہے اور خاصا اداس ہے۔ سب ٹریکرز اور پورٹرز سوائے شفالی کے' جاچکے ہیں۔ میں بور ہورہا تھا۔ اچھا کیا کال کرلیا۔ تمہاری ای میلز آئی ہوئی ہیں۔ تم نے اپنا ای میل اور پاس ورڈ میرے پورٹیبل پر محفوظ کردیا تھا۔ مگر قسم لے لو' میں نے کوئی ای میل نہیں کھولی۔"

"اوفوہ۔ کرلو چیک اور میری طرف سے جواب لکھ لو۔" وہ اسے ای میلز کے جواب لکھوانے لگی۔ پھر قدرے سوچ سوچ کر بولی۔ "احمت! ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں پوچھو ڈاکٹر تمہاری بیماری۔۔۔۔"

"اوہو۔ ضروری تو نہیں میں تم سے میڈیکل کے متعلق کچھ پوچھوں۔ میں کچھ اور پوچھنا چاہ رہی تھی۔" پھر قدرے توقف سے بولی۔ "تمہیں حنادے یاد ہے؟"

"کون حنادے؟"

پریشے کو حیرت ہوئی۔ افق نے حنادے کو اپنی بیوی بتایا تھا اور اس کا اتنا اچھا دوست اس بات سے لاعلم تھا۔

"افق کی بیوی حنادے۔"

"اچھا میں سمجھا تم "حوا" کی بات کررہی ہو۔ حضرت حوا کی' جن کو انگلش میں Eve اور ترک میں حنادے کہتے ہیں۔"

پریشے کا دل سر پیٹ لینے کو چاہا۔ اپنا نہیں' احمت کا۔

"ہاں وہی' تمہیں یاد ہے کیسی تھی وہ؟"

"خوب صورت تھی۔"

"اور۔۔۔۔؟"

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

پریشے سٹپٹا گئی۔ وہ اتنا سیدھا نہیں تھا' جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔

"وہ یونہی' افق اس کو یاد کرکے اداس ہوجاتا ہے نا۔"

"یہ تم سے کس نے کہا؟" احمت کے لہجے میں حیرت تھی۔

"افق نے۔"

"وہ مذاق کررہا ہوگا۔ وہ تو اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"مگر کیوں؟" اسے کرید ہوئی۔

"اسے کسی اور سے محبت تھی۔"

پریشے کا دل ڈوب کر ابھرا "کس سے؟"

"کیا واقعی قراقرم اور ہمالیہ کے پہاڑوں پہ پریاں اترتی ہیں؟ افق کو جانے کتنے برسوں سے ان پریوں کی تلاش تھی۔ وہ کے ٹو کے روپل فیس کی بیس کیمپ کا ٹریک بہت بار کیا کرتا تھا۔"

"کے ٹو کا نہیں' نانگا پربت کا روپل فیس ہوگا۔۔۔۔"

اس نے بمشکل "اسٹوپڈ" کہنے سے خود کو روکا۔

"ہاں وہی' وہاں بہال کیمپ میں فیری میڈوز کے درمیان' اس نے سن رکھا تھا کہ پریاں اترتی ہیں اور رات کو سیاحوں کے پاس آکر انہیں گیت سناتی ہیں۔ وہ ہر دفعہ پاکستان آنے پر روپل فیس کا ٹریک ضرور کرتا تھا۔ حالانکہ میں نے کہا بھی تھا کہ اسٹوپڈ آدمی' یہ پریاں وغیرہ کچھ نہیں ہوتیں' ایویں سیاحوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ مگر افق اور جینک تو پاگل ہیں۔ افق پریوں کو ڈھونڈنے ہر گرما میں پہاڑوں میں نکل جاتا تھا اور افق جینک کے بغیر کہیں جائے' یہ تو ہو نہیں سکتا۔"

"پھر اب جینک کیوں نہیں آیا؟"

"اس کو Tumas کے باس نے کام میں پھنسا رکھا ہے جینک بڑا خبیث آدمی ہے کہہ رہا تھا احمت دعا کرو کہیں زلزلہ' طوفان یا سیلاب آجائے میں ریلیف ایکٹوٹی کے بہانے ہی انقرہ سے نکلوں۔" احمت زور

سے ہنسا۔

"اور وہ حنا دے..... اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تو اب اس کے بارے میں اتنا حساس کیوں ہے؟" اس کے ذہن کی سوئی وہیں تھی۔

"اس کی بیوی تھی نا۔ جیسی بھی تھی، مرے ہوؤں کو کچھ نہیں کہا کرتے۔ ویسے بڑی عجیب سائیکو کیس تھی۔ بہت میک اپ کرتی تھی۔ سلمیٰ کہتی تھی، افق نے لگتا ہے کسی پیسٹری سے شادی کی ہے۔"

"اچھا۔" کچھ سوچتے ہوئے اس نے ریڈیو کو دیکھا، پھر الوداعی کلمات کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور احمت کی باتوں پر از سر نو غور کرنے لگی۔

اس کے سامنے آسمان پر سرخ و سرمئی بادلوں کے درمیان خالی جگہوں سے ڈھلتے سورج کی آخری نارنجی شعاعیں جھانک رہی تھیں۔ دور نانگا پربت کو بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا اور وہ بادل اب یقیناً قراقرم کی جانب بڑھنے لگے تھے۔

"خدا کرے یہ ہمیں بائی پاس کر کے گزر جائیں اور موسم نہ خراب ہو۔" وہ دعا کرتے ہوئے اور اوپر پہاڑ پر بار بار نگاہیں دوڑاتی ان تینوں کا انتظار کر رہی تھی۔

شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ درجہ حرارت گر رہا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل گیا تو اسے تھکے تھکے قدموں کی آہٹ اور باتوں کی آواز سنائی دی۔ وہ تینوں آگے پیچھے برف پر چلتے اس کی جانب آ رہے تھے۔ افق کے کاندھے پر رسیّوں کا آخری گچھا اور ہاتھ میں اسنو اسٹک تھی۔

"کدھر رہ گئے تھے؟ اتنی دیر سے انتظار کر رہی تھی۔" اس کے غصے کے جواب میں وہ تھکن زدہ سا مسکرا دیا۔

"اچھی لگ رہی ہو اتنی فکر کرتے ہوئے۔ اور بھی اچھی لگو گی اگر جلدی کھانا کھلا دو تو۔" وہ اس کے پاس سے گزر کر خیمے میں چلا گیا۔ ارسہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ دونوں خاصے تھک چکے تھے۔

"میں نے بریانی پکائی ہے۔" ان کے پاس اندر آ کر اس نے دبے دبے جوش سے بتایا۔

"لائیں آپ کی ہیلپ کرواؤں۔" ارسہ اس کے ساتھ کھانا نکالنے لگی۔ پریشے نے بریانی والا برتن کھولا، افق نے جھک کر چاولوں کی شکل دیکھی اور ایک سیکنڈ کو چپ سا ہو گیا۔

"چلو ذائقہ اچھا ہو گا۔" افق کا مطلب تھا کہ شکل اچھی نہیں ہے۔

"میری بریانی اور ککنگ پوری فیملی میں مشہور ہے۔ بے شک نشاء سے پوچھ لو۔" اس نے جتایا۔

"ہمارے ہاں یہ اعزاز احمت کی بیوی سلمیٰ کو حاصل ہے۔" افق نے بریانی اپنے برتن میں نکالی اور پہلا چمچہ منہ میں ڈالا، پھر اسے چبا کر نگلا۔ اس کے بعد مرغی کی بوٹی توڑنے کی کوشش کی جو ٹھیک سے گلی نہیں تھی اور کچھ سردی کا اثر بھی تھا۔ اس نے ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا اور کسی چیونگم کی طرح چبایا۔ ارسہ سے بھی نہیں بوٹی نہیں چبائی جا رہی تھی۔ پریشے بغور دونوں کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے پری! ترکی یورپ میں ہے۔"

"اور میں بھی یورپ سے آئی ہوں۔" ارسہ نے پلیٹ رکھ دی۔

"مطلب؟" پریشے نے سنجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔

"مطلب یہ کہ یورپ سے آئے ہیں، افریقہ سے نہیں۔ کچا گوشت تو صرف افریقی کھا سکتے ہیں۔"

"افق بھائی کا مطلب ہے کہ..... کچھلی پڑی ہے؟" ارسہ نے اس کے چہرے کو دیکھ کر بوکھلا کر وضاحت کی

"ہاں پڑی ہے، تمہارے پیچھے سیرینہ ہوٹل کے شیف دے کر گئے تھے نا۔" وہ اپنے حصے کی بریانی لے کر وہاں سے چلی آئی تھی۔ مطلب تھا کہ "خود پکا لو مچھلی۔"

"اگر 4800 میٹر بلندی پر کوکب خواجہ بھی بنائے گی تو اس سے اچھی نہیں بنا سکے گی۔ سارا دن لگ کر میں ان کے لیے کھانا بناتی رہی، کیا تھا اگر جھوٹے منہ ہی تعریف کر دیتا افق؟ اتنی بری تو نہیں تھی کہ اسے کچا

گوشت کہا جاتا۔" اسے سچ مچ رونا آیا تھا۔ "ٹھیک ہے، مسالے تیز، بلکہ اچھے خاصے تیز اور گوشت ٹھیک سے گلا نہ تھا، مگر چپ کر کے کھاتے رہتے میرا دل رکھنے کو۔ اتنی اسٹریٹ فارورڈنیس کی کیا ضرورت تھی؟ میں کوئی پورٹر تو نہیں ہوں جو کھانے پکاؤں۔ ٹھیک ہے، اب نہیں پکاؤں گی۔"

رات وہ اپنے خیمے سے باہر اسی پتھر پر بیٹھی اپنے جوگرز کے نیچے کریمپنز سے برف پر لکیریں سی بنا رہی تھی۔ گردن اس نے اٹھا رکھی تھی اور نگاہیں اوپر ساتویں کے چاند پر تھیں، جس کی چاندنی سے بروکا گلیشئر چمک اٹھا تھا۔ راکا پوشی پر چاند خاصا بڑا اور واضح دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسے بھی دھند سے ڈھکی اس حسین چوٹی سے عشق ہو گیا تھا اور وہ اس کو دیکھنے بہت قریب اتر آیا تھا۔

دفعتاً اس نے افق کو اپنے خیمے سے نکلتے دیکھا تو چہرے کا رخ جھٹکے سے موڑ لیا۔ چند ثانیے بعد اسے کسی کے اپنے ساتھ پتھر پر بیٹھنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔

"آہم۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ بریانی پڑی ہو گی؟" گلا کھنکھارتے ہوئے بہت معصومیت سے پوچھا گیا۔

پریشے نے رخ قدرے مزید پھیر لیا۔

"یقین کرو بریانی بہت مزے دار بنی تھی۔ اتنی لذیذ بریانی تو میں نے زندگی بھر نہیں کھائی۔ یہ شیف وغیرہ تو جھک مار رہے ہیں۔ ان کو تو تم سے سیکھنا چاہیے۔"

وہ جواباً کچھ بولے بنا چہرے کا رخ اس کی جانب سے موڑے دائیں طرف سیدھی پتھروں کی دیوار کو دیکھتی رہی جس پر چاندی کا چھڑکاؤ ہوا تھا۔

"اچھا پلیز! دیکھو ناراض تو مت ہو۔ میں نے تو تعریف کی ہے۔"

پریشے نے گردن گھما کر قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "نہیں، تم تو افریقہ سے نہیں آئے، اور تم تو کچا گوشت نہیں کھاتے۔"

"اب کچے گوشت کو میں پکا گوشت کہنے سے تو رہا۔"

"ہاں خود تو اوپر چلے گئے تھے۔ میں نے سارا دن اتنی محنت سے بریانی تیار کی اور پھر اتنی دیر تمہارا اتنی پریشانی سے انتظار کیا۔ اور تم؟"

"کاش قراقرم کی پری! تم نے اتنی دیر گوشت گلانے پر لگائی ہوتی تو....."

"افق۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اچھا پلیز رونا مت۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ دیکھو تمہارے لیے اتنا گرم سلیپنگ بیگ چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"تو نہ آتے۔"

"کیوں نہ آتا؟ مجھے پتا ہے تم نے کھانا نہیں کھایا۔ میں تمہارے لیے خود پکا کر مچھلی لایا ہوں۔" افق نے پیکٹ اسے تھمایا۔ پریشے نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں کیسے پتا میں نے بریانی نہیں کھائی؟"

"لو۔ وہ کوئی کھانے والی چیز تھی؟" وہ ہنسا۔

پریشے نے روہانسی ہو کر وہ پیکٹ زور سے اس کے کندھے پر مارا۔

"ویسے پری! انشاء کہہ رہی تھی، تم سیف سے منگنی سے انکار نہیں کر سکتیں۔ تم واپس جا کر ایک کام کرنا۔ سیف کو اپنی بنائی گئی بریانی کھلا دینا۔ وہ خود ہی رشتہ توڑ جائے گا، لکھ کر رکھ لو۔" وہ ہنسے جا رہا تھا۔

"میری بریانی کے بارے میں تم نے ایک لفظ اور کہا، تو میں تمہیں یہاں سے دھکا دے دوں گی۔ اور رہا منگنی کا سوال، تو وہ میں ویسے ہی ختم کر دوں گی۔"

وہ ہنستے ہنستے رک گیا، اور خوش گوار حیرت سے اسے دیکھا۔ "وہ کیوں؟"

"مجھے ٹام کروز نے پرپوز کیا ہے، اس لیے۔" وہ جل کر بولی۔

وہ پھر سے ہنس دیا۔ "ہاں، اچھا آدمی ہے، کر لو شادی۔"

"ہاں، تمہیں قتل کر کے اس سے ہی شادی کروں گی۔" وہ غصے سے کہہ کر تیزی سے اپنے خیمے میں چلی

گئی۔

☼ ☼ ☼

"13 اگست 2005ء

خیمے کی گور ٹیکس کی دیوار سے ٹیک لگائے، گھٹنوں پر کتاب رکھے وہ مطالعے میں منہمک تھی۔ قدرے فاصلے پر ارسہ اسی انداز میں بیٹھی کاغذوں کا پلندہ گود میں رکھے تیز تیز قلم چلا رہی تھی۔ خیمے کی کپڑے کی دیوار میں شفاف چوکور چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ جس پر برف کے ذرات جگمگا رہے تھے۔ دوپہر ہونے کے باوجود باہر اندھیرا سا تھا۔

بادل راکا پوشی پر چھا چکے تھے۔ موسم سخت خراب تھا۔ برف کا طوفان خاصی دیر تک چنگھاڑتا رہا تھا اور اب برف باری ہو رہی تھی۔ احمت نے بتایا تھا کہ بیس کیمپ میں آج بارش ہو رہی تھی اور رات برفانی جھکڑ چلنے کے باعث بیس کیمپ کا کچن ٹینٹ اڑ کر قریبی گلشیئر پر جا گرا تھا۔

افق اپنے خیمے سے نکل کر دھند میں چلتے ہوئے ان کے خیمے میں داخل ہوا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اس کے آنے سے خیمے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ پریشے نے کتاب پر سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ جو نیچے میٹرس بچھا کر، رک سیک کا تکیہ بنا کر نیم دراز ہو چکا تھا۔ وہ پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"لائبریری میں بولنا منع ہے۔" صفحے پر نگاہیں جمائے پریشے نے اطلاع دی۔

"میں اتنے خراب موسم میں پورے چھ قدم چل کر تمہارے خیمے میں آیا ہوں، اور تم اتنی بے مروت ہو؟"

ارسہ نے قدرے اکتا کر سر اٹھایا، اور پھر بڑبڑاتی ہوئی کاغذ پر جھک گئی۔ "میں سوچ رہا ہوں اگلے سال بطور گائیڈ کسی ایکسپیڈیشن کے ساتھ ایورسٹ جاؤں۔ بندے کو اس فیلڈ میں کچھ کمانا بھی چاہیے۔ انجینئرنگ میں میرا دل نہیں لگتا۔ وہ TUMAS کا باس مجھے برداشت بھی اسی لیے کرتا ہے کہ میرے باپ کا دوست ہے۔"

"اُفوہ افق بھائی! کتنا بولتے ہیں آپ۔ کوئی کام نہیں کرنے دیتے۔" ارسہ نے جھنجلا کر اپنے کاغذ سمیٹے اور بڑبڑاتی ہوئی خیمے سے باہر نکل گئی۔ پریشے نے کتاب سے نگاہیں ہٹا کر حیرت سے اسے جاتے دیکھا۔ افق مسکرا دیا۔

"اسکاٹ فشر سے معذرت کے ساتھ۔"

"Its not attitude. Its altitude"

"اس ایلٹی ٹیوڈ پر بندہ تھوڑا بہت چڑچڑا تو ہو ہی جاتا ہے۔ میں مائنڈ نہیں کرتا۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا اگلے مارچ کی جب میں ایورسٹ ایکسپیڈیشن لیڈ کروں گا۔ تم سن رہی ہو؟"

"نہیں۔" وہ کتاب پڑھتی رہی۔

"تو پھر سنو، وہ بریانی پھر سے کھلاؤ نا۔"

"زہر نہ کھلاؤں؟" اس نے پڑھتے پڑھتے ایک طنزیہ نگاہ سامنے بیٹھے افق پر ڈالی۔

"تمہارے ہاتھ سے زہر بھی کھا لوں گا۔ تم کھلاؤ تو۔"

"کیا پاکستانی فلمیں بہت دیکھنے لگے ہو؟"

"پشاور میں ایک پشتو فلم دیکھی تھی۔ سمجھ میں تو نہیں آئی مگر اس کی ہیروئن کنگ فو بہت اچھی کرتی تھی۔"

"کنگ فو؟ جیسے تمہیں پتا ہی نہیں کہ وہ ڈانس تھا۔ بنو مت۔" وہ پھر سے مطالعے میں منہمک ہو گئی۔ وہ جھنجلا گیا۔

"یہ کتاب مجھ سے زیادہ اچھی ہے کیا؟"

"ہاں بالکل۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر افق کے خفا تاثرات دیکھ کر ہنس دی۔ "خفا ہو گئے کیا؟" پریشے نے کتاب ایک طرف ڈال دی۔

"پری!" وہ ایک دم سچ مچ اداس نظر آنے لگا۔ "مجھے آنے بہت یاد آ رہی ہے۔"

ترک اپنی ماں کو آنے بولتے تھے۔

"ہوں۔ مجھے بھی پاپا اور نشاء لوگ بہت یاد آ رہے ہیں۔ پتا نہیں پہاڑوں پر پیچھے رہ جانے والے لوگ کیوں اتنے یاد آتے ہیں۔"

افق اٹھ کر بیٹھ گیا اور پریشے کے مقابل خیمے کی دیوار سے ٹیک لگا لی۔ کھڑکی سے باہر گہرا سرمئی آسمان نظر آ رہا تھا۔

"کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے، میں کوہ پیمائی ترک کر دوں۔ آنے کو یہ سب اچھا نہیں لگتا۔" وہ کھڑکی پر گرتی، جمتی برف کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میرے تین بھائی پہاڑوں میں ہلاک ہوئے تھے۔ ان کے بعد میری ماں بہت اکیلی اور دکھی ہو گئی ہے۔ وہ اکثر مجھے کہتی ہے۔ افق پہاڑوں میں نہ جایا کرو۔ میرے بیٹے پہاڑوں سے لوٹ کر نہیں آتے۔" تب میں سوچتا ہوں کہ صرف آنے کے لیے یہ تمام کام ترک کر دوں، آرام سے جاب کروں، ہینڈسم سیلری ہاتھ میں ہو اور اپنے ماں، باپ کے ساتھ رہوں۔ تب میرا دل یہ سب کچھ چھوڑ دینے کو چاہتا ہے۔" کچھ دیر پہلے کی شوخی و تازگی اب اس کے چہرے سے مفقود تھی۔

"تو پھر چھوڑتے کیوں نہیں ہو یہ سب؟"

وہ پژمردگی سے مسکرایا۔ "جنون ہے یہ پری۔ ایڈکشن ہے پہاڑوں کی۔ کوہ پیمائی چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مجھے ہمالیہ سے عشق ہے۔ مجھے بچپن سے ہی شوق تھا۔ "بگ فائیو" سر کرنے کا۔ ایورسٹ کے ٹو۔ Lhoese. kang chenJunga اور Makalu میں گھنٹوں تصور کرتا تھا کہ وہ لمحہ کیسا ہو گا، جب میں ان سب کو سر کر لوں گا۔ وہ لمحہ جب تمام خواب پورے ہو جائیں گے؟ پر جب دو سال پہلے میں نے کے ٹو کی چوٹی پر قدم رکھا تو جانتی ہو کیا ہوا؟ میرے خواب اچانک ہی خالی ہو گئے۔ سارے خواب، خواہشات سب ختم ہو گیا۔ ہر خواب پورا نہیں ہونا چاہیے پری! ورنہ زندگی میں ایک عجب خالی پن در آتا ہے۔ کچھ ادھورا بھی رہنا چاہیے۔ میری اک آخری آرزو ہے۔ دنیا کے حسین ترین پہاڑ پر کھڑے ہو کر کنکورڈیا اور بلتورو کی چوٹیاں دیکھنے کی۔ پھر میں کبھی ان پہاڑوں میں نہیں آؤں گا۔"

"اگر یہ آرزو تشنہ رہ گئی پھر بھی؟"

وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "ہاں پھر بھی کیونکہ جس کی جستجو تھی، وہ مل گئی ہے۔" پریشے کا دل زور سے دھڑکا۔

"میں نے سن رکھا تھا کہ ہمالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں پر پریاں اترتی ہیں۔" وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں نانگا پربت بیس کیمپ کے ٹریک میں بیال کیمپ سے....."

"بیال کیمپ سے فیری میڈوز تک کا سفر بہت بار کرتے تھے، کیونکہ ان دو جگہوں کے درمیان شام ڈھلے پریاں مدھر نغمے گاتی ہوئی اڑتی پھرتی ہیں اور تمہیں ان کو دیکھنے کی آرزو تھی۔ ہے نا؟" اس نے فقرہ مکمل کیا۔

شہد رنگ آنکھوں میں حیرت در آئی۔ "تمہیں کیسے پتہ؟"

پریشے نے مسکراتے ہوئے شانے اچکا دیے اور کتاب اٹھا لی۔ "جس کی جستجو کی جائے اسے اول سے علم ہوتا ہے، بے وقوف کوہ پیما۔ کھوجنے والا تو دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے، مگر جنہیں کھوجا جاتا ہے نا، وہ ایک ہی راستے پر صدیوں نگاہیں جمائے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔" اپنا مطلوبہ صفحہ پلٹتے ہوئے وہ کتاب پر سر جھکائے کہہ رہی تھی۔ ایک دلنشین مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری تھی۔

کتنی ہی دیر تک تو وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ بہت کچھ کہہ کر بھی وہ کچھ نہ کہہ سکا تھا، اور پریشے نے دو فقروں میں دشت آرزو سمیٹ کر رکھ دیا تھا۔ پھر وہ جیسے کھل کر مسکرا دیا۔

"یہاں سے جا کر تمہارے فادر کے پاس چلیں گے، ٹھیک؟"

اس کی جھکی پلکوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اس کے سامنے بیٹھا شخص بہت کچھ کہہ گیا تھا، مگر تین لفظ، جذبوں کی شدت، کوئی اظہار، کوئی اعتراف نہیں کرتا تھا۔ پریشے نے پلکیں اٹھا کر قدم یونانی دیومالا کے اس

کردار کو دیکھا جو جانے اس کی قسمت میں لکھا بھی تھا یا نہیں۔

"یہاں سے جاکر؟ تمہیں یقین ہے ہم یہاں سے زندہ واپس جائیں گے؟" وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی، مگر لبوں سے یہی پھسل پڑا۔

افق نے شانے اچکا دیے۔ "راکا پوشی بہت خوبصورت ہے، اور جو خوبصورت ہوتے ہیں ان سے زیادہ ظالم بھی کوئی نہیں ہوتا۔"

"مگر میں مرنا نہیں چاہتی۔ اب..... اب زندہ رہنے کو دل کرتا ہے افق! زندگی اب بہت حسین لگتی ہے۔" وہ کہیں کھو سی گئی۔ افق اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

"تم فکر کیوں کرتی ہو پری! تم اکیلی نہیں ہو، میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔"

پری نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "میں تین ہفتے پہلے تک تمہیں جانتی بھی نہیں تھی اور یوں لگتا ہے کہ جیسے تم سے بڑھ کر اپنا اور کوئی نہیں ہے۔ جانے کیوں اب یقین سا ہے کہ اگر میں گری تو تم مجھے تھام لو گے۔"

افق نے بہت عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔ "اور اگر میں گرا تو؟ تو تم بھی حنادے کی طرح مجھے چھوڑ جاؤ گی؟"

وہ سناٹے میں رہ گئی۔ وہ اس پل اتنا اجنبی اور سرد مہر لگا تھا کہ وہ چند لمحوں تک تو کچھ کہہ ہی نہیں سکی۔ پھر افق اس کے پاس سے اٹھ کر تیزی سے خیمے سے نکل گیا، مگر وہ اسی طرح اسی جگہ کو دیکھتی رہی، جہاں تھوڑی پر قبل وہ بیٹھا تھا۔

کھڑکی پر برف ابھی تک گر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

14 اگست 2005ء

پریشے نے آہستگی سے خیمے کا پردہ سرکایا اور اندر جھانکا۔ وہ اپنے سلیپنگ بیگ میں سو رہا تھا۔ وہ دبے قدموں اندر آگئی۔ خیمے کے فرش پر اس کے قدموں سے آہٹ ہوئی، مگر وہ بے سدھ سوتا رہا۔

رات ارسہ نے اسے بتایا تھا کہ افق نے صبح دو بجے اٹھانے کی تاکید کی تھی۔ پریشے دو بجے کا الارم لگا کر سو گئی تھی۔ نیند بمشکل ہی آئی تھی۔ ساری رات ارسہ کی کھانسی سنتے گزری تھی۔ اب دو بجنے میں دس منٹ پہلے ہی وہ اسے جگانے آئی تھی، مگر وہ سوتے ہوئے اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ وہ خاموشی سے اس کے سرہانے دوزانو بیٹھ گئی۔ "راکاپوشی 2005ء" کی گرے ٹوپی نے اس کے بھورے بالوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اب اس کی ہیل ٹو طیب اردگان والی کیپ اسے نظر نہیں آئی تھی۔

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی، اس میں اس کی نیند میں خلل ڈالنے کی ہمت نہیں تھی، سو اسے بیدار کیے بغیر وہ خاموشی سے اس کے خیمے سے نکل آئی۔

باہر آسمان سیاہ، مگر صاف تھا۔ برف باری گھنٹوں ہوئے رک چکی تھی۔ خیمے کے گور ٹیکس پر چند انچ برف جمی تھی۔ دور سیاہ آسمان پر تاحدِ نگاہ جھلملاتے تارے بکھرے تھے، جو ایک صاف اور کھلے کھلے دن کی پیشن گوئی کر رہے تھے۔ ہمالیہ کا آسمان پل پل رنگ بدلتا تھا۔

اپنے خیمے میں آکر وہ افق کی جگہ خود ناشتہ بنانے لگی۔ یوں لگتا تھا اس گہرے اندھیرے میں وہ سحری کی تیاری کر رہی ہو اور وہ رمضان کے دن ہوں۔

دروازے پر آہٹ ہوئی، پری نے بے اختیار اس طرف دیکھا۔ وہ عجلت میں اندر داخل ہو رہا تھا۔ آنکھیں سرخ اور بوجھل سی تھیں۔

"مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟" اس کے قریب بیٹھتے ہوئے افق نے ماچس اس کے ہاتھ سے لے لی۔ پریشے نے بغور اسے دیکھا۔ اب وہ شناسا لگ رہا تھا۔ (کبھی کبھی اتنے اجنبی کیوں ہو جاتے ہو افق؟ کیوں اس کو بھلا نہیں دیتے؟ کیوں وہ ہر پل میرے اور تمہارے درمیان کسی دیوار کی طرح آجاتی ہے؟ کیوں خواب میں آکر بھی ستاتی ہے، حالانکہ وہ تو تمہارے خوابوں میں کبھی بھی نہیں تھی۔) اسے افق سے پچھلی شام کے متعلق کوئی سوال نہیں کرنا تھا۔ وہ جانتی تھی، وہ اس سے کبھی یہ بات نہیں پوچھے گی۔ ایک دن افق خود بتائے گا۔

وہ اب چولہے کی گیس کھول کر، بڑی لاپروائی سے تیلی جلا کر چولہے میں جھونک رہا تھا۔ آگ تیزی سے بھڑک اٹھی۔

"اتنی بے احتیاطی سے کیوں چولہا جلا رہے ہو؟" اس کی بے احتیاطی دیکھ کر پریشے کو ٹوکنا ہی پڑا۔

"چولہے کو چھوڑو۔ رسیوں کی فکر کرو۔ خدا کرے وہ برف میں دب کر گم نہ ہو گئی ہوں۔"

رسیوں کی خیر ہو گئی۔ ان پر برف گری ضرور تھی، مگر وہ جلد ہی نکل آئیں۔ رات کے اس پہر راکاپوشی بہت خاموش تھا۔ وہ آگے پیچھے فکسڈ روپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پریشے اپنے جوگرز کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اگلا قدم برف پر رکھتی، برف کی تہہ ایک انچ دب جاتی۔ ایک لمحے کو اس کا سانس رک جاتا، مگر یہ احساس کے اس کے نیچے ٹھوس زمین ہے اور وہ کسی "کریوس" کے اوپر نہیں کھڑی بہت فرحت بخش ہوتا تھا۔

اونچے پہاڑوں اور گلیشیئرز میں کئی جگہ دراڑیں ہوتی ہیں، جو اندر سے کئی سو فٹ گہری ہوتی ہیں۔ بعض جگہوں پر یہ سامنے واضح ہوتی ہیں۔ مگر عموماً؟ ان کے دہانے پر برف باری کے باعث چند انچ موٹی برف کی تہہ جم جاتی ہے۔ ایسے میں یہ دراڑیں برف کا نقاب اوڑھے چھپ جاتی ہیں۔ برف کے نقاب پر پاؤں پڑنے کی صورت میں برف فوراً پھٹتی ہے اور کوہ پیما اندر گر جاتا ہے۔ ان دراڑوں، شگاف یا کریوس سے عموماً لاشیں بھی نہیں نکالی جا سکتیں۔

اس وقت بھی فکسڈ روپ پر خود کو "جومر" (ایک ایلومینیم کا بیضوی آلہ جس کو فکسڈ روپ اور کمر کے گرد بندھی کلائمنگ ہارنس سے باندھا جاتا ہے۔) کی مدد سے رسی پر کلپ آن کرتے وقت اسے آس پاس سرمئی برف میں ہلکی ہلکی کریز سے واضح ہوتے کریوس نظر آ رہے تھے۔ وہ جومر کو اوپر چڑھاتے ہوئے اس روز ساری چڑھائی میں گنگناتی رہی تھی۔

"آؤ بچو! سیر کراؤں تم کو پاکستان کی، جس کی خاطر ہم نے دی قربانی لاکھوں جان کی۔ پاکستان زندہ باد.....“

افق نے مطلب پوچھا تو اس نے کندھے اچکا کر کہہ دیا۔ "آج ہمارا انڈیپنڈنس ڈے ہے۔ میں اس منا رہی ہوں۔ اس لیے تم اپنا منہ بند رکھو۔" وہ تپا نے والے انداز میں مسکرایا۔

"ٹھیک ہے، مگر اب تو سنا ہے بھارت سے دوستی ہو رہی ہے۔ امن معاہدے کیے جا رہے ہیں۔"

"سانپوں سے امن معاہدے نہیں کیے جاتے۔"

اس کی حب الوطنی اچھی خاصی جاگ اٹھی تھی۔ کیمپ ٹو تک وہ نظریہ پاکستان کے متعلق اس طرح کے کئی ارشادات سناتی آئی۔ آج چڑھائی خاصی مشکل اور بے حد vertical تھی۔ برف کی کنڈیشن خراب تھی۔ وہ بے حد نرم اور پکڑنے پر پگھلنے اور ٹپکنے لگتی تھی۔

کیمپ ٹو پر برف کھود کر خیمے نصب کرنے کا سارا کام فرید اور افق نے کیا تھا۔ پریشے نے خیمے لگ جانے کے بعد ان تمام کے اندر چند جھنڈیاں لگائی تھیں۔ جو وہ اسلام آباد سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ تو بڑا جھنڈا بھی لگانا چاہتی تھی، مگر شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ ہوا میں تیزی آگئی تھی۔ گرم گور ٹیکس کے ہیٹ لائنوز نے خیموں کے اندرونی ماحول کو خاصا وارم رکھا ہوا تھا، اس کے باوجود وہ تیز چلتی برفیلی ہوا اتنی سرد تھی کہ خون منجمد ہونے لگا تھا۔ اوپر ویسے بھی آکسیجن بے حد کم تھی۔ کیمپ ٹو تقریباً 6200 میٹر پر نصب تھا اور اس بلندی اور موسم میں وہ باہر جا کر بڑا جھنڈا لگانے کا خطرہ نہیں مول لے سکتی تھی، سو رات کا کھانا کھائے بغیر، بس چائے پی کر سو گئی۔ اس ایلٹی ٹیوڈ پر ویسے بھی بھوک مر جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

15 اگست 2005ء

وہ دونوں لاؤنج میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سیف

کچھ دیر خاموش رہا، پھر بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا۔

"پری! میں جانتا ہوں تمہیں یہ سن کر دکھ ہوگا، مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے دوست کی بہن کو پسند کرتا ہوں، اور یہ منگنی میں نے اپنی ماں کی خواہش پر کی تھی۔ اب بہت ہو چکا، میں یہ منگنی توڑنا چاہتا ہوں۔ تم بتاؤ، تم کیا کہتی ہو؟"

اور وہ کیا کہتی؟ اس کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"بتاؤ پری! میں ماموں سے بات کروں؟" وہ اس کے جواب کا منتظر تھا۔ پریشے کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"سیف تم پلیز، یہ منگنی توڑ دو۔ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔" وہ کہنا چاہتی تھی، مگر جانے کیوں حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"اٹھ بھی جائیں پری آپی! کب تک سوتی رہیں گی؟" کسی نے اسے جھنجوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور اردگرد دیکھا۔

اس کا لاؤنج اور سیف، سب کچھ ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ وہ ان سے ہزاروں میل دور راکاپوشی کے برفیلے میدان میں نصب ایک خیمے کے اندر لیٹی تھی۔

"خدایا!" اس نے اپنی کنپٹی سہلائی۔ خواہشات اب خواب بن کر ستانے لگی تھیں۔

پھر وہ خاموشی سے تیار ہونے لگی۔ تیار ہو کر اس نے ناشتہ کیا، اور پھر آخر میں اپنے بوٹس کے نیچے کریمپنز چڑھائے اور گلیشیئر گاگلز لگالیں۔ ارسہ قریب ہی بیٹھی کاغذوں کا پلندہ اپنے رک سیک میں ٹھونسنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"میرے بیگ میں رسّی ہے۔ اس لیے یہ پورے نہیں آ رہے۔ آپ یہ اپنے والے میں ڈال لیں۔"

اس نے ارسہ کے ہاتھ سے کاغذ لے لیے۔ سامان سمیٹ کر کھڑی ہوئی تو گود سے ٹرانسیور کی دو بیٹریاں گریں۔ وہ انہیں مٹھی میں دبوچے باہر نکل آئی۔

آسمان ابھی تک سیاہ تھا۔ رات تمام نہیں ہوئی تھی۔ پچھلی پوری شام سونے کے باعث وہ خاصی فریش تھی، آسمان بھی صاف اور تارے دور دور تک جگمگا رہے تھے۔ آج بھی یقیناً ایک صاف دن ہوا تھا۔

خیمے کے باہر برف پر افق اور فرید تیار کھڑے تھے۔ بس افق جھک کر جوتوں کے تسمے بند کر رہا تھا۔ وہ اس کے عقب میں آئی اور اس کی پشت پر بندھے رک سیک کے ایک خانے میں دونوں بیٹریاں ڈال کر زپ بند کر دی۔ صرف بیٹری رکھنے کو اس میں دوبارہ اپنا بیگ کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔

"جناب! ایک بات کہوں؟" سر پر ٹوپی درست کرتے ہوئے فرید نے افق کو مخاطب کیا۔ "جناب میری بات مانو تو آگے نہ جاؤ۔ یہ شمال مغربی رج آج تک کوئی سر نہیں کر سکا۔"

"افق ارسلان کر لے گا۔ تم فکر مت کرو۔" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ پریشے نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ حد سے زیادہ خود اعتماد اور ہٹ دھرم تھا۔

"جناب موسم خراب ہو جائے گا۔"

"آسمان تو صاف ہے۔"

"جناب وہ شمال میں ستاروں کا جھنڈ دیکھ رہے ہو؟ یہ ستارے میں نے کبھی اس مہینے میں دومانی کے آسمان پر نہیں دیکھے، یہ اچھی پیش گوئی نہیں کرتے۔ آپ دومانی کو ہم ہنزو کٹر سے زیادہ نہیں جانتے۔"

"ہمارے پاس اتنا فیول اور گیئر نہیں ہے کہ ہم بیٹھ کر انتظار کرتے رہیں۔" پینٹ جھاڑتے ہوئے وہ سیدھا ہو گیا۔ فرید بھی چپ ہو گیا۔

وہ اسی طرح خاموشی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ اچانک اس کے سر کے پیچھے کوئی نوکدار چیز زور سے لگی، وہ گھبرا کر پلٹی، تین پہاڑی کوے (raven) نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اس نے زور سے سر پر ہاتھ مارا۔ وہ اڑ گئے۔ اس نے ان کو دیکھتے ہوئے سر کا پچھلا حصّہ سہلایا، جہاں انہوں نے چونچیں ماری تھیں۔

"کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟" افق قدرے فکرمندی سے اس کے قریب آیا۔ وہ اسی طرح عجیب نگاہوں سے دور سیاہ آسمان پر اڑتے کوؤں کو دیکھتی رہی۔

"پریشے! کیا ہوا؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

وہ چونکی، پھر سر جھٹکا۔ "کچھ نہیں۔ یونہی کچھ یاد آ گیا تھا۔"

اس نے دوبارہ سر جھٹکا اور بھلانے کی کوشش کی جو یاد آیا تھا۔ ٹھیک چھ سال پہلے جس دن اس کی مما کی ڈیتھ ہوئی تھی، اس روز بھی صبح جاگنگ کے دوران اس پر یونہی کوؤں نے حملہ کر دیا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی ریون تھے۔ پتا نہیں کیوں، اس کو عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔

ارسہ کان پر فون لگائے بولتے ہوئے خیمے سے باہر آئی۔ "جی جی بالکل ہمیں کیمپ تھری پہنچ کر بابا سے بات کر لوں گی۔ جی شیور۔ اوکے ٹیک کیئر۔ لو یو مام۔ بائے۔" اس نے سیٹلائٹ فون بند کر کے پری کو تھمایا اور خود سر پر ہیلمٹ جوڑنے لگی۔ اس وقت پریشے کا دل چاہا کہ وہ بھی پاپا سے بات کر لے، مگر اس کے پاس ان کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے فون بیگ میں رکھ دیا۔

"ہمیں جلد از جلد کیمپ تھری پہنچنا ہے۔ آج رسّیاں آپس میں نہیں باندھیں گے، کیونکہ ایسے ہماری رفتار سست ہو جائے گی۔ چلو نا پری! تم کیا سوچ رہی ہو؟" اسے کلائمنگ ہیلمٹ ہاتھ میں پکڑے گم صم کھڑے دیکھ کر وہ جاتے جاتے پلٹا۔ اس نے قدرے سوچتی، متذبذب نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"افق۔۔۔۔ فرید ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آسمان پر ستاروں کا جھنڈ اور یہ کوؤں کا حملہ، یہ بری علامتیں ہیں۔"

"کیا ہیری پوٹر بہت پڑھنے لگی ہو؟" وہ مسکرایا۔

"افق میں سیریس ہوں۔ یہ ان کلائمبڈ رج ہے۔ موسم کو دیکھو، چند گھنٹوں تک برف باری شروع ہو گئی تو۔۔۔۔؟"

"میں انقرہ سے ہنزہ اس لیے نہیں آیا تھا کہ برف باری سے ڈر کر بیس کیمپ میں چھپ جاؤں۔"

"پتا نہیں کیوں، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میری چھٹی حس ہے یا کچھ اور، میرا خیال ہے ہمیں آج سفر نہیں کرنا چاہیے۔ آج کے دن کا آغاز ہی بدشگونی سے ہوا ہے۔" جانے کیوں اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

وہ چند لمحے بے حد سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"بدھ مت کے بھکشو نیپال آنے والے سیّاحوں کے متعلق کہا کرتے تھے۔ سیّاحوں کو جانے دو جہاں ان کا دل کرے، مگر چوٹیاں نہیں کہ وہ بدھا کا مسکن ہوتی ہیں۔ بدھا کے پیروکار ایورسٹ کو (chomolungma) چومولنگما۔ یعنی Mother godess of the world اور "ساگرماتا" کہا کرتے تھے اور آج بھی یہی کہتے ہیں۔ چھ نسلوں پہلے کے شرپاز ساگرماتا کی چوٹی پر قدم رکھنا گناہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیالات تب بدلے جب تینزنگ نے سر ایڈمنڈ ہیلری کے ساتھ ایورسٹ سر کیا۔ یقین کرو اس وقت اتنی توہم پرست باتیں کرتی تم مجھے بدھ مت کی کسی مٹھ میں رہنے والی راہبہ لگ رہی ہو۔" اس کا انداز اتنا قطعی اور منطقی تھا کہ وہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ حالانکہ کہنا چاہتی تھی کہ مجھے توہم پرست کہو یا جو بھی، میں اور آگے نہیں جانا چاہتی۔

"پری آپی! اگر ہم یہ رج سر لیں تو ہمارا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں لکھا جائے گا۔"

ان دونوں نے کسی بات کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ اب اگر وہ ان کے ساتھ نہ چلتی تو وہ اسے اس کی بزدلی شمار کرتے۔ وہ کسی ریکارڈ بک میں نام نہیں لکھوانا چاہتی تھی، وہ ادھر راکاپوشی سر کرنے بھی نہیں آئی تھی، وہ تو خود تسخیر ہو کر اپنے فاتح کو لینے آئی تھی اور اس وقت جس طرح اس کا دل کسی انہونی کے باعث گھبرا رہا تھا، وہ بالکل بھی جانا نہیں چاہتی تھی، مگر۔۔۔۔ ٹھہرنا اس کی انا کے خلاف تھا۔

وہ ان کے آگے چل رہا تھا۔ اس کے قدموں سے بننے والے نشانات پر قدم رکھتی وہ سر جھکائے خاموشی سے اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا اور قدموں کے نیچے موجود گلیشیئر کے اندر سے سلائیڈنگ کی آوازیں بخوبی سنائی دے رہی

تھیں۔

اس کی مسلسل خاموشی محسوس کر کے وہ کہنے لگا۔

"ارسہ! تمہارے ناول کا نام کیا ہوگا؟ دی راکاپوشی کلائمب؟ یا پھر "راکاپوشی دی ان کلائمبڈ رج یا پھر ان ٹو تھِن ایر آف راکاپوشی۔"

وہ مشہور کتابوں کے نام بگاڑ رہا تھا۔ ارسہ ہنس دی۔

"خیر' میرے ناول کا نام خاصا مختلف ہے۔"

"کیا ہے؟"

"جب چھپ جائے تو پڑھ لیجئے گا۔" ارسہ اپنے ناولز کے متعلق خاصی شرمیلی تھی۔

وہ ہنوز خاموشی سے جھک کر برف پر آئس ایکس مارتے ہوئے چل رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے بری کی بات نہیں مانی' سو اس کا موڈ ٹھیک کرنے کو پوچھنے لگا۔

"کھانسی ٹھیک ہے تمہاری؟ تم کل شام نیند میں کھانس رہی تھیں۔"

"ہاں۔ اب ٹھیک ہے۔" وہ مختصراً" کہہ کر چپ ہو گئی۔

"موسم صاف ہو تو راکاپوشی کی چوٹی سے میلوں' دور تک پھیلے پہاڑی سلسلے نظر آتے ہیں۔" وہ اپنے تئیں اسے Summit کرنے کی ترغیب دلا رہا تھا۔

"اچھا۔"

"میں تو یہاں اس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر کنکورڈیا اور بلتورو کی چوٹیاں دیکھنے ہی آیا ہوں۔"

وہ اسے کیا بتاتی کہ جس پہاڑ کے حسن کی وہ دیوانی تھی' آج پہلی بار اسے اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ (خدا کرے "برو" سوتا رہے اور اسے علم نہ ہو کہ کوئی دبے قدموں اس کی اقلیم میں داخل ہو رہا ہے۔)

وہ نیچے برف کو بغور دیکھتی احتیاط سے قدم رکھ رہی تھی۔ برف کے ایک قطعے پر وہ پاؤں رکھنے ہی والی تھی کہ ایک دم اس نے قدم چند فٹ آگے رکھتے ہوئے اس ٹکڑے کو پھلانگا' پھر مڑ کر بغور اس جگہ کو دیکھا۔

یونہی اسے شک سا ہوا تھا کہ اس کے اندر کریوس [illegible] تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ اس سے چند قدم آگے تھا' اسے رکتے دیکھ کر خود بھی رک گیا۔

"کچھ نہیں۔ تم ایک بات تو بتاؤ۔" وہ سر جھٹک کر دوبارہ چلنے لگی۔ ہوا قدرے تیز ہو گئی تھی اور ہلکی ہلکی برف گرنے لگی تھی۔ اس نے ہیڈ لیمپ آن کر لیا۔ "راکاپوشی کی چوٹی سے کون کون سے پہاڑ نظر آتے ہیں؟"

"بہت سے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً" کے ٹو یا چھکوری۔" چھکوری بلتی زبان میں پہاڑوں کے بادشاہ کو کہتے تھے۔

"اور؟"

"اور میشربروم اور گیشربروم کی چوٹیاں۔"

"اور؟"

"اور براڈپیک اور کنکورڈیا کے دوسرے پہاڑ۔"

"اور؟"

"راکاپوشی سلسلے کے دوسرے پہاڑ' ہراموش اور دوبانی۔"

"اور؟"

"اور نانگاپربت۔"

"اور؟"

"فکر نہیں کرو۔ تمہارا گھر نہیں نظر آتا۔" اس کی مسلسل "اور۔ اور" کی تکرار پر وہ چڑ کر بولا۔

وہ بدمزہ سی ہو گئی۔ "ہر ٹائم سڑے رہا کرو تم۔"

"اچھا۔" وہ مسکراتے ہوئے پلٹا' پھر دستانے والا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا' جسے پریشے نے آگے بڑھ کر تھام لیا۔ افق نے اس کا ہاتھ قدرے کھینچ کر اسے قریب کیا۔ "یہ اس لیے کہ اگر گریں تو اکٹھے گریں۔"

وہ اتنی سنجیدگی سے بولا کہ پریشے کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ہنستے ہنستے اس نے سر کو پیچھے جنبش دی۔ قریباً" تین میٹر کے فاصلے پر ارسہ آ رہی تھی۔ اس کا ہیڈ لیمپ آف تھا۔ اس کے عقب میں فرید تھا۔ اس نے [illegible]

واپس موڑلی۔ وہ اور افق ہاتھ تھامے چاندنی میں نہائے راکاپوشی پر قدم بڑھانے لگے۔

اسی اثناء میں اس کے عقب میں دھماکہ ہوا۔ وہ دونوں گھبرا کر پلٹے۔ پیچھے میلوں دور تک چاندنی سے چمکتی برف پھیلی تھی اور چند میٹر دور ایک لمبا سا گڑھا تھا۔ پہلے تو اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک لمحے میں کیا ہوا ہے اور جب سمجھ میں آیا تو.....

"اوہ میرے خدا ..... ارسہ کریوس میں گر گئی ہے۔" وہ بوکھلا کر واپس بھاگی۔

"ارسہ..... ارسہ!" وہ دوڑتے ہوئے گڑھے کے قریب آئی۔ گڑھے کے اندر گہرا اندھیرا تھا۔

"ارسہ..... تم ٹھیک ہو؟" گڑھے کے قریب دوزانو ہو کر اس نے اندر جھانکا۔ وہاں مہیب سناٹا اور تاریکی تھی۔ اس کو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔

افق بھاگتا ہوا اس تک آیا۔ فرید چند قدم دور تھا۔

"افق کچھ کرو۔ پلیز افق۔ وہ گر گئی ہے..... اسے باہر نکالو۔" افق کا بازو جھنجوڑتے ہوئے اس کے لبوں سے بے ربط فقرے ادا ہو رہے تھے۔

"میں کرتا ہوں کچھ۔" اس نے اپنی ہیلمٹ پر لگی ٹارچ بلب سے گڑھے میں روشنی ڈالی۔ فرید بھی اندر روشنی کرنے لگا۔ اب وہ دونوں اسے آوازیں دے رہے تھے۔ "ارسہ..... تم ادھر ہو؟ ارسہ جواب دو۔" وہ اسے پکارتے رہے۔ ہیڈ لیمپ کی روشنی کریوس میں ڈالتے رہے' مگر اندر چند میٹر برف کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پریشے کے جسم سے جان نکل رہی تھی۔ وہ جواب کیوں نہیں دے رہی۔ وہ بولتی کیوں نہیں ہے؟ شاید اس سے بولا نہ جا رہا ہو۔ وہ ٹھیک ہو گی۔ اسے کچھ نہیں ہوا ہو گا۔ ابھی افق اسے باہر نکال لائے گا۔ وہ خود کو تسلیاں دے رہی تھی' مگر اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

"ارسہ پلیز جواب دو۔ تم ٹھیک ہو؟" وہ کتنی ہی دیر اسے آوازیں دیتا رہا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا اور آواز پھٹ رہی تھی' مگر تاریک' عمیق کریوس بالکل خاموش تھا۔ ہلکی سی کراہ' کمزور سی کھانسی' زندگی کی کوئی رمق اس کریوس میں نہیں تھی۔

برف گرنے لگی۔ ہوا کا زور زیادہ ہو گیا۔ افق اور فرید جھک کر ارسہ کو آوازیں دیتے رہے۔ دونوں کے ہیلمٹ اور چہروں پر برف کے ذرات لگے تھے۔ مگر کریوس سے کوئی جواب نہ آیا۔ پریشے کا دل ڈوب رہا تھا۔

"افق کچھ کرو پلیز۔" اس کا جیسے سانس رک رہا تھا۔ ارسہ کتنی دیر سے اس عمیق کریوس میں منوں برف تلے دبی ہو گی' اس کا سانس بھی ایسے ہی بند ہو رہا ہو گا۔ اس تصور سے ہی اس کی روح تک کانپ گئی۔

افق اور فرید تھک ہار کر خاموشی سے گڑھے کے کنارے بیٹھ گئے۔ ان کی خاموش صورتیں پریشے کو ہولا رہی تھیں۔

"تم دونوں ایسے کیوں بیٹھے ہو؟ اسے نکالتے کیوں نہیں ہو؟ افق جواب دو' میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" اس نے اس کا کندھا زور سے ہلایا۔

افق نے سر اٹھایا۔ گلیشیئر گاگلز اتار چکا تھا۔ بے حد سرخ ناک و آنکھیں' چھوٹی چھوٹی بڑھی شیو میں پھنسے برف کے ذرات..... اس نے دھیرے سے نفی میں گردن ہلائی۔ "میرا نہیں خیال۔ اب کوئی امید ہے۔ وہ اب تک مر چکی ہو گی۔"

کرنٹ کھا کر پریشے نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹایا۔

"نہیں..... تم..... تم غلط کہہ رہے ہو۔ وہ کیسے..... نہیں....." وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ "تم۔ تم دیکھو تو سہی افق! وہ اندر ہی ہو گی۔ اس کا سانس گھٹ رہا ہو گا۔ وہ مدد کے لیے پکار رہی ہو گی۔ ہواؤں کے شور سے اس کی آواز یہاں تک نہیں پہنچ رہی ہو گی۔ تم..... تم دیکھو تو سہی....." کسی موہوم امید کے تحت اس نے کہا۔

"وہ نہیں ہے پریشے۔" کسی تھکے ہارے شکست خوردہ سپاہی کی مانند اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "وہ ہوتی تو جواب دیتی۔ اوہ خدایا۔" وہ سر دونوں ہاتھوں میں لیے خود بھی بے یقین سا تھا۔

پریشے نے استعجاب اور خوف سے نفی میں گردن کو

جنبش دی۔

"نہیں افق۔۔۔ تم۔۔۔" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ افق کیا کہہ رہا تھا' اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ بھلا ارسہ کیسے مر سکتی تھی؟

"ابھی۔۔۔ ابھی تو وہ ہمارے ساتھ چل رہی تھی۔۔۔ بالکل ابھی میں نے اسے برف پر کھڑے دیکھا تھا۔۔۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔۔۔ تم۔۔۔ تم ایسے کیوں؟ وہ۔۔۔ نہیں۔۔۔" اس کا سر گھوم رہا تھا۔ چاندنی میں نہائی ہراموش اور دوبانی کی چوٹیاں اسے گھومتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اسے آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔

پھر اس نے افق کو اٹھتے دیکھا۔ فرید اسے منع کر رہا تھا' مگر وہ پھر بھی اپنی ہارنس کے گرد کچھ باندھ کر اس گہرے کریوس میں جا رہا تھا۔ رسّی کا ایک سرا فرید کے ہاتھ میں تھا' وہ آہستہ آہستہ رسّی چھوڑ رہا تھا۔ شاید رسّی کہیں سے اینکو بھی کر رکھی تھی۔ وہ اب نیچے اتر چکا تھا۔

"پانچ میٹر کھودا ہے۔ وہ نہیں ہے۔" گڑھے میں سے آواز آئی۔ وہ آواز اسے بہت اجنبی لگی تھی۔ اس کا ذہن مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔

بھلا ارسہ کیسے مر سکتی تھی؟ ابھی ایک منٹ پہلے تو اس نے ارسہ کو اپنے عقب میں آتے دیکھا تھا۔ بس ایک لمحے میں اس کا پاؤں کریوس کے اوپر برف کی تہہ پر پڑا' گلیشیئر پھٹا' وہ نیچے گری' ہزاروں من برف اس کے اوپر گرتی چلی گئی' اس کا سانس رک گیا' اور وہ دم گھٹنے سے' زندہ برف میں دفن ہونے سے مر گئی بس ایک لمحے کا عمل تھا اس کے دل کے اندر کہیں بہت زور سے درد ہوا تھا۔ درد کی شدت بڑھی تو اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان مسلسل برف کے ننھے ننھے گالے برسا رہا تھا۔

چوٹی اس جگہ سے نظر نہیں آتی تھی' مگر یقیناً" وہ بادلوں کے ہالے میں چمک رہی ہوگی۔ رات کے اس پہر "برو" جاگ اٹھا تھا اور اسے علم ہو چکا تھا کہ کوئی دبے قدموں اس کی راجدھانی میں داخل ہو رہا تھا۔

افق واپس آچکا تھا۔ اس کے قریب کھڑے ہوئے ہوئے وہ سردی میں ٹھٹھر رہا تھا' تیز تیز سانسوں کے درمیان وہ کچھ کہہ بھی رہا تھا۔

"تم۔۔۔ تم افق!" وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی' اور اس کی جیکٹ کا کالر زور سے پکڑ کر کھینچا۔ "میں نے کہا تھا تم سے کہ واپس چلتے ہیں' مگر تم نہیں مانے۔ تمہیں اوپر جانا تھا' ہر قیمت پر اور وہ۔۔۔ وہ مر گئی افق۔۔۔ ارسہ مر گئی۔۔۔ کر لی تم نے Summit؟ بنا لیا تم نے ورلڈ ریکارڈ' ہاں؟ بولو۔۔۔ بالکل ابھی تو اس نے اپنی ماں سے بات کی تھی۔ باپ سے اس نے کیمپ تھری جا کر بات کرنی تھی۔ اس کا باپ اس کی کال کا انتظار کر رہا ہو گا۔۔۔ اسے نکالو افق' اسے باہر نکالو۔۔۔ تمہیں اللہ کا واسطہ افق! اس کا باپ اس کی کال کا انتظار کر رہا ہو گا۔۔۔" اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے غم و غصّے سے اس پر چلّاتے ہوئے اسے پتا بھی نہیں چلا اور کب وہ اس کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ اتنا بھی نہیں کہا کہ ارسہ خود اوپر جانا چاہتی تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ میری چھوٹی بہن تھی افق۔۔۔ اتنی لیلنٹڈ' اتنی ذہین۔ اور۔۔۔ اور اس ظالم پہاڑ نے اسے مجھ سے چھین لیا؟" وہ اس کے کندھے پر سر رکھے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ افق نے اس کے شانوں کے گرد بازو رکھ کر ہولے سے اس کا سر تھپکا۔

"ریلیکس پریشے' ریلیکس!"

مگر وہ ریلیکس نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ ایک دوست کو اپنے سامنے پہاڑ میں دفن ہوتے دیکھا تھا۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ برف ان دونوں پر گر رہی تھی۔ فرید کچھ ہی دور خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

"افق! اسے باہر نکالو' مجھے اس کو دیکھنا ہے۔ خدا کے لیے افق! ہم ارسہ کے ساتھ آئے تھے' ہمیں اس کے ساتھ ہی واپس جانا ہے۔"

"ریلیکس پری۔۔۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔ میں اس کی باڈی لینے گیا تھا ابھی' مگر وہ کہیں بہت نیچے ہے۔" وہ اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا' مگر وہ خود ریلیکسڈ نہیں تھا۔ اس کا اپنا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ مگر جانے وہ کیسے ضبط کر رہا تھا۔

"کم ان بیس کیمپ۔" اپنے کندھے کے پیچھے ہاتھ بڑھا کر اس نے ریڈیو نکالا اور ٹرانسمیٹ بٹن دبایا۔ دوسرا بازو ابھی تک پریشے کے شانوں کے گرد تھا۔

ریڈیو میں شور سا سنائی دیا' پھر ترک میں کچھ اکتاہٹ بھرے الفاظ۔۔۔

"میری بات غور سے سنو احمت! ارسہ بخاری از ڈیڈ۔ میں دہراتا ہوں' ارسہ بخاری از ڈیڈ۔ وہ ایک کریوس میں گر گئی ہے۔ اس کی ڈیتھ کنفرم ہے' مگر باڈی ریکور کرنا بہت مشکل ہے۔ اب ہمیں جلد از جلد کیمپ تھری تک جانا ہے۔ یہاں برف پڑ رہی ہے' ہم رک نہیں سکتے۔ ڈو یو کاپی؟"

"اوہ گاڈ۔۔۔ یس آئی کاپی!"

افق نے ٹرانسیور بند کر کے بیگ میں رکھ دیا۔ پریشے ابھی تک اسی طرح رو رہی تھی۔ اس نے اس کا بازو سختی سے یوں پکڑ رکھا تھا جیسے کوئی چھوٹا بچہ بھرے میلے میں گم ہو جانے کے ڈر سے ماں کی انگلی پکڑتا ہے۔ وہ بہت خوف زدہ تھی۔ افق نے آہستگی سے اس کا سر تھپکا۔

"شش۔ اب رونا نہیں ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ ہمیں کیمپ تھری جانا ہے۔"

"نہیں افق!" اس کی آنکھوں سے آنسو پھر سے گرنے لگے۔ "میں ارسہ کو چھوڑ کر۔۔۔"

"پریشے پاگل مت بنو۔۔۔ ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔"

"مگر اس کی ڈیڈ باڈی۔۔۔" یہ لفظ کہنا بھی دشوار تھا۔

"وہ ری کور کرنا مشکل ہے۔ زیادہ رسّی بھی نہیں ہے میرے پاس۔۔۔ ساری رسّی تو ارسہ کے پاس تھی۔ باڈی ہم واپسی پر ری کور کر لیں گے۔" اس نے اپنے بھاری دستانے والے ہاتھ سے پریشے کے چہرے پر گرتے آنسو اور برف صاف کیے۔

"تم۔۔۔ تم بعد میں نکالو گے نا اسے؟" اس کی بھیگی آنکھوں میں موہوم سی امید چمکی۔

"ہاں۔۔۔ واپسی پر۔۔۔ ٹھیک؟ اب چلو۔۔۔"

"مجھ میں ہمت نہیں ہے۔" اس کی ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔

"ہمت کرو پری! بہادر بنو۔ اپنے لیے نہیں تو میرے لیے۔" افق نے اسے سہارا دیتے ہوئے دونوں کندھوں سے ابھی تک تھام رکھا تھا۔ پریشے نے بھی مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اس نے اپنا وزن افق پر ڈال رکھا تھا اور پھر بہت نڈھال سی وہ اس کے ہمراہ قدم بڑھانے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر گردن پر لڑھک رہے تھے۔

اس نے زندگی میں کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ ایک لمحہ ایسا بھی آئے گا جب اسے اپنی بہت اچھی دوست کو برف میں چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ اس گڑھے کے دہانے سے پلٹنا اور آہستہ آہستہ برستی برف باری میں کیمپ تھری کی طرف قدم بڑھانا بہت کٹھن تھا' اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ افق نے اسے سہارا دیا ہوا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شاید وہ اسی کریوس کے آس پاس راستہ بھٹک کر برف پر ڈھے چکی ہوتی یا شاید کسی کریوس میں گر کر مر چکی ہوتی۔

☆ ☆ ☆

اس رات کیمپ تھری میں وہ دونوں گھنٹوں خاموشی سے بیٹھے رہے' اور پھر جب رات تاریک ہوتی چلی گئی تو وہ باتیں کرنے لگے۔ طیب اردگان کی باتیں' عراق جنگ کی باتیں' ترک ملٹری کی باتیں' نیٹو اور Sco بلاکس کی باتیں' انہوں نے بلاتکان صرف ایک "بات" سے بچنے کو دنیا کا ہر ٹاپک ڈسکس کر ڈالا کہ شاید دکھ کم ہو' شاید ڈپریشن اور نفسیاتی اثر قدرے زائل ہو' مگر سب کچھ ویسا ہی تھا۔

احمت کی بیوی سلمیٰ نے ارسہ کے والدین کو انگلینڈ میں اطلاع کر دی تھی۔ پریشے رات بھر ان دونوں کے متعلق سوچتی آئی تھی' جانے کیا گزری ہو گی ان پر؟ کیسے سنا ہو گا انہوں نے اس خبر کو؟

رات کو اس کے سلیپنگ بیگ کے قریب جگہ بہت خالی تھی۔ افق اپنے خیمے میں سونے جا چکا تھا۔ وہ ارسہ اور ارسہ کی باتوں کو یاد کر کے پھر سے رونے لگی۔ وہ کتنی اکیلی رہ گئی تھی اور شاید اس اندھے کریوس میں گری ارسہ اس سے زیادہ اکیلی ہو گی۔ وہ محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

تب اس نے اپنے بیگ سے ارسہ کا کاغذ نکالے اور انہیں ترتیب سے جوڑا۔ سیاہ روشنائی سے انگریزی میں صفحے بھرے ہوئے تھے۔ لکھائی خاصی رف تھی اور جگہ جگہ سے کاٹا بھی ہوا تھا مگر وہ پڑھ سکتی تھی' یہ جانتے ہوئے بھی کہ کہانی ادھوری تھی۔

اس نے پہلے صفحے پر نگاہ ڈالی۔ "قراقرم کا تاج محل" موٹے مارکر سے انگریزی میں لکھا تھا۔

ہنزہ کے باسی راکاپوشی کو "ہنزہ و کشر تاج محل" یا "قراقرم کا تاج محل" کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ برف سے ڈھکی راکاپوشی کی "چمکتی دیوار" آگرہ کے تاج محل جیسی سفید اور حسین دکھتی تھی۔ پریشے کو ان سے اختلاف تھا۔ اس کا خیال تھا' راکاپوشی کی چمکتی دیوار آگرہ کے تاج محل سے زیادہ سفید اور حسین دکھتی تھی۔

اس نے پڑھنا شروع کیا۔ وہ اس ادھورے ناول کے رف لکھے گئے مسوّدے کو بغیر کسی دقت کے پڑھ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

16 اگست 2005ء

"صاب' اوپر سارا اسنو فیلڈ ہے۔"

وہ دونوں خاموشی سے خیموں کے آگے بیٹھے تھے جب فرید ان کی طرف آیا۔ وہ آج کلائمب کے لیے نہیں گئے تھے ان کے ذہنوں کو کل کے واقعے کو وقتی طور پر بھلانا تھا' جس کے لیے انہیں ایک دن کا ریسٹ چاہیے تھا۔ فرید البتہ کچھ مخصوص مقامات پر رسّیاں لگا آیا تھا۔

"پھر؟" افق نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تم مانو یا نہ مانو' اوپر سارا اسنو فیلڈ ہے' اور برف تازہ گری ہے۔ اس کا گلیشئر کسی بھی ٹائم پھٹ سکتا ہے اور جب برف گرے گی تو تم بھی مرے گا اور ہم بھی۔ سو ہم تم کو ابھی سے بتا رہا ہے' ہم سویرے واپس چلا جائے گا۔"

"مگر فرید تم نے تو کیمپ فور تک ہمارے ساتھ جانا تھا۔"

"صاحب تم کل خود کیمپ فور تک چلے جانا۔ ہم نہیں جائے گا۔ بس ہم نے تم کو بتا دیا ہے۔" وہ کسی اڑیل گھوڑے کی طرح ضد پر اڑ چکا تھا۔

"فرید' دیکھو ہم بھی تو اوپر جا رہے ہیں۔" پریشے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "ہم کوئی ڈر رہے ہیں؟"

"باجی تم پاگل ہو' ام ابھی پاگل نہیں ہوا۔ تمہارے دونوں کے باپ کے پاس بہت پیسہ ہے' تم اور مر بھی جاؤ تو تمہارا بچّہ بھوکا نہیں مرے گا' جبکہ ادر ہمارا باپ کریم آباد میں ایک فٹ زمین بھی نہیں چھوڑ کر گیا ہمارے لیے۔ ہمارے حال پر رحم کرو باجی! تمہیں اوپر جا کر کوئی خزانہ نہیں ملے گا۔ میری مانو تو تم بھی واپس چلو۔" پریشے اور افق نے نگاہوں کا تبادلہ کیا' پھر افق نے شانے اچکا دیے۔

"تمہاری مرضی!" وہ سر جھٹک کر دوسری جانب دیکھنے لگا' ماتھے پر ناگواری سے لکیریں ابھر آئی تھیں۔ "میں نے نانگا پربت کا سولو کلائمب کیا تھا۔ مگر نہیں گیا تھا میں پورٹر کے بغیر۔ اب تو صرف لڑکیوں کے لیے.... ٹھیک کہتی تھی وہ عورت تم پورٹرز کے بارے میں۔" وہ بڑبڑایا۔ فرید نے سن لیا تھا۔

"صاب' وہ عورت جھوٹ کہتی تھی۔" پھر پریشے کی کنفیوز شکل دیکھ کر بولا "باجی ادھر ایک کورین عورت گیشر بروم ٹو سر کرنے آئی تھی۔ ہمارے ماموں کا لڑکا ادھر بلتستان میں رہتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ پورٹر بن کر اس اکیلی کو گیشر بروم ٹو کی چوٹی تک لے کر گیا تھا۔ بعد میں جب وہ نیچے آئی تو اخبار والوں کو بولی کہ میں نے سولو کلائمب کیا' میرا پورٹر تو مجھے کیمپ ٹو میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میرے ماموں کا لڑکا' بے چارہ غریب آدمی ہے' چپ کر کے بیٹھ گیا۔ پر صاب' وہ عورت جھوٹ بولتی تھی اس کو سچا خیال مت کرنا۔ اس کا فیصلہ گیشر بروم ٹو نے کیا تھا۔ پہاڑوں کا اپنا عدالت ہوتا ہے۔ وہ عورت اگلے سال پھر گیشر بروم ٹو سر کرنے آئی' پہاڑ نے واپس جانے نہیں دیا۔ اس کی تو لاش بھی نہیں ملی۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ تم جاؤ پھر۔" افق اپنے سابقہ لہجے میں بولا۔

"صاب! ہم نے کیمپ فور پہنچانے کے پیسے لیے تھے۔ رسّیاں وسّیاں سب لگا دیا ہے۔ آگے تم جانو' تمہارا کام۔"

افق جواب میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ فرید انہیں چھوڑ کر جا رہا تھا' وجہ یہ تھی کہ وہ صرف خفا خفا سا تھا یا شاید حد سے زیادہ ڈپریسڈ۔

☼ ☼ ☼

17 اگست 2005ء

آج صبح سے موسم شدید خراب تھا' اور موسم سے زیادہ افق کا موڈ خراب تھا۔ وہ کتنی دیر سے پریشے کے سامنے میٹ پر چت لیٹا' ایک بازو ماتھے پر رکھے خیمے کی چھت کو گھور رہا تھا۔ شیڈول کے مطابق آج انہیں کیمپ فور میں ہونا تھا مگر قراقرم کا اپنا شیڈول تھا۔

خیمے کے باہر طوفانی جھکڑ چل رہے تھے جن سے خیمے کا گور ٹیکس پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کی کھلی جگہوں سے سرد ہوا اندر داخل ہو کر ان کو ٹھٹھرا رہی تھی۔ برف کی مسلسل اوپر سے نیچے سلائیڈنگ سے خیمے کی دیواریں کمپریس ہو رہی تھیں۔

"فرید صبح منہ اندھیرے ہی بغیر بتائے چلا گیا۔" اس نے یونہی بولنے کی غرض سے کہا۔

"بتا بھی دیتا تو میں نہ روکتا۔" وہ اسی طرح لیٹا اوپر دیکھتا رہا۔

"وہ ٹھیک کہتا تھا افق! ہم دونوں پاگل ہیں۔ سب کوہ پیما پاگل ہوتے ہیں۔ گھروں کا سکون چھوڑ کر برفانی وادیوں میں نکل جاتے ہیں اور آخر میں مر جاتے ہیں۔"

"ایسے بھی تو مر جاتے ہیں۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں' لفٹ میں پھنس کر دم گھٹنے سے کسی ائیر کریش یا بم بلاسٹ میں۔ تم مسلمان نہیں ہو؟ تمہارا ایمان نہیں ہے کہ جہاں موت آنی ہے' وہاں آ جائے گی کبھی موت بھی ٹلی ہے کیا؟"

پریشے نے ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالی جو بغیر پلکیں جھپکائے چھت کو گھور رہا تھا' اور پھر تھک کر خیمے کی دیوار سے سر ٹکا دیا۔ سامنے والی دیوار کے دوسری طرف برف اکٹھی ہو رہی تھی۔

"پھر بھی افق! کیا مل جاتا ہے پہاڑوں پر جا کر؟ اتنی مشقّت کر کے؟"

"یہ بات ہمیشہ وہ کاہل ترین لوگ کہا کرتے ہیں' جن سے روز ایک گھنٹہ لان میں واک بھی نہیں ہوتی۔ یہ "بھلا کیا رکھا ہے پہاڑوں میں" والا فقرہ ان لوگوں کے منہ سے نکلتا ہے جن کے لیے انگور ہمیشہ کھٹے ہوتے ہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔

"پھر بھی۔ زندگی نارمل طریقے سے بھی گزاری جا سکتی ہے۔" وہ شاید بحث کے موڈ میں تھی۔

"نارمل طریقہ کیا ہے؟ گھنٹوں فون پر رشتے داروں کی برائیاں کرنا' نت نئے بے ہودہ فیشن اپنانا' غیر حقیقی فلموں کے غیر حقیقی ہیروز کو دیوتا تسلیم کر کے ان کی پرستش کرنا' راتوں کو جاگ جاگ کر گھٹیا قسم کے عشقیہ ناول پڑھنا' باس سے کولیگز کی چغلیاں کھانا' اگر یہ نارمل لائف ہے تو پھر کوہ پیماؤں کی ابنارمل لائف اس سے بہت بہتر ہے مادام!"

"جانتے ہو افق! مجھے نہیں پتا لوگ پہاڑ کیوں سر کرتے ہیں مگر میں پہاڑوں میں خوش رہتی ہوں۔ مجھے ادھر سکون ملتا ہے۔ لیکن نشاء' پاپا' سیف ان سب کو بہت حیرت ہوتی ہے کہ لوگ پہاڑ کیوں سر کرتے ہیں۔" برف قطروں کی شکل میں بہہ رہی تھی اور قطرے راستے میں آنے والے ہر ذرّے کے ساتھ مل کر بڑے ہوتے جا رہے تھے۔

"یہ تو وہی بات ہے کہ "لوگ کتابیں کیوں پڑھتے ہیں؟ علم حاصل کرنے کے لیے؟ تو جتنا علم 'اپنے اور نیچر کے بارے میں پہاڑوں میں جا کر ملتا ہے' وہ دنیا کی کسی درس گاہ میں نہیں ملتا۔ آپ پہاڑ کو ایکسپرینس کرتے ہو' اور یقین کرو' نان کلائمبرز حیران ہوتے ہیں جب وہ سنتے ہیں کہ ہم کوہ پیما پربتوں کا احترام کرتے ہیں۔ ان کی جانب تمیز اور ادب سے دیکھتے ہیں۔ چوٹیوں پر قدم بھی احترام سے رکھتے ہیں۔ پہاڑ عظیم ہوتے ہیں۔"

"اور ظالم بھی!" پریشے نے استہزایہ انداز میں سر جھٹکا۔ وہ دیوار کے اس پار نظر آنے والے قطروں کو دیکھ رہی تھی جو دیوار کے نیچے خالی درز سے ہر ممکن طور پر خیمے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا تمام سامان گیلا ہو چکا تھا۔

"بے شک ظالم ہوں' مگر میں ہمالیہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں انقرہ اور اپنے گھر سے نہیں ان پہاڑوں سے تعلق رکھتا ہوں پری۔"

"تمہیں لگتا ہے ہم بچ کر چلے جائیں گے؟"

"کوہ پیمائی تو نام ہی بلندیوں سے زندہ واپس بچ کر آنے کا ہے۔ یہ summit تو محض ایک بونس ہوتی ہے۔"

"پھر بھی تم واپس نہیں پلٹنا چاہتے؟"

"تمہیں جانا ہے تو جاؤ میں چوٹی فتح کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔" برف کے قطرے اب چھوٹی چھوٹی گیندیں بن کر دیوار کے اس پار اکٹھے ہو رہے تھے۔

"افق پلیز..... واپس چلو۔ اس رج کو ان کلائمبڈ ہی رہنے دو۔"

"میں ذرا برف صاف کر آؤں۔" وہ چھوٹا سا بیلچہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

وہ چوٹی پر کھڑے ہو کر کنکورڈیا اور بلتورو کے پربت دیکھے بغیر واپس نہیں پلٹے گا' وہ جانتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ وہاں تک نہیں جانا چاہتی تھی' نہ اسے چھوڑ کر نیچے اترنا چاہتی تھی۔ دنیا میں کوئی بھی انسان "مکمل طور پر بہترین" نہیں ہوتا۔ افق ارسلان میں بھی ایک خامی تھی۔ ہٹ دھرمی' ضد' حد سے بڑھی خود اعتمادی۔

کوہ پیماؤں کی اکثریت انہی خصوصیات کا شکار ہوتی ہے۔ وہ عموماً" موسم کی خرابی کے باوجود اپنے ٹارگٹ کے بہت قریب پہنچ کر واپس نہیں پلٹنا چاہتے۔ وہ اتنا کچھ صرف کر کے ان بلندیوں تک پہنچے ہوتے ہیں کہ واپس پلٹ جانا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ ابھی کمبج ہی تو افق نے کیمپ تھری سے واپس جانے کے متعلق کہا تھا یہ تو ایسے ہے کہ تم ہنڈرڈ میٹر ریس کے ایک ایتھلیٹ کو نوے میٹر پر رک کر مڑ جانے کو کہو۔"

افق کی سب سے بڑی خامی یہی تھی کہ اسے بھول گیا تھا کہ سو میٹر دوڑ اور کوہ پیمائی میں فرق ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

18 اگست 2005ء

کیمپ فور 7500 میٹر پر تھا' کیمپ تھری سے تقریباً" سات سو میٹر اوپر۔ آج برفانی جھکڑ نہیں چل رہے تھے' موسم ٹھیک تھا' مگر برف باری ہنوز جاری تھی۔ وہ اتنی ہلکی اور کم تھی کہ visibility خاصی بہتر تھی۔ ان کے پاس اتنا گیئر اور فیول نہیں تھا کہ وہ بیٹھ کر ایک دن بھی مزید انتظار کرتے۔

گزشتہ روز کے سخت طوفان کے باعث رسیاں اور کورڈز بری طرح الجھ چکی تھیں۔ ان کو سلجھانے میں خاصا وقت ضائع ہوا۔ رسیاں ویسے بھی کیمپ تھری سے کئی سو میٹر اوپر' کیمپ فور سے چند میٹر نیچے سے لگائی گئی تھیں۔ رسیوں کے آغاز تک کا سفر انہوں نے خاموشی سے کیا۔ پھر ان کو سلجھا کر جب پریشے نے جومر کرنے کے بعد رسی کھینچی تو وہ جام ہو گئی۔ اس نے جھنجلا کر اسے دوبارہ کھینچا مگر وہ جام رہی۔ اس نے گلیشئر گوگلز اتار کر ہیلمٹ پر چڑھائے' نیچے اتری' وہ گرہ ڈھونڈی جو رسی میں بن کر اسے جام کیے ایک کریک میں پھنسی تھی' اس نے گرہ کھولی اور دوبارہ اوپر چڑھنے لگی۔ اس کی ایک غلطی کی وجہ سے پورے بیس منٹ ضائع ہوئے مگر افق نے کچھ نہ کہا۔ وہ خاموشی سے تمام کارروائی دیکھتا رہا۔

وہ دونوں اس وقت ڈیتھ زون میں تھے۔ چھ ہزار میٹر سے اوپر ایلٹی ٹیوڈ "ڈیتھ زون" یا "ورٹکل لمٹ" کہلاتا ہے۔ اس بلندی پر ہوا بے حد پتلی اور آکسیجن ان کے جسموں کے لیے ناکافی تھی۔ سانس لینے کے لیے پریشے کے پھیپھڑوں کو پورا زور لگانا پڑتا تھا اور وہ اس وقت پورا منہ کھول کر سانس لے رہی تھی۔

وہ کیمپ فور سے قدرے نیچے تھے۔ ان سے تقریباً" تین سو میٹر اوپر پہاڑ کی ڈھلوان جمے ہوئے ندی نالوں سے مزین تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے چوٹی اتنی سامنے دکھائی دیتی کہ یوں لگتا' وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لے گی' مگر اس کے لیے بہت لمبا ہاتھ چاہیے تھا۔

وہ رک رک کر آئس ایکس برف میں مار کر آہستہ آہستہ چڑھ رہی تھی۔ اس کی انرجی اتنی کم رہ گئی تھی کہ یوں لگتا تھا ابھی کسی وقت تھک کر نیچے لڑھک جائے گی۔ دفعتاً" وہ ذرا سستانے کو ایک serac کے پیچھے کھڑی ہوئی اور اپنا تنفس درست کرنے لگی۔ seracs جب گرتے ہیں تو خوب تباہی مچاتے ہیں۔ مگر اس وقت خود کو پناہ دیتا وہ serac جس کے عقب میں وہ محفوظ سی جھکی کھڑی تھی' اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ افق اس سے سو میٹر دائیں جانب تھا۔ دفعتاً" اسے برف کے ٹوٹنے اور چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔

اس کے سر سے کئی میٹر اوپر' قدرے دائیں طرف برف میں ایک لمبا سا شگاف پیدا ہو رہا تھا' یوں جیسے ہینگر سے لٹکے سفید کپڑے کو اوپر سے قینچی سے کاٹ دیا جائے۔ برف کی پلیٹوں میں نمودار ہوتا وہ کریک بے حد خوب صورت اور بے حد مہلک ثابت ہوا کیونکہ اگلے ہی پل' اس کریک سے نیچے کی برف کے بڑے بڑے ٹکڑے نیچے گرتے اور سفید بے حد گھنی دھول پیدا کرتے نشیب میں گرتے آ رہے تھے۔

پریشے کا سانس رک گیا۔ ایولانچ نیچے کی طرف آ رہا تھا' مگر وہ ایک serac کے پیچھے محفوظ تھی' لیکن افق.....

"افق!" وہ بے اختیار چلائی "ایولانچ آ رہا ہے۔ خود کو سیف کرو۔"

افق نے بوکھلا کر اوپر دیکھا جہاں تیزی سے گرتی برف اس کی جانب بڑھ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ خود کو سیکیور کر پاتا' برف کی سفید دھول ہر طرف پھیل گئی اور اس گھنی دھول کے پیچھے وہ غائب ہو گیا۔

اپنی آئس ایکس کو برف میں گاڑے' خوف کے مارے اسے مضبوطی سے پکڑے' وہ آنکھیں بند کیے دیوار سے چپکی کھڑی تھی۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

پھر دھول آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر سر اونچا کیا۔

دودھیا سفید برف راکاپوشی کے جسم سے بالکل ایسے چمٹی تھی جیسے چند لمحوں پہلے تک تھی۔ اس نے

گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ راکاپوشی کے پہاڑی سلسلے پر سکوت تھا۔ واحد حرکت آسمان سے گرتی برف کی تھی، باقی پورا پہاڑ خاموش اور پرسکون تھا جیسے وہ بھیانک ایوالانچ کبھی آیا ہی نہ ہو۔ میلوں دور تک پھیلی برف ویسی ہی حسین نظر آ رہی تھی، بس ایک فرق تھا۔ اس کے سو میٹر دائیں جانب افق ارسلان نہیں تھا۔

"افق!" وہ بلند آواز سے چلائی "تم کہاں ہو؟" اس کی آواز اردگرد کے پہاڑی سلسلوں سے ٹکرا کر ہنزہ کے آسمان میں تحلیل ہو گئی۔ برف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

پریشے نے گردن ترچھی کر کے اپنے عقب میں دیکھا۔ گرتی برف کے اس پار ہاراموش اور دوبانی کی چوٹیاں تھیں۔ دور بہت دور چھکوری کا سرمئی اہرام برفیلی چادر کی بکل مارے کھڑا تھا۔ دائیں طرف میلوں دور 'نانگا پربت' کی خونی چوٹی تھی۔ ہمالیہ کے تمام پہاڑ اس کو دیکھ رہے تھے، اس پر ہنس رہے تھے، اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہہ رہے تھے "بے وقوف لڑکی تم بالکل اکیلی رہ گئی ہو۔"

وہ واقعی اکیلی تھی۔ اس کے اطراف میں ان دیو ہیکل پہاڑوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ تمام پہاڑ اتنے خوف ناک اور اونچے تھے کہ خود آسمان جھک کر ان کی پیشانی چوم رہا تھا۔

"افق تم کہاں ہو؟" بہت بے بسی سے اس نے پھر پکارا۔ "جواب دو..... خدا کے لیے کچھ تو کہو افق! ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔" اس کا دل واقعی پھٹنے کو تھا۔

وہ کدھر تھا؟ وہ جواب کیوں نہیں دے رہا تھا؟ اوپر سے ہزاروں ٹن برف چند لمحوں میں گری تھی، اس برف میں وہ اسے کہاں ڈھونڈے؟ برف اسے اڑا کر برف کے قدموں میں پٹخ چکی تھی یا وہ وہیں کہیں اپنی آئس ایکس سے cling ہوئے کھڑا تھا؟

پریشے نے اس جگہ دیکھا جہاں چند لمحوں قبل وہ کھڑا تھا وہاں اب دودھیا سفید برف تھی۔ وہ رسّی جو اس نے لگائی تھی وہ اس برف کے اندر گم ہو گئی تھی۔ البتہ غور سے دیکھنے پر اس کا ایک سرا واضح تھا جو ٹوٹ چکا تھا۔ یعنی اب افق اس رسّی پر نہیں تھا اور نیچے برف میں دب چکا تھا؟ پریشے کا دل ڈوبنے لگا۔

"نہیں۔ وہ ادھر ہی ہو گا۔ میں ڈھونڈتی ہوں اسے میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔" وہ خود سے بولی اور نیچے اترنے لگی۔ وہ لڑبڑاتے ہوئے الٹے قدموں نیچے اتر رہی تھی۔ رسی سے نیچے اترنا بالکل ایسے تھا جیسے کسی عمارت کی دسویں منزل کی کھڑکی تک پہنچنے کے لیے عمارت کے باہر سے لکڑی کی سیڑھی رکھی جائے، اور پھر جیسے اس سیڑھی سے نیچے اترا جاتا ہے، مضبوطی سے اسے پکڑے، سہج سہج کر پیچھے اور نیچے دیکھتے ہوئے ایک ایک قدم نیچے رکھنا، وہ ایسے ہی اتری تھی۔ اسے نہیں علم تھا کہ وہ برف میں کہاں تھا، مگر اسے یہ علم تھا کہ اگر افق کو ڈھونڈنے کے لیے اسے راکاپوشی کی تمام برف بھی کھودنی پڑی تو وہ کھود ڈالے گی۔

وہ بمشکل بیس میٹر نیچے اتری۔ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا اور وہ باقاعدہ ہانپ رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں جان نہیں تھی مگر پھر بھی وہ اردگرد برف میں افق کو کھوج رہی تھی۔

دفعتاً اسے قریب برف میں سرمئی رنگ کی جھلک دکھائی دی۔ وہ خود کو رسّی سے ان کلپ کر کے تیزی سے اس طرف بھاگی برف knee-deep تھی۔ وہ اس میں گھٹنوں تک تھی، خود کو گھسیٹتی ہوئی اس چیز کے قریب آئی اور دستانوں سے تیزی سے برف ہٹانے لگی۔

وہ ایک سرمئی رنگ کا پتھر تھا۔

اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے گردن جھکا کر نیچے دیکھا اور ایک دفعہ بھرپور قوت سے اسے آواز دی۔

"افق..... تم کہاں ہو؟"

اگر وہ اس جگہ سے نیچے تھا تو یقیناً آواز اس تک گئی ہو گی، اگر اوپر ہوتا تو ہوا کے رخ کے باعث آواز نیچے سے اوپر نہ جاتی، یعنی اب اگر وہ جواب میں کچھ کہتا بھی تو وہ پریشے کو نہ سنائی دیتا کیونکہ ہوا اس کی دشمن بنی اوپر سے نیچے کی جانب چل رہی تھی۔ شدت بے بسی سے اسے رونا آگیا۔

(آخری قسط ان شاء اللہ اگلے ماہ)

نمرہ احمد

قراقرم کا تاج محل

یہ کہانی ڈاکٹر پریشے جہانزیب کی ہے، جو خوابوں کے حقیقت بننے پر یقین رکھتی ہے۔ وہ طبیعتاً "مشکل پسند" ہے اور ہر چیز میں خوب صورتی تلاشتی ہے۔ پریشے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ پریشے کو یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن کوئی شہزادہ اس کے خوابوں کو تعبیر کا روپ دے گا۔ اسے جھٹکا اس وقت لگتا ہے جب اس کے والد اس کی منگنی پھوپی زاد سیف سے کر دیتے ہیں۔ سیف اور پھوپھو کی فیملی کی طبیعت حاکمانہ ہے، مگر والد کے فیصلے پر پریشے سر جھکا دیتی ہے۔ ماموں زاد کزن نشاء سے اس کی گاڑی چھنتی ہے۔ ماموں کی پوری فیملی بھی پریشے کے رشتے پر ناخوش ہیں۔ پھوپھو

مکمل ناول

کو ہر وقت پریشے کا رشتہ ہاتھ سے نکل جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس لیے وہ جلد شادی پر زور دیتی ہیں۔ شادی دو مہینے بعد طے پاتی ہے۔ کچھ دن آزاد زندگی گزارنے کے لیے وہ نشاء کے ساتھ نادرن ایریاز جانے کا پلان بنالیتی ہے۔ جس پر سیف ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔

مال روڈ پر پریشے اور نشاء کی ملاقات ایک ترک انجینئر افق ارسلان سے ہوتی ہے جو راکاپوشی پہاڑی سر کرنے پاکستان آیا ہے۔ اس کی ساحرانہ اور پر اسرار شخصیت پہ پریشے ٹھٹک سی جاتی ہے۔ بظاہر وہ سرد مہری کا مظاہرہ کرتی ہے بعد میں پتا چلتا ہے کہ افق بھی پریشے اور نشاء کے ساتھ ہی ٹور کمپنی کے تحت نادرن ایریا جارہا ہے۔ ٹور کے دوران ان کی ملاقات ایک لڑکی ارسہ سے ہوتی ہے جو ادیبہ بھی ہے۔ پریشے اور افق ارسلان کی نوک جھونک غیر محسوس انداز میں دونوں کو ان کے خوب صورت جذبے میں جکڑ دیتی ہے۔ افق کا خصوصی لگاؤ دیکھتے ہوئے پریشے اسے اپنی منگنی کا بتادیتی ہے۔ جس پر وہ ساکت رہ جاتا ہے۔

واپس آکر بھی پریشے اپنے آپ کو ایک سحر گرفتار میں محسوس کرتی ہے۔ وہ جہانزیب صاحب سے راکاپوشی کی ایکسیڈیشن پر جانے کی اجازت مانگتی ہے، حیرت انگیز طور پر اسے اجازت مل جاتی ہے۔ نشاء، حبیب (نشاء کا بھائی) کے دوستوں کے گروپ کے ساتھ پریشے محض افق ارسلان سے ملنے راکاپوشی آتی ہے۔ افق بے حد نارمل انداز میں اس سے ملتا ہے۔ اس ملاقات میں افق ارسلان، پریشے کو ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر دکھاتا ہے۔ پریشے کے استفسار پر افق بتاتا ہے کہ یہ اس کی بیوی حنادے ہے۔ پریشے اس خبر پہ گم صم ہوجاتی ہے۔

پریشے واپس جانے کا فیصلہ کرلیتی ہے جس پر افق کو خاصی حیرت ہوتی ہے۔ غصے میں وہ حنادے کو برے القاب سے نوازتی ہے تو افق اسے بتاتا ہے کہ حنادے مرچکی ہے۔ پریشے کو اپنے رویّے کی بدصورتی کا احساس ہوتا ہے تو وہ افق سے معافی مانگ لیتی ہے۔

راکاپوشی ایکسپیڈیشن پر ان کا گروپ روانہ ہوتا ہے تو راستے میں موسم خراب ہے۔ ایک کریوس میں ارسہ گر کر مر جاتی ہے۔ یہ حادثہ افق اور پریشے کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ان کا ساتھی پورٹر بھی موسم کی خرابی کے باعث انہیں چھوڑ جاتا ہے۔ پریشے، افق کے ساتھ اس مہم کی جانب رواں ہوتی ہے کہ اچانک ایک ایوالانچ افق کو گہری کھائی میں دھکیل دیتا ہے۔ یہ صورت حال پریشے کے حواس مختل کردیتی ہے۔ وہ رسّی کے ذریعے افق کو ڈھونڈنے اکیلی نیچے اترتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۳

تیسری اور آخری قسط

”نہیں، وہ ادھر ہی ہو گا۔ میں ڈھونڈتی ہوں اسے۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔“ وہ خود کو دوبارہ رسّی پر Clip on کرکے، بڑبڑاتے ہوئے نیچے اترنے لگی۔

ہمالیہ کے عظیم پربتوں نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی اور وہ استہزائیہ ہنسے تھے۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔ تم دیکھتے رہنا، ظالم پہاڑو! میں اسے برف میں دفن نہیں ہونے دوں گی، میں اسے قراقرم کے قاتل پہاڑوں اور ہمالیہ کے ظالم آسمان سے دور لے جاؤں گی۔ تم دیکھتے رہنا۔“

وہ زور زور سے روتے اور چلاتے ہوئے نیچے اتر رہی تھی۔ ان بلند چوٹیوں نے پھر سے وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا تھا، مگر اب وہ انہیں نہیں سن رہی تھی۔ وہ افق کو تلاش کررہی تھی۔ اسے ہر حال میں افق کو برف سے باہر نکالنا تھا۔

تقریباً“ چالیس میٹر نیچے اتر کر اس نے خود کو رسّی سے آزاد ـــــ کیا چالیس میٹر اوپر اور سو میٹر دائیں طرف افق چند لمحے پہلے موجود تھا۔ وہ یقیناً“ وہیں کہیں گرا ہو گا۔ اسے اب سو میٹر دائیں طرف جانا تھا۔

وہ گھٹنوں تک برف میں دھنسی خود کو گھسیٹتی ہوئی دائیں طرف جانے لگی۔ اس کی ٹانگیں منجمد ہو کر لکڑی بن چکی تھیں، اس سے چلا نہیں جارہا تھا، مگر وہ کتنی ہی دیر چلتی رہی، پھر بالاخر نڈھال سی ہو کر وہیں برف میں گھٹنوں کے بل گر گئی۔

اس میں مزید چلنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ تیز تیز سانس لیتے ہوئے وہ باقاعدہ ہانپ رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر جسم پر طاری تھکاوٹ اور عجیب سی نقاہت کے باعث اس سے اٹھا ہی نہیں گیا۔

”افق۔“ وہ پھر سے حلق کے بل چلا کر اسے پکارنے لگی ”تم کہاں ہو؟“

بروکا گلیشئر خاموش رہا۔

آسمان سے بہت خاموشی سے برفباری ہوتی رہی۔

اس سے چلا نہیں جارہا تھا، سو دونوں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل برف میں crawl کرتے ہوئے، اپنا آئس ایکس برف میں مارتی وہ آگے بڑھنے لگی۔

وہاں ہر سو دودھیا سفید برف کی چادر بچھی تھی۔ کہیں کہیں سے جھلکتے سیاہی مائل سرمئی پتھر اور دیواریں بھی اب برف باری کے باعث چاندی سے ڈھک گئی تھیں۔ دور دور تک برف کا ایک نہ ختم ہونے والا صحرا پھیلا تھا اور اسے افق کو تلاش کرنے کے لیے وہ صحرا پار کرنا تھا۔

وہ گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے، ادھر ادھر برف پر بیلچہ مارتی، اسے توڑتی آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ اترائی یا چڑھائی کا سفر نہیں تھا، وہ دراصل پہاڑ کی ڈھلان پر شمال کی جانب بڑھ رہی تھی۔

وہ برفیلا میدان تھا۔ جانے سو میٹر ہوئے تھے یا نہیں کہ وہ ایک جگہ برف میں گر سی گئی۔ اب اس میں مزید حرکت کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ ذرا دیر کو سستانے کے لیے تنفس درست کرنے لگی۔

پھر اس نے گردن ادھر ادھر گھما کر دیکھا۔ افق کو اندازاً“ اسی جگہ کے قریب ہونا چاہیے تھا کیونکہ ایوالانچ کا پوٹینشل بہت شدید نہیں تھا کہ وہ بہت نیچے جا گرتا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے آس پاس ہی کہیں برف میں دبا سانس لے رہا ہو گا مگر وہ اسے کہاں ڈھونڈے؟

پریشے اپنے قریب برف میں ایکس مارتے ہوئے اسے توڑنے لگی کہ شاید وہ اس کے قریب ہی کہیں ہو۔ اس نے بہت سی برف کھود ڈالی مگر وہ کہیں نہیں تھا۔

وہ پھر سے برف پر تقریباً“ جھکی، گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی، ساتھ ساتھ وہ اسے آوازیں بھی دے رہی تھی مگر وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ پریشے کو جہاں جہاں کسی سیاہ سرمئی شے کی جھلک دکھائی دی، اس نے وہاں کی برف کھود ڈالی، مگر ہر جگہ برف کے نیچے سے وہی سیاہ پتھر نکلتے تھے جنہیں لوگ ترک زبان میں قراقرم کہتے تھے۔

برف باری تیز ہوتی جارہی تھی۔ وہ تھک کر حوصلہ

ہارنے ہی والی تھی جب اسے اس جگہ جہاں سے وہ غائب ہوا تھا' سے ٹھیک چالیس' پینتالیس میٹر نیچے دوبارہ گرے رنگ کی جھلک دکھائی دی۔ وہ اس کی طرف لپکی۔ اس کا رواں رواں دعا گو تھا کہ وہ افق ہی ہو۔ اس نے زور سے وہ گرے چیز کھینچی.... وہ افق ہی تھا۔

"افق .... افق۔" پاگلوں کی طرح اسے پکارتے ہوئے وہ اس پر سے برف ہٹانے لگی۔ وہ اوندھے منہ برف میں پڑا تھا۔ ہونٹ بالکل نیلے جامنی سے ہو گئے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ اس کے برف سے اٹے کپڑوں اور اردگرد برف پر لگے خون کے دھبوں کے علاوہ کوئی بھی شے کسی قیامت کی مانند گزر جانے والے ایولانچ کا پتہ نہیں دیتی تھی۔

"افق .... افق تم ٹھیک ہو؟ آنکھیں کھولو افق!" اس کو جھنجھوڑتے ہوئے' اس کا نیلا پڑتا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔ وہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا تھا؟ وہ بول کیوں نہیں رہا تھا؟

"افق! خدا کے لیے آنکھیں کھولو۔ پلیز اٹھو....." اس کے چہرے سے برف صاف کرتے ہوئے اس نے اس کا منجمد ہوتا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے مسلنے لگی۔

وہ ہلکا سا کھانسا منہ سے برف کے ذرّات باہر نکلے۔ پریشے نے طمانیت بھری گہری سانس اندر کو کھینچی..... وہ زندہ تھا۔ اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ ان ظالم پہاڑوں کے درمیان تنہا نہیں تھی۔

اب وہ آنکھیں نیم وا کر کے بمشکل سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سانس اکھڑی اکھڑی سی آ رہی تھی۔ پریشے نے اسے کندھوں سے تھام کر بٹھانے کی کوشش کی' تب اسے محسوس ہوا کہ وہ زخمی تھا۔ اس کے چہرے' ناک' اور گردن پر بڑی بڑی خراشیں پڑی تھیں جن پر خون جما تھا۔

اس کو بمشکل سہارا دے کر اس نے وہیں برف میں بٹھایا تو وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس کے چہرے کی رنگت واپس آنے لگی مگر وہ آنکھیں پوری نہیں کھول پا رہا تھا۔

"اٹھو..... کھڑے ہو' طوفان زور پکڑ رہا ہے۔ ہمیں جلد ہی کسی محفوظ جگہ پر پہنچنا ہو گا۔" برف باری کی تیز ہوتی رفتار اور سرد ہواؤں کے جھکڑوں کی خوف ناک آواز سے وہ پریشان سی ہو کر اسے سہارا دے کر کھڑا کرنے لگی' مگر زخمی ہونے کے باعث وہ اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا اس سے تو کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا' آنکھیں بھی اسی طرح ادھ کھلی تھیں۔ وہ نڈھال سا نیم بیہوشی کے عالم میں تھا۔

وہ اس کو کھڑا نہیں کر سکتی تھی' یہ ادراک ہوتے ہی اس نے اپنی کمر کے گرد بندھی کلا ئمبنگ ہارنس سے چھوٹی سی رسی باندھی' اسے افق کی ہارنس سے کیرابینر کی مدد سے نتھی کیا' پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے بازوؤں اور کندھوں کو پکڑے اسے برف میں گھسیٹنے لگی۔ تب اسے علم ہوا کہ اس کی دائیں ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کا بیک پیک غائب تھا۔

برف باری اب شدید قسم کی ژالہ باری میں تبدیل ہو رہی تھی۔ سرد ہواؤں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ آسمان کا رنگ یکایک سرمئی سے سفید ہو چکا تھا۔ ونیبلٹی' جو کچھ دیر پہلے اتنی زیادہ تھی کہ وہ نانگا پربت بھی دیکھ سکتی تھی' اب محض دو سو فٹ رہ گئی تھی۔ رسیوں سے بنایا گیا راستہ چند میٹر اوپر تک ہی واضح تھا اور آگے دھند میں گم ہو جاتا تھا۔ تیز چلتی برفیلی ہوائیں اسے ادھر ادھر لڑھکانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ بہ دقت اپنے قدموں پر کھڑی' اسے کسی لاش کی مانند کھینچ رہی تھی۔ سخت پتھروں کی طرح کے اولے اس کے سر پر پڑ رہے تھے۔ ہمالیہ کے پہاڑ اگر اس پر ہنس بھی رہے تھے تو اب وہ انہیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔

وہ افق کو گھسیٹتی نو دس میٹر نیچے لائی' پھر نڈھال سی ہو کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ اس کی باقاعدہ سانس چڑھ گئی تھی اور اس میں مزید ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک چھ فٹ کے اونچے پورے مرد کو اس کے بھاری بھرکم کپڑوں سمیت کھینچ کر چند قدم بھی نیچے لے جا سکے۔ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اسے نیچے جانا تھا یا اوپر۔ دونوں جانب جانے والے راستے دھند اور بادلوں میں گم ہو رہے تھے۔ کیمپ فور چند میٹر ہی اوپر تھا' مگر اوپر چڑھنا خود کشی تھا۔ کیمپ تھری خاصا نیچے تھا اور وہ افق کو اتنا نیچے نہیں لے جا سکتی تھی۔ برستی ژالہ باری اور چنگھاڑتے طوفان میں وہ ایک زخمی شخص کے ساتھ تنہا برف میں بیٹھی تھی۔

اس کا دماغ سن ہو چکا تھا' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ظالم طوفان میں وہ کس پتھر سے پناہ مانگے' کس serac wall کے پیچھے جا چھپے؟

سب کچھ جیسے خواب کی سی کیفیت میں ہو رہا تھا۔ ذہن ماؤف تھا' ٹانگوں سے قوت سلب تھی' بصارت چند میٹر تک محدود تھی۔ یا خدا' وہ کیا کرے؟

اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان مکمل طور پر سفید تھا اور سفید سفید سے پتھر نیچے برسا رہا تھا۔ تیز ہوائیں ڈراؤنی آواز کے ساتھ چل رہی تھیں۔ اس نے گردن ادھر ادھر گھما کر اپنے اطراف میں دیکھا۔ وہ برف میں جس جگہ بیٹھی تھی' اس سے تھوڑی دور تک ہی اس کی بصارت کام کر رہی تھی' آگے سب کچھ دھند اور گھنی برف باری میں غائب ہو جاتا تھا۔ جہاں تک وہ دیکھ سکتی تھی' وہاں تک برف کا میدان تھا' ہر طرف سفید برف تھی۔ وہ کسی برف کے صحرا میں بیٹھی تھی' جس کی سرحدیں نہیں تھیں۔ دنیا جیسے ختم ہو چکی تھی۔ سب برف تھا' سفید اجلی برف۔

اس کے اعصاب اب اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ دماغ مفلوج ہو چکا تھا۔

پھر اس نے افق کو دیکھا۔ وہ اس کے قریب برف پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں جیسے نیم بے ہوش ہو۔ پریشے کچھ بھی سن یا سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شدید سردی اس کی ہڈیوں میں گھس کر انہیں کھا رہی تھی بے حد ہائی ایلٹی ٹیوٹ کے باعث اس کا ذہن اور جسم آپس میں رابطہ نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ بس متلاشی نگاہوں سے اردگرد دیکھ رہی تھی جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ اسے آسمان سے پتھروں کی طرح گرتی برف سے بچاؤ کے لیے کچھ کرنا تھا۔ اس کی یادداشت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گو کہ اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی مگر لاشعوری قوت مدافعت بیدار تھی۔

اس ایلٹی ٹیوڈ پر ذہن کو ایک نقطے پر مرکوز کرنا' کچھ سوچنا بہت کٹھن تھا۔ اس نے بدقت تمام اپنا بیگ کھولا' آئس ایکس' (بیلچہ) snow shovel آئس اسکریوز اور کچھ رسی نکالی اور پھر' افق کو وہیں برف میں رسی سے باندھنے لگی۔ اس کی کمر کے گرد رسی باندھ کر دائیں اور بائیں رسی کو آئس اسکریوز سے برف میں ٹھونک دیا یوں کہ اب وہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس نے ایک دفعہ اس کی حفاظتی رسیوں کی مضبوطی چیک کی اور تسلی کر کے وہ نیچے اترنے لگی۔

طوفانی جھکڑوں اور شدید قسم کی برف باری کے دوران اسے بمشکل تیس میٹر نیچے ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم ملا جہاں وہ برف کھود کر خیمہ لگا سکتی تھی۔ پھر جانے کتنی دیر وہ برف میں پھاوڑا مارتے ہوئے برف کھودتی رہی' برف کا پاؤڈر سا اس کے چہرے اور کپڑوں پر گرتا رہا' ٹانگیں منجمد سی ہونے لگیں' افق وہیں اوپر سخت سردی میں زخمی پڑا رہا' پریشے کے ہاتھوں سے جان نکلنے لگی مگر وہ خیمہ لگ کے نہیں دے رہا تھا۔ طوفانی' ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہوا اسے ہر چند سیکنڈ بعد گرا دیتی' اور وہ پھر سے کھڑی ہوتی۔ ایک چھوٹا سا دو آدمیوں کا ٹینٹ اس نے کتنی مشکل سے اس تیز ہوا میں لگایا' یہ صرف وہی جانتی تھی۔

پھر وہ واپس گرتی پڑتی اوپر آئی۔ وہ اسی طرح برف اور پتھروں سے بندھا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند اور لب جامنی تھے۔ "افق۔" اسے پکارنے کے باوجود اس کے وجود میں جنبش نہ ہوئی۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آئی تیز ہوا اسے کھڑا بھی نہیں ہونے دے رہی تھی۔

"افق! اٹھو اور اندر چلو۔" اس کے کان کے قریب چیخنے پر اس نے آنکھیں کھولیں۔ پریشے نے اس کی رسیاں کھولیں' اسے دوبارہ خود سے باندھا اور سہارا

دے کر نیچے لائی۔ وہ چلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ غالباً" اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ٹانگ میں آنے والا زخم اتنا گہرا اور اذیت رساں تھا کہ خیمے کے فرش پر گرتے ہی وہ پھر سے کراہنے لگا تھا۔ وہ کبھی بھی درد سے کراہتا نہیں تھا' اب اگر کراہ رہا تھا تو یقیناً" شدید زخمی تھا۔

پریشے وہیں اس کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ خیمے کی گول چھت پر برف مسلسل گر رہی تھی مگر گور ٹیکس میں لگے دو ہیٹ لائٹرز کے باعث اندر اور باہر کے درجہ حرارت میں خاصا فرق پڑتا جا رہا تھا۔ اندر گرمائش تھی' پھر بھی اس کے دانت بج رہے تھے اور ٹانگیں لکڑی کی طرح سخت ہو رہی تھیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے گھسٹ کر اس کے قریب آئی اور اپنا بیگ کھول کر فرش پر الٹ دیا پھر فرش پر بکھرے سامان میں سے دستانے نکال کر افق کے ہاتھوں میں پہنائے' سلیپنگ بیگ میں اسے لٹایا کہ وہ اپنا سلیپنگ بیگ اپنے بیگ سمیت گم کر چکا تھا اور پھر میڈیکل کٹ سے ضروری سامان نکال کر اس کا زخم دیکھنے لگی۔

اس وقت اس کا تھکاوٹ اور سردی کے مارے برا حال تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ فوراً" کمبل اوڑھ کر سو جائے' مگر سامنے وہ شخص لیٹا تھا جس سے اس کی سانسوں کی ڈور بندھی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس کے لیے وہ دو دن پیدل برف زاروں کو عبور کر کے آئی تھی' جو اگر درد سے کراہتا تھا تو وہ درد اور گھاؤ پریشے کو اپنی روح میں لگتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ سو نہیں سکتی تھی۔ جب تک وہ پرسکون نہیں ہو جاتا تھا' اسے چین نہیں آسکتا تھا۔

اس کا زخم گہرا تھا۔ شاید ہڈی فریکچر ہو گئی تھی' خون بھی بہہ رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کسی حد تک گھٹنے کے باعث وہ ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہی تھی اور بمشکل پٹی کر رہی تھی۔ اس کی اپنی سانس بھی اکھڑ اکھڑ کر آ رہی تھی۔ وہ ڈیتھ زون میں تھی اور اس کے جسم کے خلیوں کو اس بات کا علم ہو چکا تھا۔ اس کے تمام خلیوں کو آکسیجن ٹھیک سے نہیں مل رہی تھی اور وہ اس کو اس بات کا بخوبی احساس دلا رہے تھے۔

چونکہ دماغ کو بھی آکسیجن نہیں مل رہی تھی' سو اس کا ذہن ماؤف سا ہو رہا تھا۔ اس کے جسم کے پاس تو آکسیجن کینسٹر بھی نہیں تھے۔ بیس کیمپ میں جب اس نے افق سے آکسیجن رکھنے کی بات کی تو اس نے لاپروائی سے انکار کر دیا تھا۔ "میں نے بگ فائیو بغیر آکسیجن کے سر کیے ہیں' کبھی کبھی دل کرتا ہے' دیکھوں تو سہی کہ میرے پھیپھڑے کتنا حوصلہ رکھتے ہیں۔"

اس کے پھیپھڑے جیسے بھی ہوں' وہ بہرحال کم آکسیجن کے عادی تھے مگر پریشے عادی نہیں تھی۔ اس نے اپنے طور پر کچھ آکسیجن ایمرجنسی سچویشن کے لیے رکھی بھی تھی مگر وہ لانا بھول گئی تھی۔ افق کے پاس ایک کینسٹر تو لازمی ہونا تھا' مگر وہ اپنا بیگ کھو چکا تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی غلطیاں بہت بڑی ٹریجڈی بنتی جا رہی تھیں۔

زخم صاف کر کے اس کی پٹی تو کر دی مگر فریکچر کے بارے میں وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔ اسے افق کو لازماً" بیس کیمپ لے کر جانا تھا۔ فریکچر ایسا تھا کہ سرجری ناگریز تھی مگر وہ نیچے کیسے جائے؟ وہاں جانے کے تو تمام راستے مسدود تھے۔

افق کو اس نے دوبارہ سلیپنگ بیگ پہنا دیا۔ زپ بند ہوتے ہی اس کے یخ جسم کو گویا ٹکور ملنے لگی اور اس کی نیم وا آنکھیں پوری بند ہو گئیں۔ وہ اسی پوزیشن میں آدھا بیٹھا' آدھا لیٹا سو گیا۔

پریشے کے پاس اب کوئی سلیپنگ بیگ نہیں تھا' صرف دو لائنرز تھے جن کو لپیٹ کر بھی وہ ٹھٹھر رہی تھی۔

ٹوٹی ٹانگ اور گہرے زخم کے باوجود وہ کیسے پرسکون سا ہو کر سو رہا تھا' وہ اس کے قریب' دیوار سے ٹیک لگائے بوجھل ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ افق کو سیدھا کرے یا خود سیدھی ہو کر لیٹ جائے وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی۔

نیند میں اسے عجیب عجیب خواب آتے رہے۔ جو آخری خواب آیا' اس میں اس نے دیکھا کہ وہ خود' احمت' افق' ارسہ' حبیب' نشاء' **مصعب**' جاپانی ٹورسٹ' پاک آرمی کے پائلٹس' وہ سب کیمپ فور میں ایک ہی خیمے میں دبکے بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہیں۔ خشک میوے' گرم چائے اور ہاٹ چاکلیٹ سرو کی جا رہی ہے۔ شفالی بھی وہیں تھا' اور اس کا اپنا ملازم وحید بھی۔ شفالی اور وحید کی شکلیں بہت مل رہی تھیں۔

کوئی اس کا گھٹنا جھنجوڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔

نہ وہاں شفالی تھا' نہ وحید' نہ آرمی کے پائلٹس' سب کچھ راکاپوشی کی کیٹلی ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے خیمے میں تھی اور اس کا گھٹنا ہلانے والا افق تھا۔

"ہاں..... کیا؟" پریشے کا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا۔ باہر طوفان کا شور ابھی تک جاری تھا۔ وہ کتنے گھنٹے بے خبر سوتی رہی' اسے اندازہ نہ تھا۔

"پانی دو..... گرم پانی۔" بہت دقت سے وہ آہستہ آہستہ یوں بولا جیسے بولنے سے بھی اسے تکلیف ہوتی ہو۔ وہ خیمے کی دیوار سے ٹیک لگائے ٹانگیں سیدھی پھیلائے بیٹھا تھا۔ دونوں کے درمیان پریشے کے رک سیک سے نکلنے والی اشیاء کا ڈھیر تھا۔ وہ اس کی بات پر سر ہلاتے ہوئے فرش پر سے چیزیں سمیٹنے لگی۔

ایولانچ میں افق کے گم ہونے والے بیگ میں کھانے کا زیادہ تر سامان اور رسی تھی۔ پریشے کے پاس گیس' آئس اسکریوز (برف میں لگائی جانے والی میخیں) پی ٹونز اور کچھ رسی تھی۔ کھانے کے نام پر اس کے بیگ میں بس ایک دن کا کھانا تھا جو ڈی ہائیڈریٹڈ تھا اور اس کی برف پگھلانے اور اسے ری ہائیڈریٹ کر کے اصل حالت میں لانے کے لیے انہیں فیول کی بے تحاشا ضرورت تھی' جو کہ اس وقت محض دو سے تین دن کی بچی تھی' وہ بھی صرف پانی بنانے کے لیے۔ دو سے تین دن کا دورانیہ کم ہو سکتا تھا اگر وہ کھانا بھی گرم کرنے لگتی' سو اب اس کے لیے وہ تمام فوڈ سپلائی بے کار تھی۔ وہ گیس ضائع کرنا افورڈ نہیں کر سکتی تھی' کیونکہ اس بلندی پر انسان بغیر کچھ کھائے بھی ہفتہ بھر زندہ رہ سکتا ہے' مگر پانی۔

وہ بے رنگ مائع جو زمین پر صرف آب ہوتا ہے' پہاڑوں پر آب حیات ہوتا ہے۔ بغیر کچھ پیئے وہ چند گھنٹوں میں ہی مر جاتے۔ البتہ بھوک دونوں کو نہیں لگی تھی' نہ ہی اس بلندی پر لگتی تھی۔

پریشے نے اپنا high attitude stove جلایا' چھوٹے سے پین میں برف توڑ کر ڈالی اور اسے پگھلانے لگی۔ خیمے کی چھت پر برف مسلسل پڑ رہی تھی مگر صد شکر کہ وہ اس زاویے سے نصب تھا کہ برفانی طوفان خیمہ اکھاڑ یا گرا نہیں سکتا تھا۔

برف پانی بن گئی تو اس نے آخری چاکلیٹ سے کچھ ہاٹ چاکلیٹ بنائی۔ ہاٹ چاکلیٹ اور گرم چائے افق کو پلائی' خود صرف گرم پانی پر گزارہ کیا۔ اپنے حصے کی چائے بھی وہ افق کو دے چکی تھی۔

جسم کو کچھ گرم مائع ملا تو دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہوا۔ افق کی توانائی بھی قدرے بحال ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید درد کے آثار رقم تھے مگر وہ اب کراہ نہیں رہا تھا' بلکہ خیمے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور وہ دھیرے دھیرے کچھ گنگنا رہا تھا۔

یہ وہی گانا تھا جو اس روز وہ بیس کیمپ میں ہنزہ و کثر لوگوں کو سنا رہا تھا۔ اور کئی دن پہلے برستی بارش میں وائٹ پیلس کے موروں کو سنایا تھا۔

we are leyla

we are mecnun

اس کی آواز بے حد دھیمی تھی مگر اس نے سن لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ تکلیف اور دکھ میں ہمیشہ گنگنایا کرتا تھا۔

"یہ لیلیٰ کی تو سمجھ آتی ہے' مگر Mecnun کون ہے افق؟"

افق نے آنکھیں کھولیں جو بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

"مجنوں!" ایک لفظ کہہ کر اس نے دوبارہ سے آنکھیں موندلیں۔

"ارے!" اسے حیرت ہوئی "یہ لیلیٰ مجنوں ترکی

میں بھی ہوتے ہیں؟"

"ہاں، مجنوں ترک بھی ہو سکتا ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرایا اور پھر بند آنکھوں سے دوبارہ گنگنانے لگا۔

"وی آر لیلیٰ، وی آر مجنوں۔" یہ وہ پہلی نارمل بات تھی جو دونوں نے طوفان میں پھنس جانے کے بعد کی تھی۔ یہ گرم پانی کا اثر تھا۔ آبِ حیات کا اثر۔

افق کچھ دیر گنگناتا رہا، پھر خاموش ہو گیا کہ اب اس پر نقاہت طاری ہو رہی تھی۔ پریشے بھی اپنے ذہن کو مجتمع کر کے اس سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی جس سے اس کا زندگی میں پہلی بار پالا پڑا تھا اور جب حالات سمجھ میں آنے لگے تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔

اس کا میٹر اسے بتا رہا تھا کہ وہ 7437 میٹر ہائٹ پر سخت برفانی طوفان کے درمیان ایک خیمے میں پھنسی بیٹھی ہے۔ اس کے ساتھ ایک ایسا زخمی کوہ پیما ہے جس کا زخم نہ صرف اس کو چند قدم بھی چلنے سے معذور کر چکا ہے، بلکہ زخم کے باعث اس کی ٹانگیں کم وقت میں فروسٹ بائٹ ہو کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتی ہیں۔ اس کے ایک پاؤں کی دو انگلیاں پہلے بھی فروسٹ بائٹ ہو چکی تھیں، اور پرانے زخم تو ویسے بھی فروسٹ بائٹ کے عمل کے دوران تیز ترین catalyst بن جایا کرتے ہیں۔ فروسٹ بائٹ کو صرف ایک عنصر روک سکتا تھا اور وہ تھا پانی۔ ڈی ہائیڈریشن کا مطلب تھا فروسٹ بائٹ، اور ڈی ہائیڈریشن جمع ہائی ایلٹی ٹیوٹ کا مطلب تھا سیربرل ایڈیما یا پلمنوی ایڈیما۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ اسے جلد از جلد افق کو وہاں سے نکالنا تھا۔ اس کے پاس صرف اسی میٹر رسی تھی اور اسے کئی ہزار میٹر نیچے اترنا تھا۔ (بیس کیمپ 3400 میٹر پر تھا) اگر وہ جلدی افق کو وہاں سے نہیں نکالتی تو وہ مر بھی سکتا تھا۔ اسے کچھ سوچنا تھا کچھ کرنا تھا۔

اوپر جانے اور چوٹی سر کرنے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ افق کی مخصوص اور خالص کوہ پیماؤں والی ضد کے باعث
وہ turn ground time کا آپشن ختم کر چکے تھے۔

کوہ پیمائی میں ایک ٹرن اراؤنڈ ٹائم ہوتا ہے۔ پیچھے مڑنے کا وقت پہاڑوں پر موسم پل پل بدلتا ہے۔ کوہ پیما تعین کرتے ہیں کہ اگر آج اتنے بجے تک ہم نے چوٹی سر کر لی تو ٹھیک، ورنہ اتنے بجے تک ہم جہاں بھی ہوئے، واپس مڑ جائیں گے۔ عموماً کوہ پیما نہ پلٹنے کی غلطی کرتے ہیں، یہی غلطی افق ارسلان نے بھی کی کہ وہ بہرحال کوئی افسانوی کردار نہیں، ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔

اب انہیں راکاپوشی کے ناقابل تسخیر رج کو ناقابل تسخیر ہی چھوڑ کر واپس جانا تھا اور واپس جانے کے لیے طوفان کا رکنا ضروری تھا جو کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ نہ وہ اوپر جا سکتے تھے، نہ نیچے اور نہ ہی بیٹھے رہ سکتے تھے۔ خدایا وہ کیا کرے؟

بڑی دیر بعد کہیں جا کر وہ ایک نتیجے پر پہنچی۔ اس نے ٹرانسیور نکال کر احمت سے رابطہ کیا اور بغیر کسی تمہید کے کہنے لگی۔

"احمت...... احمت افق زخمی ہے، ہم کیمپ فور اور کیمپ تھری کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں۔ باہر سخت طوفان ہے، ہمیں ہر حال میں نیچے اترنا ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

"افق زخمی ہے؟ اسے کیا ہوا؟" حسب توقع وہ پریشان ہو گیا۔

"صبح ایولانچ آیا تھا۔ افق کی رسی ٹوٹ گئی اور وہ 40 میٹر نیچے گرا ہے۔ ٹانگ کی ہڈی فریکچر ہوئی ہے اور چوٹیں بھی شدید ہیں۔" سخت سردی کے باعث اس کے بجتے دانت اسے بولنے نہیں دے رہے تھے۔

"اوہ تم یوں کرو، اس کے فریکچر کو۔"

"فار گاڈ سیک احمت! میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے پتا ہے مجھے اس کے فریکچر کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے ایک دم غصے سے بات کاٹی۔ پل بھر کو احمت خاموش سا رہ گیا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"میں آئی ایم سوری احمت ..... میں بہت ٹینس ہوں..... پلیز ناراض مت ہونا۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"ریلیکس پریشے! جب طوفان رکے تو تم نیچے اُتر آنا — اس طرح پریشان ہونے سے تمہارے اعصاب پر برا اثر پڑے گا۔ خود کو calm (پرسکون) کرو۔"

"میں خود کو کام نہیں کر سکتی احمت! ہماری پوزیشن بہت خراب ہے۔ افق شدید زخمی ہے۔ وہ ڈیسنڈ نہیں کر سکتا۔ اسے شدید درد ہو رہا ہے۔" احمت سے بات کرتے ہوئے اس نے ایک فکر مند نگاہ افق پر ڈالی جو آنکھیں موندے شدت ضبط سے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست کیے بیٹھا تھا۔

"تم اس کو پین کلر دو۔"

"مگر اس کی ٹانگ نہیں کام کر رہی۔ وہ چل نہیں سکتا تم میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟" شدید ڈپریشن پھر سے غصے میں ڈھلنے لگا۔

دفعتاً" افق نے آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کا گھٹنا ہلایا۔ پریشے نے بولتے بولتے رک کر اسے دیکھا۔

"انقرہ کال کرو..... جینیک کو..... اس سے ویدر کنڈیشن پوچھو۔" وہ نقاہت بھرے لہجے میں آہستہ آہستہ' رک' رک کر بول رہا تھا۔ پریشے نے سمجھ کر سر ہلایا اور ریڈیو میں بولی۔

"احمت.....! انقرہ کال کرو جینیک کو اور اس سے ویدر کنڈیشن کے بارے میں....."

افق نے جھنجلا کر نفی میں سر ہلایا۔ "احمت نہیں' تم پوچھو' پری!"

"میں؟ میں کیسے پوچھوں؟"

"سیٹلائٹ فون تھا تمہارے پاس۔"

"وہ ہاں..... احمت! میں تم سے پھر بات کرتی ہوں۔ آؤٹ" (Out) اس نے ٹرانسیور بند کر دیا اور جھٹ بیگ سے سیٹلائٹ فون نکال کر اسے تھمایا۔

وہ خود ہی کتنی دیر کسی سے بات کرتا رہا۔ تھکا تھکا لہجہ' نقاہت اور پژمردگی سے آنکھیں موندے' وہ یقیناً" شدید کرب کے عالم میں تھا۔

"ویدر کلیئرنس کا امکان اگلے اڑتالیس گھنٹے تک کوئی نہیں ہے۔ خدایا۔" فون بند کر کے اس نے پریشے کو تھمایا۔

وہ دو دن اس سردی اور موسم میں گزارا کر لیتی مگر افق..... اس نے پھر سے احمت سے رابطہ کیا اور اسے تمام حالات سمجھائے۔

"اب کچھ کرو احمت! ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔"

"میں کچھ کرتا ہوں' تم فکر نہ کرو۔"

"کیسے فکر نہ کروں؟ وہ..... وہ مر جائے گا' احمت ..... خدا کے لیے کچھ کرو ورنہ وہ مر جائے گا۔" شدت بے بسی سے اسے رونا آگیا۔

"میں کیا کروں؟" اس کے رونے پر وہ بوکھلا سا گیا۔ "یہاں بیس کیمپ میں میرے اور شفالی کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں۔"

"کسی بھی اتھارٹی سے بات کرو کہ وہ ہمیں یہاں سے ریسکیو کریں۔ الپائن کلب آف پاکستان سے کہو' نذیر صابر سے کہو' منسٹری آف ٹورازم سے کہو' کسی سے کہو خدا کے لیے۔"

"میں کچھ کرتا ہوں۔ تم میری کال کا انتظار کرو۔" احمت نے کہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

پریشے کچھ دیر سوچتی رہی' پھر اس نے دوبارہ احمت کو کال کیا۔

"احمت! سنو' تم پاکستان آرمی سے بات کرو۔ ان سے کہو کہ کلائمبرز کو evacuate کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر بھیجیں۔"

دوسری جانب تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"ڈاکٹر پریشے! کیا ہائی ایلٹی ٹیوڈ پر انسان کا دماغ بھی خراب ہو جاتا ہے؟"

"کیوں؟ کیا غلط کہا ہے میں نے؟"

"میری بات غور سے سنو۔ اس وقت پوری دنیا میں کوئی ایسا پائلٹ پیدا نہیں ہوا جو تمہیں ساڑھے سات

ہزار میٹر ہائٹ سے ریس کیو کر سکے۔ اس سے پہلے کہ تمہاری انرجی اور ہمت جواب دے دے' تم نیچے اترنے کی کوشش کرو۔ یہی تمہارے مسئلے کا واحد حل ہے۔"

"میرے استادمت بنو اور پاکستان آرمی سے بات کرو۔"

اس نے ریڈیو رکھ دیا اور افق کو دیکھا جو سر جھکائے یوں شکست خوردہ سا بیٹھا تھا کہ جیسے سارا حوصلہ اور ہمت ہار چکا ہو۔

"افق!" پریشے نے دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے گردن اٹھائی۔ "کیا بہت درد ہو رہا ہے؟"

اس نے آہستہ سے گردن کو نفی میں جنبش دی۔ "نہیں' درد تو نہیں ہو رہا۔" اسے جتنا درد ہو رہا تھا' یہ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں تحریر تھا۔

"کیا تم نیچے اتر سکتے ہو؟ کم از کم کیمپ تھری تک؟" بغور اس کے چہرے اور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے یوں نرمی سے پوچھا جیسے کوئی ڈاکٹر سامنے بیٹھے چھوٹے سے بچے سے اس کی طبیعت پوچھ رہا ہو۔

اس نے خاموشی سے گردن کو نفی میں جنبش دی۔

"چند میٹر بھی نہیں؟"

"اس طوفان میں اس ٹانگ کے ساتھ؟ نو نیور!"

اس نے سر نفی میں ہلایا۔ وہ پورے پورے فقرے نہیں بول پا رہا تھا' مگر وہ بہرحال مطلب سمجھ سکتی تھی۔

"اچھا دیکھو' اس ٹینٹ میں جتنا ہو سکتا ہے ٹانگیں بازو ہلاتے رہو۔ گرم رہو گے اور فروسٹ بائٹ سے بچ بھی جاؤ گے۔" وہ خود بھی یہی کر رہی تھی مگر افق ویسے ہی خاموشی سے بیٹھا خیمے کی سامنے والی دیوار پر نگاہیں جمائے جیسے کچھ سوچتا رہا۔

پھر کتنی ہی دیر گزر گئی اور احمت نے کوئی رابطہ نہ کیا۔ طوفان ابھی تک اسی طرح راکاپوشی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ باہر مسلسل اولے پڑنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ پریشے نے خیمے کی کھڑکی سے جھانکا۔ باہر مکمل وائٹ آؤٹ تھا۔ وزیب لیٹی محض ایک میٹر رہ گئی تھی۔

رات کٹ کے نہیں دے رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ صدیوں سے بھاری تھا۔ وہ دونوں اسی طرح بغیر کوئی بات کیے خیمے میں بیٹھے رہے۔ پریشے کو احمت کی کال کا انتظار تھا۔

"وہ یقیناً" اتھارٹیز سے رابطہ کر رہا ہو گا جس کے باعث اسے دیر ہو رہی ہے۔"

وہ خود کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ تمام زبانی یاد سورتیں اور آیتہ الکرسی وغیرہ پڑھ رہی تھی' مگر طوفان نہ تھما۔ وہ شہروں میں آنے والا طوفان نہیں تھا۔ وہ ہمالیہ کا snowstorm تھا جو بغیر رکے کئی دن تک جاری رہ سکتا ہے۔ قاتل برفانی طوفان اور مکمل وائٹ آؤٹ۔

اچانک ریڈیو میں شور سا پیدا ہوا۔ وہ اس کی جانب لپکی۔

"ہیلو احمت؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"ہاں ڈاکٹر..... سنو میں نے ترک گورنمنٹ سے بات کی ہے' انہوں نے تمہارے فارن منسٹر سے رابطہ کیا ہے۔"

"پھر؟"

"ہاں وہ کہہ رہا ہے کہ آرمی سے بات کرے....."

"کب کرے گا وہ آرمی سے بات؟ پلیز احمت' تم خود آرمی سے بات کرو..... مجھے ان حکومتی اہلکاروں پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"تم میری پوری بات کیوں نہیں سنتیں؟ میں ادھر بیٹھا جھک تو نہیں مار رہا۔ اب اپنا منہ بند رکھو اور میری بات سنو۔ میں نے سوئس پائلٹس سے سب سے پہلے رابطہ کیا ہے جنہوں نے ابھی ایورسٹ پر ریسکیو آپریشن کیا تھا۔ وہ وولنٹیئر کر رہے ہیں مگر ان کی فلائٹس کا پرابلم ہے۔ ان کو تین سے چار دن لگ سکتے ہیں اور۔"

"مگر افق کے پاس تین سے چار دن..... سوری تم بات مکمل کرو۔"

"تم بھی نا! اچھا سنو۔ سوئس کا آنا مشکل ہے' مگر

تمہارے فارن منسٹر نے پاکستان آرمی سے رابطہ کیا ہے۔ میں اتنی دیر تک آرمی والوں کی کال کا انتظار کرتا رہا تھا۔ ابھی دس منٹ پہلے ان سے میری بات ہوئی ہے۔ انہوں نے تمہارے ریڈیو کی فریکوئینسی پوچھی ہے اور تمہارے کپڑوں کا رنگ وغیرہ اور یہ کہ تم انگریزی بول سکتی ہو یا نہیں۔ میں نے کہا کہ بول سکتی ہو' ٹھیک کہا نا؟"

"تو میں تم سے فرنچ میں بات کر رہی ہوں کیا؟"

"نہیں میرا مطلب ہے' وہ تمہاری آرمی ہے۔ تم ان سے اپنی زبان میں بھی بات کر سکتی ہو۔"

"اچھا وہ کب آئیں گے؟" اس نے بے قراری سے پوچھا۔

"آئیں گے کیا مطلب؟ وہ ابھی تم سے رابطہ کریں گے۔ ہر کام آرام سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر! وقت صرف تمہاری طرف سست روی سے گزر رہا ہے۔ زمین پر تو ہمیشہ کی طرح بھاگ رہا ہو گا۔"

پھر چند مزید باتیں کر کے اس نے ریڈیو رکھ دیا اور گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے تھکاوٹ سے افق کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ بہت اداس تھی۔

"وہ ابھی آجائیں گے' تمہیں بس چند قدم چل کر ہیلی کاپٹر میں جانا ہو گا۔ چل لو گے نا؟" اس نے ہولے سے افق کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"چل لوں گا' اگر وہ آئے تو!"

"کیا مطلب اگر وہ آئے تو؟ وہ ضرور آئیں گے۔ تم مایوس مت ہو۔" وہ اس سے زیادہ خود کو تسلی دے رہی تھی۔ اس نے ہولے سے سر جھٹک کر پھر سے آنکھیں موند لیں۔

رات قطرہ قطرہ بھیگتی رہی چنگھاڑتی ہواؤں کی ناقابل برداشت بلند آواز مسلسل اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ وہ بمشکل چند گھنٹے سو سکی۔ صبح کے قریب اس کے ریڈیو نے اسے پکارا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اسے علم ہوا کہ تیز برفانی ہوا اسے خیمے کے اندر ہی اندر ادھر ادھر لڑھکاتی رہی تھی' اور اب وہ نیم دراز سی تھی' ایک پاؤں خیمے سے باہر جا رہا تھا اور یخ ہو چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پاؤں اندر کیا اور ریڈیو اٹھا کر کان سے لگایا۔

"کم ان ایکسپیڈیشن ٹیم۔ دس از آرمی ایوی ایشن۔" آواز تھی یا نئی زندگی کی نوید اس کی جیسے تمام تھکن اتر گئی۔

"آئی ایم ہیر' سر۔" اس نے ریڈیو کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

"ڈاکٹر پریشے جہاں زیب آر افق ارسلان؟" بھاری' رعب دار آواز میں پوچھا گیا۔

"پریشے جہانزیب۔"

"دس از کرنل فاروق' ڈاکٹر جہاں زیب!"

"آئی نو' سر!" وہ خوشی سے بولی۔ وہ یقیناً" اس کو بچانے آرہے تھے اور ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے سے قبل اس کو اپنی آمد سے آگاہ کرنے والے تھے' اس نے سوچا۔

"اوکے' گیو می یور اسٹیٹس' پریشے۔"

"ہم نے ایک ٹینٹ پچ کر رکھا ہے جس کا رنگ اورنج ہے' یہ کیمپ تھری سے خاصا اوپر ہے۔" وہ اب اردو بولنے لگی۔

"اور بیٹا' آپ کے کپڑوں کا رنگ۔"

"میں نے پنک اور لائٹ گرین جیکٹ پہن رکھی ہے۔ میرے ساتھی کی گرے جیکٹ اور ریڈش براؤن ٹراؤزر ہیں۔ سر پر بلو ہیلمٹ ہے' اوور۔" یہ اتنا رنگ برنگا حلیہ صرف برف میں واضح نظر آنے کے لیے تھا۔

"اوکے اب مجھے اپنی لوکیشن دیں ٹھیک ٹھیک۔ پہاڑ کی ڈھلان اور فیس کا اینگل بتائیں۔"

وہ بتانے لگی' پھر وہ بولے۔ "اوکے' اب آپ میری بات غور سے سنیں ہم جلد ہی آپ کو لینے آجائیں گے۔"

اسے لگا اس نے غلط سنا ہے۔ "آجائیں گے؟ آپ کا مطلب ہے آپ آ نہیں رہے؟"

"طوفان بہت شدید ہے ڈاکٹر پریشے۔ وزیبلٹی نیں ہے۔"

"تو جب طوفان رکے گا' تب تو آپ آجائیں گے نا؟" وہ کسی امید کا سہارا لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"جی بالکل۔ اب آپ بتائیں' تقریباً" کیا ایلٹی ٹیوڈ ہو گا آپ کا؟" اس نے فوراً" میٹر دیکھا۔ "7437 میٹر۔"

دوسری جانب چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی' پھر ریڈیو سے آواز ابھری۔

"تو پھر آپ یوں کریں کہ کم از کم ساڑھے انیس ہزار تک آجائیں۔"

"میں ساڑھے سات ہزار پر ہوں' آپ انیس ہزار کی بات کر رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" اب اسے کوفت ہونے لگی۔

"میڈم! آپ انیس ہزار فٹ تک ڈیسنڈ کر لیں۔"

"فار گاڈ سیک کرنل فاروق مجھے میٹرز میں بتائیں۔" وہ جھنجلائی۔

"اوکے' آپ تقریباً" چھ ہزار میٹر تک نیچے اتر آئیں۔"

پریشے کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"کرنل صاحب! میرا ساتھی "شدید" زخمی ہے۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اس سے ڈیڑھ قدم نہیں چلا جاتا اور آپ مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں ایک زخمی کو لے کر ڈیڑھ ہزار میٹر نیچے اتروں؟ آر یو آؤٹ آف یور مائنڈ؟" اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"دیکھیں پریشے! چھ سوا چھ ہزار میٹر سے اوپر دنیا کا کوئی ہیلی کاپٹر نہیں آسکتا۔ ہم آپ کو اسی صورت ریسکیو کر سکتے ہیں کہ طوفان رک جائے اور آپ ڈیسنڈ کر لیں۔"

"مگر میرا ساتھی زخمی ہے۔ وہ نہیں چل سکتا۔ اوپر آپ نہیں آسکتے' نیچے میں نہیں جا سکتی' میں کروں تو کیا کروں؟"

افق نے اس کے ہاتھ پر ہولے سے اپنا ہاتھ رکھ کر اسے اپنا غصہ دبانے کا اشارہ کیا مگر وہ شدید فرسٹریٹڈ ہو رہی تھی۔

"طوفان تھم جائے تو آپ کوشش کریں۔" کرنل صاحب کا لہجہ اتنا پر سکون اور ٹھنڈا تھا کہ پریشے کو لگا' وہ اس معاملے میں دلچسپی ہی نہیں لے رہے۔

"انہیں کہو' میں کوشش کرتی ہوں اور ڈیسنڈ کر کے آپ کو بتاتی ہوں۔" افق کی ہدایت پر اس نے وہی کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور ریڈیو فرش پر رکھ کر اسے دیکھا۔

"عجیب بے حس لوگ ہیں' کوئی اوپر مر رہا ہے اور انہوں نے رٹ لگا رکھی ہے کہ نہیں آسکتے' نہیں آسکتے۔" وہ بڑبڑائی۔

"وہ واقعی نہیں آسکتے' وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں جانتا تھا وہ نہیں آئیں گے' میری پوری زندگی ہمالیہ میں گزری ہے' اس لیے تمہیں کہا تھا اگر وہ آئے تو میں چل لوں گا چھ ہزار میٹر سے اوپر ہوا اتنی پتلی اور دھند اتنی شدید ہوتی ہے کہ ہیلی کاپٹر وہاں نہیں آسکتا۔" وہ آہستگی سے کہتا' اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو پھر ہم نیچے کیسے اتریں؟ میں کیا کروں؟" وہ بے حد پریشان تھی۔

وہ کتنی ہی دیر اسے چپ چاپ دیکھتا رہا' پھر بالآخر چند قدم گھسٹ کر اس کے نزدیک آیا اور اس کے بالکل مقابل بیٹھ کر اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میری بات غور سے سنو اور جو میں کہوں' ویسے ہی کرو تمہیں یاد ہے پری! میں نے تمہیں ایک دفعہ بتایا تھا کہ میری ماں بہت بہادر ہے۔"

وہ سمجھی تھی افق اسے نیچے اترنے کے کسی منصوبے اور حکمت عملی کے متعلق بتائے گا مگر وہ نہایت غیر متعلقہ بات کر رہا تھا۔

"ہاں مجھے یاد ہے' مگر اس وقت۔"

"میری ماں بہت بہادر ہے پری! اس نے اپنے تین جوان بیٹوں کی موت کا غم سہا ہے۔ اس کے بیٹوں کے بعد ان کے بچے اس کے پاس ہیں اور وہ ان میں بہت خوش اور مگن ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے افق! مگر کرنل صاحب کہہ رہے

ہیں کہ ہمیں....."

"یقین کرو پری! میرے ماں باپ کے پاس دوسری کئی مصروفیات ہیں۔ وہ خود کو زندگی کے جھمیلوں میں گم کرسکتے ہیں اور ان کے لیے یہ مشکل نہیں ہوگا۔"

اس نے جیسے پریشے کی بات سنی ہی نہیں تھی' اور پتہ نہیں کون سے قصے لے کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ الجھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تمہاری نومبر میں شادی ہے۔ تمہیں اس کی تیاری کرنی ہوگی۔ نشاء تو نہیں مانتی مگر شاید تمہاری پھپھو تم سے بہت محبت کرتی ہوں اور تمہارے پاپا بھی تو ہیں نا۔ ان کی زندگی میں ایک واحد رشتہ تم ہو پری! میرے ماں باپ کی اور بات ہے۔" وہ رک رک کر' ٹھہر ٹھہر کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میرے ماں باپ عادی ہو چکے ہیں۔ ان کے دو بیٹے اور بھی ہیں' مگر تم اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہو۔"

ایک دم پریشے کے لاشعور میں خطرے کا الارم بجا۔

"تم..... تم کھل کر بات کرو افق!"

"پری! یہ سب صرف اور صرف میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں تمہیں اس جگہ پھنسانے کا ذمہ دار ہوں' کیونکہ میں نے جلدی ٹرن اراؤنڈ نہیں کیا۔ ورنہ اس وقت تم بیس کیمپ میں ہوتیں۔" وہ پلک جھپکے بغیر اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"نہیں افق! میں تو خود..... تم' تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟ اس طرح بات کیوں کر رہے ہو' ہاں؟ کرنل فاروق نے کہا ہے کہ ہم جیسے ہی ڈیڑھ ہزار میٹر ڈیسنڈ کریں گے' وہ ہمیں لینے آئیں گے۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ان کو کہوں کہ میں کوشش کرتی ہوں۔" اس نے اسے یاد دلایا۔

افق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میں نے ٹھیک کہا تھا۔ تم کوشش کرکے ڈیسنڈ کر سکتی ہو۔"

اس کے لہجے میں کچھ تھا جس پر وہ بری طرح چونکی۔ "تم؟ کیا مطلب ہے تم؟" اس کو اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔

"پری! تم نیچے جاسکتی ہو۔ تم نیچے چلی جاؤ۔"

"افق!" پریشے نے تڑپ کر اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑایا۔

"خدا کے لیے پری! جذباتی مت بنو۔ میری وجہ سے خود کو خطرے میں مت ڈالو۔ تم نیچے چلی جاؤ۔ پلیز چلی جاؤ۔"

وہ سناٹے میں رہ گئی۔

"تم' افق! تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہیں اس برفانی طوفان میں چھوڑ کر اکیلا چھوڑ کر' یہاں سے چلی جاؤں؟"

وہ بے یقینی سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں تم چلی جاؤ۔ پلیز چلی جاؤ۔ وہ اوپر کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ چھ ہزار میٹر سے اوپر کبھی نہیں آسکیں گے۔ تم نیچے اتر جاؤ۔ میری فکر مت کرو۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں کہتا پیچھے کو بیٹھ گیا۔

"تمہیں..... تمہیں چھوڑ کر؟ اس..... اس ٹینٹ میں چھوڑ کر؟" وہ حیران تھی' بے یقین تھی۔

"میں نیچے نہیں جا سکتا پری! میں کبھی بھی نیچے نہیں جاسکوں گا۔ میں جانتا ہوں' میں مرجاؤں گا اور اگر تم میرے لیے ادھر رہیں تو تم بھی مرجاؤ گی۔ تمہارے پیچھے بہت سے لوگ ہیں جو تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ پائیں گے۔ تمہارے باپ کے اور بچے نہیں ہیں۔ پریشے! میرے لیے اپنی اور خود سے جڑے لوگوں کی زندگیاں خطرے میں مت ڈالو۔ تم بہت سے لوگوں کی زندگی ہو۔ میرا کیا ہے؟ میں تو کوہ پیما ہوں۔ مجھے ازل سے علم تھا کہ میری موت پہاڑوں میں ہی آنی ہے۔ میں نے ہمالیہ میں ہی مرنا ہے۔ میرا کیا ہے پریشے! میرے لیے کوئی نہیں روئے گا۔"

اس نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر اس نے تیزی سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"تم..... تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟ میں اتنی خود غرض اور بے حس ہوں کہ تمہیں یہاں چھوڑ کر چلی جاؤں گی' ہاں؟ کیا سمجھتے ہو تم مجھے؟ بلکہ تم تو۔ تم تو افق مجھے کچھ سمجھتے ہی نہیں ہو' تم تو مجھے سمجھ ہی نہیں سکے۔" اس کی آواز آنسوؤں سے رندھنے لگی "کیا سمجھ کر تم نے مجھے یہ سب کہا؟ تمہیں لگتا ہے تمہارے کہنے پر میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟ اتنی بری ہوں میں؟"

"پاگل مت بنو اور چلی جاؤ۔ خدا کے لیے چلی جاؤ ورنہ تمہارے باپ کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔ یہ سب میری غلطی تھی' میں تمہیں ان پہاڑوں میں لایا تھا۔ پھر ایولانچ کے بعد تم نے میری جان بچائی' میری پٹی کردی' بہت شکریہ۔ اس سے زیادہ تم میرے لیے کچھ نہیں کرسکتیں۔ میں جانتا ہوں میں مرجاؤں گا' میں کبھی بھی نیچے نہیں جاسکوں گا۔ میں ہمالیہ سے Belong کرتا ہوں' اور مجھے ہمالیہ میں ہی مرنا ہے۔ میں ادھر ہی خوش ہوں۔" وہ تھک کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"میں تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تو تمہیں لگتا ہے کہ زندہ رہ لوں گی؟" کتنی آسانی سے اس نے اتنا کچھ کہہ ڈالا تھا' جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جیسے دونوں کے درمیان ان کہا تعلق کوئی حیثیت ہی نہ رکھتا ہو۔

"تم رہ لوگی۔ تمہارے پاس بہت رشتے ہیں۔ تم چند ماہ میں ہی مجھے بھلا دوگی۔ آخر کون یاد رکھتا ہے کسی کو؟ بہت سے کلائمبنگ پارٹنرز مہموں کے دوران مرجایا کرتے ہیں' سوواٹ؟"

"کلائمبنگ پارٹنر؟ بس یہی ہوں میں تمہاری؟" اس کے دل پر گھونسا سا پڑا تھا۔

افق نے نقاہت بھرے انداز میں اسے دیکھا۔ "تم چلی جاؤ پری! یہاں سے واپس' مری' اسلام آباد' پنجاب' جہاں سے تم آئی ہو وہاں چلی جاؤ۔ ہاں بس ایک بار ترکی ضرور جانا۔ انقرہ میں ڈاؤن ٹاؤن سے قریب میرا گھر ہے۔ حسن حسین ارسلان کا گھر۔ بس ایک دفعہ جاکر میری ماں سے ضرور ملنا اور..... اور اسے بتانا کہ اس کا بیٹا بزدل نہیں تھا' بس وہ راکاپوشی سے نہیں لڑسکا۔"

وہ بولتے بولتے تھک کر خاموش ہوگیا۔ اس نے ہار مان لی تھی۔ اس نے راکاپوشی سے ہار مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"تم کیا سمجھتے ہو' مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری اور قربانی کی کوئی عظیم مثال قائم کرو گے؟ تمہارے لیے قراقرم میں تاج محل تعمیر کروایا جائے گا؟ تمہارے مجسمے کی پرستش کی جائے گی؟ تمہاری بہادری کے قصے سنائے جائیں گے؟ ہاں' بولو' یہی چاہتے ہو تم..... نہیں افق' نہیں' یہ بہادری نہیں ہے' یوں چھپ کر خیمے میں بیٹھ کر تم بہادری نہیں' بزدلی کی مثال قائم کر رہے ہو۔ یوں چھپ کر تو کوئی کمزور چوہا بیٹھا کرتا ہے۔ تم تو چوہے سے بھی زیادہ کمزور اور بزدل نکلے..... تم تو۔"

چٹاخ کی آواز کے ساتھ ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"شٹ اپ' جسٹ شٹ دی ہیل اپ۔" وہ زور سے دھاڑا۔ "دفع ہو جاؤ تم ادھر سے۔ مجھے تمہاری صورت سے بھی نفرت ہے۔ نہیں چاہیے مجھے تمہاری ہمدردی اور مدد۔ نکل جاؤ اس خیمے سے۔ وہ بھی ایسے ہی چلی گئی تھی۔ تم بھی' تم بھی چلی جاؤ۔ تم سب ایک سی ہوتی ہو۔"

وہ زور زور سے چلاتے ہوئے اسے وہاں سے نکل جانے کو کہہ رہا تھا اور اپنے بائیں رخسار پر ہاتھ رکھے وہ سن سی ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ یقیناً" اس کی آنکھوں نے غلط دیکھا تھا' اس کے گال نے غلط محسوس کیا تھا۔

"تم نے..... تم نے مجھے تھپڑ مارا؟" اس نے بے یقینی سے اپنا ہاتھ رخسار سے ہٹا کر دیکھا جیسے اس پر افق کے ہاتھ کا نشان ہو' اور دوبارہ اسے گال پر رکھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

افق نے اسے تھپڑ مارا؟ افق نے؟ وہ بھی اتنی زور کا۔ اس کا پورا دماغ گھوم گیا؟ اتنی زور کا تھپڑ اسے افق نے مارا؟ واقعی؟

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔

خیمے کے باہر برفانی طوفان اسی طرح جاری تھا۔ سرد طوفانی ہوا اس کے باہر نکلتے ہی اسے ادھر ادھر لڑھکانے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ مضبوطی سے خیمے کے دروازے سے دو گز دور' بازو سینے پر باندھے کھڑی

سامنے دیکھتی رہی۔

صبح صادق کا وقت تھا۔ سورج کہیں سے بھی دکھائی نہیں دیتا تھا کیونکہ آسمان پر سیاہ بادلوں اور آسمان سے ذرا نیچے برفانی طوفان کا راج تھا۔ روشنی بس اتنی تھی کہ وہ شدید دھند میں محض پچاس میٹر تک دیکھ سکتی تھی۔ برف ابھی تک گر رہی تھی' مگر رات کی طرح کا شدید وائٹ آوٹ نہیں تھا۔

کتنی ہی دیر وہ برف میں اسی طرح ہاتھ باندھے' ساکت پتلیوں سے پلکیں جھپکے بغیر سامنے دیکھتی رہی' جیسے دھند' برفباری اور طوفان میں کوئی جیتی جاگتی ممی کھڑی ہو۔ اس کی ٹوپی ہوا کے باعث اڑ کر دو گز دور گر گئی۔ ہر پل گرتی برف اسے سفید کرتی رہی مگر وہ اسی طرح کھڑی دھند میں دیکھتی رہی۔ دفعتاً" اس کے عقب میں دھیمی آہٹ ہوئی۔

بہت مشکل اور شدید تکلیف کے عالم میں وہ ski pole کا سہارا لیے چل کر باہر آیا تھا۔ اس سے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا اور طوفانی ہواؤں کی چنگھاڑتی آواز کے باوجود اسے اس کی ہر قدم رکھنے کے ساتھ لبوں سے نکلنے والی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بمشکل چلتا' لنگڑاتا اس کے قریب آیا مگر پریشے گردن کو جنبش دیے بغیر سامنے دیکھتی رہی۔ اسے گال پر افق کے طمانچے کی حرارت اور درد ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔

چند لمحے وہ کچھ کہے بغیر اسے دیکھتا رہا' پھر اس کی نگاہیں پریشے کے چہرے سے پھسلتی اس کے اڑتے بالوں پر جا ٹھہریں۔ اس نے اردگرد متلاشی نگاہیں دوڑا کر کچھ ڈھونڈنا چاہا' پھر جس طرف اس کی ٹوپی گری تھی' وہ اس طرف بڑھنے لگا۔

پریشے نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا جو لنگڑاتے ہوئے' بدقت ایک ٹانگ پر زور ڈالے چل کر ٹوپی کے قریب گیا' جھک کر ٹوپی اٹھائی' اس پر لگی برف جھاڑی اور اسے لے کر واپس پریشے کے قریب آنے لگا۔ تب اس نے محسوس کیا کہ وہ دایاں پاؤں قدرے ٹیڑھا کر کے رکھ رہا تھا جیسے اس میں بھی تکلیف ہو۔

"اسے پہن لو۔" اس نے ٹوپی اس کی جانب بڑھائی۔

اس نے چپ چاپ ٹوپی تھام کر سر پر پہن لی' اور گھنی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "اگر تمہیں لگتا ہے کہ مجھے تھپڑ مار کر' مجھ پر چیخ چلا کر' مجھے خود سے متنفر کر کے تم مجھے یہاں سے جانے پر مجبور کر دو گے تو تم غلط ہو۔ میں تمہیں کبھی بھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں حنا دے نہیں ہوں افق! میں پریشے ہوں۔"

افق نے خاموشی سے سر کو اثبات میں ہلایا۔

"اب چلو اندر۔" اس نے ڈپٹا۔ وہ سر جھکائے اس کے آگے چلتا ہوا اندر خیمے میں داخل ہوا۔

"بیٹھو اور اب اپنا جوتا اتار کر مجھے اپنا پاؤں دکھاؤ۔" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں سیدھی پھیلائے بیٹھ گیا تو وہ تحکم سے بولی۔

"میرا پاؤں ٹھیک ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔" افق نے فوراً" اپنا دایاں پاؤں دور ہٹایا۔

"میں نے جو کہا ہے' وہ کرو' جوگر اتارو۔"

"مگر میں ٹھیک ہوں' ڈاکٹر۔" اس نے جوتے پر یوں ہاتھ رکھ دیا جیسے کوئی چھوٹا بچہ اپنی کوئی غلطی چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

"یہ فیصلہ کرنے والی میں ہوں کہ تم ٹھیک ہو یا غلط۔ مجھ سے آگے بحث مت کرو اور جوگر اتارو۔"

"میں کہہ جو رہا ہوں کہ میرا پاؤں ٹھیک۔"

اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر پریشے نے اس کے چہرے پر زور سے تھپڑ مارا۔

"پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہی ہوں۔ مجھے اپنے سامنے بڑبڑاتے ہوئے مریض زہر لگتے ہیں۔ ڈاکٹر کے سامنے خاموش رہا کرو۔ اب اتارو اپنا جوتا۔"

افق نے حیرت اور بے یقینی سے ہاتھ سے رخسار کو ہولے سے چھوا' جیسے کچھ محسوس کرنے کی سعی کر رہا ہو۔ پھر اس کے تاثرات حیرت سے مدھم مسکراہٹ میں بدل گئے۔ اس نے خاموشی سے سر جھکائے مسکراتے ہوئے جوگر کا تسمہ کھولا۔ پریشے نے جیسے کہیں کچھ برابر کر دیا تھا۔

اس کے پاؤں کا انگوٹھا زخمی تھا۔ ناخن ٹوٹ چکا تھا اور خون جما ہوا تھا۔ ناخن کے نیچے والی جگہ نیلی تھی۔ اسے یقیناً" اس زخم کا علم تھا مگر صرف اس لیے کہ وہ پریشان ہو گی' افق نے اسے آگاہ نہیں کیا تھا۔

"مجھ سے یہ زخم چھپاتے ہوئے تمہیں شرم تو نہیں آئی ہو گی؟" اس کا زخم صاف کر کے پٹی کرتے ہوئے وہ طنز سے بولی۔

"بالکل نہیں آئی تھی۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

"اب پہن لو جرابیں۔" پٹی کر کے اس نے پھر حکم دیا۔ وہ تابعداری سے جرابیں پہن کر بوٹس چڑھا کر تسمے بند کرنے لگا۔ اس کے لبوں پر اداس مسکان رقصاں تھی۔

"ہمیں ہر حال میں نیچے کا سفر آج ہی شروع کرنا ہے۔ دعا کرو کہ آج طوفان کا زور ٹوٹ جائے اور سورج نکل آئے' پھر برفباری بھی ہو رہی ہو' تب بھی ہم ڈیسنڈ کر لیں گے۔" چولہے پر برف پگھلا کر گرم پانی کا ایک کپ بنا کر اس نے آدھا افق کے برتن میں انڈیلا اور اسے تھمایا "میں جانتی ہوں تمہاری انجری شدید ہے مگر تمہیں ہمت کرنی پڑے گی اپنے لیے نہیں تو میرے لیے۔ کرو گے نا افق؟"

گھونٹ گھونٹ پانی پیتے افق نے اثبات میں سر ہلایا۔ پریشے نے آخری پاور بار اس کی جانب بڑھایا۔

"کھا لو.... انرجی کے لیے۔" وہ خاموشی سے پاور بار کا ریپر اتار کر کھانے لگا۔

پریشے نے گیس کی مقدار چیک کی۔ بس دو دن کی گیس بچی تھی' وہ بھی صرف پانی بنانے کے لیے انہیں ہر دو گھنٹے بعد آدھی پیالی پانی کی لازماً" ضرورت ہوتی تھی' ورنہ فروسٹ بائٹ کی تلوار سر پر لٹک رہی تھی۔ ساڑھے سات ہزار میٹر پر ایک پیالی پانی' دو گھونٹ گرم چائے' تھوڑی سی گیس' زندگی اور موت کے درمیان فرق کرتی تھی۔

پاور بار ختم کر کے جانے کب وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا' پریشے کو پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ اپنے خیالات سے چونکی تو اسے اسی پوزیشن میں اونگھتے دیکھا۔ ایولانچ کو گزرے پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے' مگر وہ کتنا بیمار کمزور اور پژمردہ لگ رہا تھا۔ چہرے کی رنگت زردی مائل سفید پڑ رہی تھی۔ اس کا ازلی شگفتہ سنہری پن اور سرخی آج اس کی رنگت میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

باہر برفانی طوفان شور مچاتا رہا اور وہ خاموشی سے اسے سوتے دیکھتی رہی۔ نیند میں وہ کبھی کبھی ہلکا سا کھانس دیتا۔ چہرے پر واضح کرب رقم تھا۔

اسے افق پر بے پناہ ترس آیا۔ اس کی ٹانگ یقیناً" اتنی دکھ رہی تھی کہ اس کا عزم' حوصلہ اور ہمت جواب دے گیا تھا۔ اس کو علم ہو چکا تھا کہ وہ مر جائے گا' مگر مرتے مرتے بھی وہ اپنی آخری سانسیں اسے کرنا چاہتا تھا' اس کو وہاں سے بھیجنا چاہتا تھا۔

وہ اس کو لفظوں میں نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ اس چھوٹے سے خیمے میں محض اس کی زندگی بچانے کے لیے نہیں بیٹھی تھی۔ بلکہ وہ شخص جو سامنے بیٹھے بیٹھے سو چکا تھا' وہ شخص اس کی پوری زندگی تھا۔ بعض لوگوں کی زندگی آپ کے لیے اہم ہوتی ہے۔ ان کے بغیر رہا جا سکتا ہے اور بعض لوگ آپ کی زندگی ہوتے ہیں' ان کے بغیر صرف مرا جا سکتا ہے۔

اسے افق سے پہلی نظر کی محبت ہوئی تھی۔ وہ تو شاید اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پری نے اسے کتنا ٹوٹ کر چاہا تھا جب اس نے اسے تھپڑ مارا' تب بھی اس کا ایک لمحے کو بھی دل نہیں چاہا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا' اس لیے اس کے باہر نکلتے ہی اس کے پیچھے آ گیا تھا۔ اظہار نہیں کرتا تھا' مگر محبت کرتا تھا۔ کتنی عجیب' خاموش محبت تھی دونوں کی.... ایک دوسرے کو چاہنا بھی ہے اور بتانا بھی نہیں ہے۔ کیا ایسے بھی کسی نے محبت کی ہو گی؟

برف باری ہنوز جاری تھی۔ سورج ٹھیک سے طلوع نہیں ہو پا رہا تھا جانے کیا وقت ہوا تھا۔ غالباً" صبح کے اولین گھنٹے تھے۔ اس نے ریڈیو اٹھا کر سلسلہ بیں

دو..... میں اور نہیں جا سکتا۔" وہ اکھڑتی سانسوں کے درمیان نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کر رہا تھا۔

وہ جگہ بالکل vertical تھی' جیسے کسی تکون کی ایک سائیڈ ہوتی ہے یا جیسے کسی چھت کی پتلی منڈیر۔ چند قدم آگے بڑھتے تو نیچے گر جاتے۔ وہاں تو خیمہ بھی نصب نہیں کیا جا سکتا تھا۔

طوفان ہر گزرتے پل وحشی ہو رہا تھا۔ برفیلی ہوا ہڈیوں میں گھس کر خون منجمد کر رہی تھی۔ مگر افق ادھر سے ایک انچ نیچے نہیں اترنا چاہتا تھا۔ پریشے نے کھینچ کر رسی کو اپنے ہاتھ میں کر لیا اور فولڈ کر کے ایک کندھے پر ڈال لیا۔ اب اسے خیمہ گاڑنے کو جگہ ڈھونڈنی تھی۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی پریشے تھی جو گھوڑے سے ڈرتی تھی؟

اس نے افق کو برف میں دونوں اطراف سے رسی گزار کر باندھ دیا' ایک اور ڈھیلا سا prusik بھی برف کی دیوار میں نصب کر دیا تاکہ وہ نہ گرے۔ اس کی "سیفٹی گروپ" کا کھنچاؤ چیک کر کے وہ خیمے کی جگہ ڈھونڈنے کی خاطر اندھیرے اور طوفان میں' گھٹنوں کے بل برف پر crawl کرتی ادھر ادھر آئس ایکس مارتے ہوئے کوئی پلیٹ فارم تلاش کرنے لگی۔

کم بصارت' گہری سفید تاریکی' اور ہڈیوں کو کھاتی سردی اس کو چند ہی منٹ بعد واپس افق کے پاس لے آئی۔ وہ اس خطرناک سلوپ پر زیادہ دور نہیں جا سکتی تھی۔ اگر اسکاٹ فشر نے کہا تھا کہ ہمالیہ میں اندھیرا آپ کا دوست نہیں ہوتا تو بالکل درست کہا تھا۔

وہ ویسے ہی دیوار کے ساتھ بندھا بیٹھا تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں' گردن کندھے پر ڈھلکی تھی' چہرے پر بڑھی شیو میں برف کے ذرات پھنسے تھے۔

وہ تھک کر اس کے بالکل ساتھ گھٹنوں کے بل دو زانو بیٹھ گئی۔ طوفان کا ناقابل برداشت شور اس کے کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔

"یہ سوا چھ ہزار میٹر ہے' آئی تھنک ہیلی کاپٹر ادھر آ سکتا ہے۔" رک رک کر ہانپتے ہوئے وہ بولی۔ افق نے جواب میں کچھ نہ کہا۔

"افق؟" اس نے ڈرتے ڈرتے اس کا کندھا ہلایا۔ مگر اس کے وجود میں جنبش نہ ہوئی۔

"افق؟" اس نے پھر پکارا۔

"ہوں؟" بہت پست آواز میں اس نے جواباً ہنکارا بھرا۔ پریشے کو سکون ہوا۔

"درد ہو رہا ہے؟"

"نہیں۔" اس کی آواز سے ہی درد پنہاں تھا۔

"بس تم فکر مت کرو۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔" وہ افق کے بائیں جانب بیٹھی' اس کا بایاں بازو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ وہ سہارا دے رہی تھی یا سہارا لے رہی تھی' وہ اندازہ نہ کر پائی۔

آسمان سیاہ سفید تھا۔ دور دور تک دھند پھیلی تھی۔ جانے ہیلی کاپٹر کب آئے گا؟

اس نے کمر پر بندھے رک سیک میں سے ریڈیو نکالا۔

"کم ان بیس کیمپ۔" ہاتھ اتنے منجمد تھے کہ بٹن نہیں دبایا جا رہا تھا۔

"آئی ایم ہیئر۔" احمت کی آواز غنودگی سے بھری تھی۔

"احمت' ہم اراؤنڈ سوا چھ ہزار میٹر پر ہیں۔ یوں کرو میری کرنل فاروق سے بات کراؤ۔ میں انہیں لوکیشن دیتی ہوں۔"

"کرنل فاروق وغیرہ تو چلے گئے۔"

پریشے کو لگا اس نے غلط سنا ہے۔

"کہاں چلے گئے؟"

"واپس..... اسکردو!"

بلتورو کا پورا گلیشئر اس کے سر پر پھٹا تھا۔ وہ گنگ سی ریڈیو کو دیکھنے لگی۔

"وہ..... وہ کیسے چلے گئے؟" انہوں نے تو..... انہوں نے تو ہمیں ریسکیو کرنا تھا۔ وہ کیسے؟" اس کے لبوں سے الفاظ ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔ قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ موسم خراب ہے۔ کوئی لیول کا بھی پرابلم تھا۔ آئی ڈونٹ نو۔ بس صبح ہی صبح وہ واپس چلے گئے تھے۔"

تب پہلی بار پریشے کو احساس ہو کہ وہ اس برفباری اور طوفان میں کھلے آسمان تلے ایک زخمی کے ساتھ تنہا پڑی ہے۔

"احمت! وہ کیسے جا سکتے ہیں؟ ہم نے ان کے کہنے پر ڈیسنڈ کیا اور وہ' وہ..... ہمیں چھوڑ کر چلے گئے؟ کیوں؟" اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ وہ ایک چھ فٹ کے لمبے چوڑے مرد کا وزن اٹھائے جانے کتنے گھنٹے پہاڑ کی ڈھلوان سے نیچے اترتی رہی تھی' وہ گھنٹے جو صدیوں پر بھاری تھے' اور اب احمت کہہ رہا تھا "وہ چلے گئے؟"

"تم حوصلہ مت ہارو۔ ہو سکتا ہے وہ صبح تک آ جائیں۔ تم نے ویسے اتنا زیادہ سفر نیچے کو کیسے کیا؟"

"رسی کو rapell کر کے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"تمہارا سر ہوتا ہے۔" وہ زور سے چلائی۔

"مجھ پر کیوں غصہ ہو رہی ہو؟ میں ادھر بیس کیمپ میں اکیلا پڑا' سارا دن اس منحوس راکاپوشی کا برفیلا فیس دیکھتا رہتا ہوں۔ شاید تم سے زیادہ سفر کر رہا ہوں۔" وہ خفا سا ہو گیا۔

"تم غلط موقع پر غلط بات کیوں کرتے ہو؟" وہ بجائے سوری کرنے کے الٹا اس پر خفا ہوئی۔

"اچھا' تم نیچے اترنے کی کوشش کرنا۔"

"جیسے مجھے یہ پتہ ہی نہیں ہے؟ خدا کے لیے احمت' یہاں حالات بہت خراب ہیں۔ برف کی کنڈیشن بہت بری ہے۔ اور افق زخمی ہے۔ ہم میں مزید رسی سے نیچے اترنے کی ہمت نہیں ہے۔" وہ زور سے چلائی۔

"اچھا ہمت مت ہارو وہ صبح تک آتے ہی ہوں گے۔ تم بس ہر دو گھنٹے بعد پانی کا آدھا کپ۔"

"پتہ ہے مجھے۔ تم دنیا کے واحد ڈاکٹر نہیں ہو۔" اس نے ریڈیو بند کر دیا۔

علاوہ ایک ہنزو کشر باورچی کے وہ تن تنہا بیس کیمپ میں پڑا اپنی ایمبیسی سے لے کر حکومت تک' جس کسی سے بات کر سکتا تھا' کر چکا تھا اور بہت کم وقت میں اس نے فوج تک سے رابطہ کر لیا تھا مگر یہ ایلٹی ٹیوڈ کا اثر تھا یا شدید احساس بے بسی و خود ترسی کہ پریشے کو لگ رہا تھا' احمت اور پاکستان آرمی' دونوں اس کے معاملے میں دلچسپی نہیں لے رہے۔ غصہ نکالنے کو وہ ریڈیو واپس بیگ میں رکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"پاکستان آرمی سے اتنا نہیں ہوتا کہ....."

"پاکستان آرمی نے ہماری منت نہیں کی تھی کہ خدا کے لیے اگست میں راکاپوشی کلائمب کرو۔ یہ ہماری غلطی تھی' ہم خود ادھر آئے تھے وہ ہمارے لیے جتنا کر سکتے تھے کر چکے۔ اس سے زیادہ وہ۔" تیز تیز بولتے ہوئے وہ کھانسنے لگا' کھانسی رکی تو دوبارہ برف سے کمر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ شاید وہ خالص پاکستانی تھی' تب ہی بہت جلدی شدید بدگمان ہو جاتی تھی۔

وہ دونوں ابھی تک کھلے آسمان تلے برف کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ہر پل گرتا درجہ حرارت' مسلسل جاری طوفان اور برفباری سے بچاؤ کے لیے انہیں شیلٹر چاہیے تھا۔ وہ شیلٹر کہاں سے حاصل کرے' یہ سوچتے ہوئے اس نے پیچھے برف کی دیوار سے کمر ٹکائی۔ اس ایلٹی ٹیوڈ پر سوچنا انتہائی کٹھن کام تھا مگر جیسے ہی اس کی کمر پیچھے برف سے مس ہوئی اس نے بے اختیار گردن گھما کر پیچھے دیوار پر جمی برف کو دیکھا۔

یہ تازہ پڑی برف تھی مگر اس کے پیچھے بھی یقیناً ڈھیروں برف تھی۔ اس وقت اسے آسمان سے گرتی برف سے پناہ لینی تھی اور یہ پناہ اسے صرف ایک چیز دے سکتی تھی اور وہ تھی دیوار پر جمی برف۔

سارے دن کی تھکاوٹ کے باوجود وہ نئے سرے سے' رخ دیوار کی طرف پھیر کر آئس ایکس زور زور سے برف میں مارتی ہوئی اسے کھودنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ برف ٹوٹتی' کچھ سفید ذرات اڑ کر اس کے چہرے اور بالوں میں آ پھنستے۔ وہ پوری قوت صرف کرتے ہوئے دیوار میں سرنگ بنانے لگی پورا

دن افق کو سہارا دینے کی مشقت کے باعث اس کی کمر شدید درد کر رہی تھی۔

وہ اسی طرح دیوار سے بندھا، آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور بیٹھے بیٹھے سو بھی گیا تھا، یا پھر شاید کچی نیند میں تھا جب پریشے نے اسے جگایا۔

"اٹھ جاؤ۔ میں نے ہم دونوں کے لیے ایک زبردست اپارٹمنٹ تیار کیا ہے، جس کا ویو بے حد حسین ہے۔ ذرا موسم ٹھیک ہو تو اس سے پورا قراقرم نظر آتا ہے۔ اب ہمیں اس میں شفٹ ہونا ہے۔ دیکھو اور داد دو کہ میں کتنی اچھی آرکیٹیکٹ ہوں۔"

یہ وہ پہلی خوشگوار بات تھی جو اس نے انتہائی ناخوشگوار ماحول میں کہی اور افق کی رسیاں کھولنے لگی۔

"یوں لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں اغوا کر کے ادھر باندھ رکھا ہو۔" وہ اپنی بات پر خود ہی ہنس دی۔ وہ نیم غنودگی کے عالم میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ شاید اسے لگا تھا کہ پریشے کا دماغ چل گیا ہے۔ کہاں وہ اتنی پریشان ہو رہی تھی اور کہاں اس کی حس مزاح ایک دم جاگ اٹھی تھی۔

وہ افق کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اسے کسی نہ کسی طرح خود کو اور اسے، اس ظالم پہاڑ کے اوپر چڑھی برف کی چادر میں کھود کر بنائے گئے اس چھوٹے سے سوراخ میں زندہ رکھنا تھا۔ ہنس کر نہیں تو رو کر..... رو کر نہیں تو ہنس کر۔

برف کی عمودی دیوار میں اس نے سرنگ بنائی تھی، ویسی جیسے سی ٹی اسکین کے لیے مریض کو سرنگ میں سے گزارا جاتا ہے۔ وہ اتنی تھی کہ دو آدمی اس میں کمر ٹکا کر، ٹانگیں سامنے پھیلائے بیٹھ سکتے تھے۔ برف سے انسان کو صرف برف بچاتی ہے، جیسے ہیرا ہیرے کو کاٹتا ہے۔ چونکہ برف کی تاثیر گرم ہوتی ہے اس لیے برفانی غار یا ice cave کسی بھی Goretex کے خیمے سے زیادہ گرمائش فراہم کرتا ہے۔

اگر ان کے پاس دو سلیپنگ بیگز ہوتے تو اسے غار کھودنے کی ضرورت نہ رہتی۔

وہ دونوں کھلے آسمان تلے طوفان کے باوجود صرف سلیپنگ بیگ میں بھی گزارا کر سکتے تھے اگر ان کا ایک سلیپنگ بیگ ایولانچ ان سے چھین نہ لیتا۔ کافی دیر کی محنت سے تیار کیے غار میں اسے [illegible] خود دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور اس کو لٹا دیا۔ افق کے پیر غار کے دہانے سے کافی باہر نکل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اونچے ریفریجریٹر کے اوپر بنے ڈیپ فریزر میں رکھی ہے جس کا ڈھکن سامنے سے کھول دیا گیا ہے۔ وہ برفانی غار ایسا ہی تھا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ پرانے وقتوں میں واپس چلی گئی ہو، جب انسان غاروں میں پناہ لیا کرتا تھا، جب زخمیوں کے لیے مرہم نہیں ہوا کرتے تھے، جب تہذیب کا کوئی وجود نہیں تھا۔

سوچتے سوچتے اسے جلد ہی نیند نے آن گھیرا۔ خواب میں اس نے خود کو قدیم زمانوں میں پایا۔ وہ ایک لکڑہارے کی بیٹی تھی اور ایک زخمی سپاہی کو لیے غار میں چھپی بیٹھی تھی۔ دشمن کی فوج ان دونوں کے تعاقب میں آ رہی تھی۔ دوڑتے گھوڑوں کے ٹاپوں کی بلند آواز اس کی سماعتوں میں ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ قدیم وقتوں کا سارا رومانس غائب ہو گیا۔ جس کو وہ گھوڑوں کی آواز سمجھ رہی تھی وہ طوفان کا شور تھا۔ وہ کسلمندی سے قدرے سیدھی ہوئی۔ برفانی غار اب رات کی نسبت زیادہ گرم تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی تھی، افق بھی ساتھ ہی لیٹا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس نے اپنا سر کسی چھوٹے سے بیمار بچے کی طرح پریشے کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور گہری نیند میں، پرسکون نیند سوتا وہ واقعی معصوم سا بچہ لگ رہا تھا۔

باہر طوفان کے شور میں اس کے کان کسی اور آواز کے سننے کے متمنی تھے۔ ہیلی کاپٹر کے پروں کی بھاری گڑگڑاہٹ، آرمی ایوی ایشن کے سبز ہیلی کاپٹر کی ایک جھلک ہی اس کو از سرِنو زندہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

"وہ آتے ہی ہوں گے۔" کھوجتی نگاہوں سے دور تک دھند میں دیکھتے ہوئے وہ خود کو تسلی دے رہی تھی مگر "زمین" سے انہیں بچانے کوئی نہیں آیا۔

دونوں جانے کتنے گھنٹے اس برفانی غار میں پڑے سردی سے ٹھٹھرتے رہے۔ وہ غار اب جائے پناہ کم اور برفانی تابوت زیادہ لگ رہا تھا۔

افق اٹھ گیا تو اس نے چائے بنا کر خود بھی پی اور اسے بھی دی۔ چائے کیا تھی، بغیر شکر اور دودھ کے کڑوا قہوہ سا تھا۔ افق نے کپ پکڑ کر کہنیوں کے بل قدرے بیٹھ کر چائے کے تلخ گھونٹ اپنے حلق سے اتارے اور پھر کپ خالی کر کے سائیڈ پر ڈالا اور دوبارہ پریشے کے گھٹنے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

پتہ نہیں کیا وقت تھا، کیا تاریخ تھی، کون سا مہینہ اور کون سی صدی تھی وقت کا حساب کتاب بھی اب بھولتا جا رہا تھا۔

"پری!" افق نے اسے پکارا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے برفانی غار کی چند انچ دور سفید چھت کو تک رہا تھا "سو رہی ہو؟"

"نہیں! سو نہیں رہی یونہی تھک گئی ہوں۔" وہ پیچھے کمر ٹکائے، آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔

"میری جان بچانے کا شکریہ۔ تم نہ ہوتیں تو میں مر جاتا۔"

"اور تم نہ ہوتے تو شاید میں بھی مر جاتی۔" وہ کرب سے مسکرائی۔

پھر کتنے ہی پل خاموشی کی نذر ہو گئے۔

"پری؟ سو گئیں کیا؟" اس نے پھر پوچھا۔

"نہیں۔" آواز بے حد ہلکی تھی۔

"پھر بولتی کیوں نہیں ہو؟ مجھ سے باتیں کرو، تاکہ مجھے لگے کہ میں اس برفانی تابوت میں اکیلا نہیں ہوں۔"

وہ ایسے کہتا اس وقت کوئی ڈرا سہما بچہ لگ رہا تھا، اس حاضر جواب اور شوخ افق سے قطعاً مختلف جس سے وہ یونہی ایک شام مارگلہ کی پہاڑیوں پر ٹکرا گئی تھی۔ اسے اس پر بیک وقت پیار بھی آیا اور رونا بھی۔

"کیا بولوں؟ تمہیں درد ہو رہا ہے؟"

"ہر وقت یہی کیوں پوچھتی ہو؟"

"اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔"

غار میں ایک دفعہ پھر خاموشیاں راج کرنے لگیں۔

وہ کافی دیر کچھ نہ بولا تو پریشے نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسی طرح لیٹے ہوئے، دونوں ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی تصویر پکڑے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ حنا دے مر چکی تھی، باوجود اس کے وہ تصویر افق کے ہاتھوں میں دیکھ کر اس کے کہیں بہت اندر درد کی ٹیسیں اٹھی تھیں۔

"پری!" اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ "تم نے کل یہ کیوں کہا کہ میں نے تمہیں حنا دے سمجھا؟ تم..... تمہیں میں نے کبھی حنا دے نہیں سمجھا۔ تم پریشے ہو، تم حنا دے ہو ہی نہیں سکتیں۔" اب وہ بے ربط فقرے نہیں بول رہا تھا۔ گرم چائے کی بخشی توانائی کا اثر تھا۔ وہ جواباً خاموش رہی۔ اسے کچھ بھی نہیں پوچھنا تھا۔ اب افق کو ہی سب کچھ بتانا تھا۔

"جانتی ہو، لوگ کے ٹو کو Savage ماؤنٹین۔ (سفاک پہاڑ) کہتے ہیں، بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔

وہ ایسا ہی ہے۔ وحشی اور ظالم میں ایورسٹ نہیں، راکاپوشی نہیں، کے ٹو کا عاشق تھا۔ کے ٹو جسے قراقرم میں بسنے والے چھگوری بولتے ہیں۔ اور اب میرے لیے اس کا نام بولنا بھی تکلیف دہ ہے۔"

وہ کہتے کہتے کھانسنے لگا۔ کھانسی رکی تو پھر سے کہنے لگا۔ "حنادے میرے چچا کی بیٹی تھی۔ بہت خوبصورت، بہت پرفیکٹ اور بہت آرٹیفیشل، اس کی پرفیکشن کے متعلق تو تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ہمیشہ ٹپ ٹاپ میں رہتی تھی، بنی سنوری، فل میک اپ میں.... وہ بہت سیکولر اور آزاد خیال تھی۔ یہ ہمارے درمیان پہلا فرق تھا۔ کیونکہ میں آزاد خیال نہیں، روشن خیال ہوں اور بھی کئی فرق تھے۔"

وہ جیسے ذہن پر زور دے کر یاد کر کے بتا رہا تھا۔

"ہمارے خیالات کبھی نہیں ملے۔ وہ مجھ سے بہت اختلافات کرتی تھی۔ (غالباً "افق" بہت لڑتی تھی، کہنے سے احتراز برت رہا تھا۔) وہ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ جنہیں بات "نہیں" سے شروع کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی تھی، ہماری شادی چار سال پہلے ہوئی تھی۔ وہ امریکہ سے آئی تھی، اور واپس وہیں جانا چاہتی تھی، مگر میں ترکی اور اپنے پیرنٹس کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔"

شادی کے وہ دو سال میری زندگی کے بدترین سال تھے۔ اس میں ایک اہم کردار احمت دوران کا بھی تھا۔

احمت کو بچپن سے بھانڈا پھوڑنے کی عادت ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارا خیال ہو کہ وہ بہت معصوم، بے وقوف اور سیدھا ہے۔ حالانکہ میں اسے پچھلے اٹھائیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ میرا ہمسایہ ہے اور بہترین دوست بھی۔ احمت حقیقت میں انتہائی تیز اور عقل مند ہے۔ وہ جان بوجھ کر بھانڈا پھوڑتا ہے۔ میری اور جینیک کی اس سے لڑائی ہو گئی تو اس نے جھٹ ڈاکٹرز کو پیٹر آنرز کے متعلق بتا دیا۔ اس دن دیکھا نہیں تھا تم نے، میں نے ذرا اکتا کر بات کی اور میرے جانے کے بعد اس نے فوراً" تمہیں پیٹر کی اصلیت بتا دی۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ شکل پر بھول پن ہونے سے کوئی اس پر شک نہیں کر سکتا۔

ہاں زندگی میں صرف ایک دفعہ احمت کے منہ سے غیر ارادی طور پر ایک بات حنادے کے سامنے نکل گئی تھی۔ "قراقرم اور ہمالیہ کی پریوں" کی بات، اس نے بعد میں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگی مگر نقصان ہو چکا تھا۔ حنادے نے پریوں کی جستجو کے متعلق جاننے کے بعد کبھی مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے مجھے طعنے دیتی تھی۔"

طوفان کا خوف ناک شور ہنوز جاری تھا۔ اس کی آواز اس شور کے باعث دھیمی لگتی تھی۔

"پھر شادی کیوں کی تھی اس سے؟"

"میری ماں کی خواہش تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں ایک کلائمبر ہوں، تو صرف ایک کلائمبر کے ساتھ ہی خوش رہ سکوں گا۔ حنادے بہت زبردست امریکن کلائمبر تھی۔ اس سے پہلے میری زندگی میں صرف ایک لڑکی آئی تھی، میری اسکول فیلو ہدیٰ۔ مجھے گمان گزرا تھا کہ وہ میری آئیڈیل ہے، اس کے ساتھ چھوٹا سا افیئر بھی چلا، مگر وہ میری آئیڈیل نہیں تھی۔ یونہی ایک کرش تھی۔ میں کوئی بہت اچھا فلمی ہیرو نہیں ہوں، جس کی اٹھائیس سالہ زندگی میں کوئی لڑکی نہ آئی ہو۔ چھوٹے موٹے افیئرز تو ہر انسان کی زندگی میں ہوتے ہیں۔ پھر حنادے آئی۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنی جستجو میں ناکام ہو گیا ہوں تو مجھے شادی کر کے نارمل انسانوں کی طرح رہنا چاہیے۔ اس لیے اس سے شادی کی تھی۔ وہ نہ مرتی تو بھی شاید اب تک ہماری علیحدگی ہو چکی ہوتی، اور میں اس کے لیے حساس نہیں ہوں، بس میں اس کا ذکر اچھا یا برا، کرنا یا سننا پسند نہیں کرتا۔"

برفانی غار میں ایک دفعہ پھر خاموشی چھا گئی۔

"افق۔" کچھ دیر بعد وہ بولی۔ "کے ٹو پر کیا ہوا تھا؟ تم دو سال پہلے ادھر حنادے کے ساتھ کے ٹو سر کرنے آئے تھے نا؟"

کتنی ہی دیر وہ خاموش رہا، اس کی آنکھوں میں عجیب سا خوف اور کرب در آیا تھا۔

"برفانی طوفان آیا تھا۔ وہ بھی ڈیسنڈ کے دوران، کے ٹو کا ڈیسنڈ.... بہت مشکل.... بہت ہی مشکل۔ جتنے لوگ کے ٹو ——— سر کرتے ہیں۔ کم، بہت کم واپس آتے ہیں۔ ایک تہائی واپس آتے ہیں۔ کے ٹو فتح کرنا بڑا کام نہیں۔ اسے فتح کر کے واپس آنا بڑا کام ہے۔" وہ پھر کھانسنے لگا۔ اس کے فقرے بے ربط ہو رہے تھے۔ کافی دیر بولنے کے باعث اس کی توانائی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ "وہ کے ٹو کا طوفان تھا۔ ایورسٹ، نانگا پربت، براڈ پیک، راکاپوشی، سب کا طوفان ایک سا ہوتا ہے۔ مگر کے ٹو کا طوفان، بہت برا ہوتا ہے۔ میرا ٹیچر کہتا تھا، اگر کے ٹو پر طوفان آ جائے تو اپنا سب کچھ برف پر پھینک دو اور بھاگو۔ اپنی زندگی کے لیے بھاگو۔ وہ طوفان بہت خطرناک تھا۔ ڈیسنڈ کے دوران آیا تھا۔ میں آکسیجن کے بغیر کلائمب کرتا ہوں، مگر مجھے سیریبرل ایڈیما ہو گیا تھا۔ دماغ میں سوجن ہو گئی تھی۔ سو ایک آکسیجن کینسٹر ساتھ رکھا ہوا تھا۔

میں اور حنادے ساتھ ساتھ تھے۔ اس کی آکسیجن ختم ہو گئی۔ مجھے ایڈیما ہو گیا تھا۔ مجھے آکسیجن کی ضرورت تھی، اور میں نے ماسک چہرے پر لگا رکھا تھا۔ وہ ڈیتھ زون تھا۔ آٹھ ہزار تین سو میٹر، یا چار سو میٹر سے بھی اوپر، دن تھا یا رات، مجھے یاد نہیں، بس میں ایک جگہ نڈھال ہو کر گر گیا۔ حنادے کو آکسیجن چاہیے تھی، وہ بغیر آکسیجن کے بھی ڈیسنڈ کر سکتی تھی، مگر اس نے پھر بھی میرا ماسک، میرا کینسٹر اور ری ڈکٹر، سب میرے چہرے سے نوچ لیا اور نیچے چلی گئی۔ وہ میری فیلو کلائمبر نہیں تھی، وہ میری بیوی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے ایسا کیا۔ میں بغیر آکسیجن کے تین گھنٹے برف پر پڑا رہا۔ کے ٹو کے طوفان کے دوران....

حنادے نے کیمپ فور میں جا کر میرے متعلق بتایا کہ میں لاپتا ہو چکا ہوں۔ مجھے تین گھنٹے بعد اس مقام سے ایک دوسری مہم جوئی ——— کے گائیڈ نے اٹھایا اور نیچے لے آیا۔ گرم چائے اور ڈیکس کے انجکشن لگائے۔ میرا ایڈیما بدتر ہو رہا تھا۔ میں نیم مردہ تھا۔ وہی گائیڈ مجھے اٹھا کر چھ ہزار دو سو میٹر کے زاویے پر لے کر آیا، جہاں میجر عاصم نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے مجھے پک کیا اور پھر نیچے زمین پر لے آئے۔ میرے دونوں ہاتھ پاؤں فراسٹ بائٹ ہو چکے تھے۔ نقصان صرف دو انگلیوں کو ہوا، باقی بچ گئے۔ بہت حیرت انگیز جدوجہد کی تھی۔ عاصم نے.... دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ تمہاری ملٹری، ہماری ملٹری سے بہت بہتر اور بہادر ہے.... مجھے وہ لمحے نہیں بھولتے، جب میں برف پر گائیڈ کے ساتھ نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اور مرنے ہی والا تھا کہ دور افق میں سبز ہیلی کاپٹر اڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ لمحہ میرا "دوسرا جنم" تھا۔ میں پھر سے زندہ ہوا تھا۔ عاصم میرا بلتورو میں دو دفعہ لیزان آفیسر رہا تھا۔ اس نے دوستی کا حق ادا کیا۔"

"اور حنادے؟"

"وہ ڈیسنڈ کے دوران کیمپ تھری سے آگے ایولانچ کا شکار ہو گئی۔ اس کی رسی تک ٹوٹ گئی۔ کیونکہ ایولانچ کا پوٹینشل بہت شدید تھا۔ وہ برف میں گم ہو گئی۔ اس دن کے بعد پھر حنادے کو کسی نے کے ٹو پر نہیں دیکھا۔ گلگی میموریل قبرستان میں رکھنے کے لیے اس کی لاش بھی نہیں ملی۔ لوگ کے ٹو کو سفاک ماؤنٹین کہتے ہیں، ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ طویل سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

"تم خواب میں بھی ڈر جاتے ہو نا؟"

افق نے شدید کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

"بس خواب پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میں ہمیشہ خود کو اس مقام پر دیکھتا ہوں، جہاں حنادے مجھے چھوڑ کر جا رہی تھی۔ میں ہمیشہ اس سے اپنا آکسیجن کینسٹر مانگتا ہوں، مگر وہ نہیں دیتی، پری! وہ مجھے میری آکسیجن نہیں دیتی۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ مجھے برف میں تنہا چھوڑ کر، وہ میری سانسیں لے جاتی ہے۔ جب مجھے خواب میں یہ سب آتا ہے تو میرا دل کرتا ہے میں پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ کیا کوئی اتنا بھی سفاک ہو سکتا ہے جتنی وہ تھی؟"

لمحے خاموشی سے سرکتے رہے۔ باہر ہوتی برف

باری غار کا دہانہ بند کرنے کی سعی کررہی تھی۔ افق بار بار بوٹ مار کر گول دہانے پر اکٹھی ہوتی برف گرا دیتا۔

"بس شام تک' ہمارے ڈیسنڈ کے متعلق علم ہوتے ہی وہ آجائیں گے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔"

اس کی بے قرار متلاشی نگاہیں غار سے باہر نظر آنے والے دھند میں لپٹے افق پر بھٹک رہی تھیں۔ انتظار کے لمحے طویل ترین ہوتے جارہے تھے۔ دنیا کا سب سے کٹھن کام انتظار کرنا ہے۔ راکاپوشی پر یہ اور بھی کٹھن تھا۔

"بس شام تک وہ آجائیں گے' افق۔ ڈونٹ یو وری!"

پھر شام بھی ڈھل گئی اور ان دیوہیکل سیاہ پہاڑوں پر رات اترنے لگی' مگر جن کو آنا تھا' وہ نہ آئے۔

یقین ڈگمگا رہا تھا' حوصلہ پست ہونے لگا تھا' پھر بھی وہ اپنی اور اس کی ڈھارس بندھا رہی تھی۔

رات گہری ہوتی چلی گئی۔ انہیں بغیر کچھ کھائے یہ تیسرا دن تھا' جو اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ آگے ایندھن کی صرف ایک آخری بوتل بچی تھی' جو اس نے یوں مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی کہ جیسے ہفت اقلیم کے خزانوں کی کنجی ہو۔ بس ایک دن کے پانی کی گیس۔

"پاؤں تلے زمین کھینچ لی جائے اور سر سے آسمان ہٹنے لگے تو کیسا محسوس ہوتا ہے' مجھے آج علم ہوا ہے۔ جانے کب میں اس لطیف ہوا سے نکلوں گی اور خالص آکسیجن سے پُر ہوا میں سانس لے سکوں گی۔" پریشے کے اعصاب اب جواب دینے لگے تھے۔ افق بند آنکھوں سے مسکرایا۔

"چار سال قبل مارچ میں' میں نے ایورسٹ سر کیا تھا۔ موسم اتنا خوشگوار تھا کہ میری ایورسٹ کی فتح ایسے تھی' جیسے کوئی رولر کوسٹر پر چڑھے اور رائیڈ لے کر کالر جھاڑتا اتر جائے۔ چوٹی پر میرے ہمراہ ایورسٹ کے نزدیک واقع شرپاس گاؤں ______ Sherpas Village کا جو شرپا آیا تھا' اس کا نام بابو شری شرپا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ چوٹی پر سنہری پریاں دکھائی دیتی ہیں۔ یقین کرو' میں نے خود چوٹی پر کھڑے ہو کر سنہری پریوں کو رتھ پر سوار' سورج سے پھوٹ کر لنگما کی چوٹی پر اترتے دیکھا تھا۔ شاید وہ میرا واہمہ تھا' جو بلندیوں پر ہوا کرتا ہے۔ پریوں کا رتھ دیکھ کر میں کافی دیر وہاں کھڑا رہا تو بابو شری شرپا خاصا برہم ہوا۔ اس نے چلا کر مجھ سے کہا۔

"تم ادھر زیادہ دیر نہیں کھڑے ہوسکتے۔ یہ تمہارا ٹھگنا ارارت نہیں ہے' یہ ہمارا ساگر ماتا ہے۔ دنیا کی دیوی ماں۔۔۔ اس کی عزت اور احترام کرو۔"

اور میں نے واقعی اس کا احترام کیا۔ بابو نے مجھے ٹشو پیپر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھمائے' جن پر بدھا کی عظمت کی دعائیں لکھی تھیں۔ وہ دعائیں بابو کو بدھ مت کے بھکشوؤں نے دی تھیں' تاکہ وہ دیوتاؤں کے اعزاز ___ میں ساگر ماتا کی فضا میں انہیں بکھیر دے۔ اس نے مجھے وہ ٹکڑے فضا میں اچھالنے کو کہا' یہ ان شرپاز کا ہمالیہ کو شکریہ کہنے کا انداز تھا۔ میں کوئی توہم پرست آدمی ہوں نہ مجھے بدھ مت سے کوئی لگاؤ ہے' پھر بھی' وہ ہمالیہ کا کوئی پراسرار اثر تھا' جس کے باعث میں نے وہ ٹکڑے لیے اور انہیں ہوا میں اچھال دیا۔ وہ منظر بہت حسین تھا۔ ٹشو کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہمارے سروں سے تقریباً" پانچ چھ میٹر اوپر تیرتے بادلوں میں ٹھہر گئے' زمین اور ہوا کے درمیان سفید بادلوں میں ساکت سے ہوگئے۔ آج مجھے اپنا آپ ٹشو کے ان ٹکڑوں کی طرح لگ رہا ہے۔ جیسے زمین اور آسمان کے درمیان بادل کے ایک ٹکڑے نے تھام رکھا ہو' اور گرنے نہ دے۔

اس کی آنکھیں بند اور لب آہستہ آہستہ حرکت کررہے تھے۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ وہ بہ دقت سن سکتی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو جیسے ساگر ماتا کا طلسم ٹوٹ کر فضا میں بکھر گیا۔ وہ ایورسٹ سے واپس دومانی کی برف میں آگئی۔

"سو جاؤ۔ صبح ہیلی کاپٹر کے آتے ہی تمہیں اٹھا دوں گی۔"

افق کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ بکھر گئی' جیسے اسے پریشے کے اتنے پُریقین ہونے پر ہنسی آئی ہو۔ پھر مدھم دھیما ہوتا گیا۔ وہ نیند کی کیفیت میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس کے سونے کے بعد اس نے ریڈیو نکال کر احمت سے رابطہ کیا۔

"کیسی ہو ڈاکٹر؟" وہ غالباً" اس کی کال کے انتظار میں سویا نہیں تھا۔

"پتا نہیں کیسی ہوں۔ میری ای میلز تو پڑھ کر سناؤ۔"

"اچھا سنو۔" وہ لیپ ٹاپ کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔ "پہلی تو میری بیوی سلمٰی کی ہے۔ لکھا ہے۔ اچھی پریشے' جلدی سے نیچے بخیروعافیت پہنچ جاؤ' تاکہ بیس کیمپ میں موجود میرے شوہر پر نظر رکھ سکو۔ مجھے تمہارے ہنزہ کے اس پار کافرستان کی عورتوں کے حسن کے قصے افق نے سنا رکھے ہیں کہ وہ اتنی حسین ہوتی ہیں کہ تمہاری زبان میں ان کے باعث "کافرانہ ادائیں" اور "کافرانہ حسن" جیسی اصطلاحات رائج ہوچکی ہیں۔ میرا شوہر اتنا معصوم اور سیدھا نہیں' جتنا لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ میرا خیال ہے پاک آرمی کو 6320 میٹر پر ریسکیو آپریشن کرنے سے پہلے ایک سرچ آپریشن راکاپوشی بیس کیمپ میں بھی کرنا چاہیے۔"

پریشے بے اختیار ہنس دی۔ چہرے کی جلد اتنی خشک ہوچکی تھی کہ ہنسنے سے کھنچی اور درد ہوا۔

"سلمٰی کو میری طرف سے جواب دو کہ۔۔۔۔"

"وہ میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔"

"کیا لکھا ہے؟"

"تمہاری طرف سے اپنا کریکٹر سرٹیفکیٹ دیا ہے' اور کیا؟" وہ ہنسا۔ "اچھا یہ کسی سیف الملوک کی بھی ای میل آئی ہوئی ہے۔"

پریشے کے لبوں پر رقصاں مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ سیف کو تو وہ ان تین دنوں میں بھلا بھی چکی تھی۔ "کیا لکھا ہے؟"

"میں نے اور ندا ایپا (ندا آپا) نے برائیڈل ڈریس پسند کرکے آرڈر دے دیا ہے۔ باری (بری) کی ڈھیر ساری شاپنگ بھی کرلی ہے۔ ویڈنگ کارڈز کے سیمپل بھی سلیکٹ کررکھے ہیں' مگر کارڈز تو ماموں کہہ رہے تھے رمضان کے بعد ہی چھپوائیں گے اور ہاں' ماموں پرسوں کے بجائے ایک ہفتے بعد واپس آئیں گے۔ اچھا پلیز' اب جلدی اپنا ایڈونچر ختم کرکے واپس آؤ۔ یہ آنکھیں تمہیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔

تمہارا سیف۔"

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

اس نے صرف "بائے احمت" کہہ کر ریڈیو رکھ دیا۔

کئی دنوں بعد پہلی دفعہ اس پر یہ ادراک ہوا تھا کہ جسے وہ اتنا آسان سمجھ رہی تھی وہ ناممکن ہے۔ اگر اس کا خیال تھا کہ وہ افق کو پاپا سے ملوا دے گی اور وہ بخوشی اس کی تین سال پرانی منگنی توڑ دیں گے تو وہ غلط تھی۔ وہ کبھی بھی ایک سیکولر ملک سے آنے والے غیر ملکی کو اپنے سگے بھانجے پر ترجیح نہیں دیں گے۔ راکاپوشی ___ سر کرنا ایک ایڈونچر تھا' جس کی اجازت دے دینا کوئی اتنی انوکھی بات نہیں تھی' مگر منگنی ان کی عزت' ان کی زبان کا معاملہ تھا۔ وہ اس معاملے میں سخت کنزرویٹو تھے۔ وہ کبھی بھی اپنی خوشی سے یہ منگنی نہیں توڑیں گے۔ اور وہ ان کی خوشی کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی خواہش' اپنی محبت کے لیے اپنے باپ کو ان کے خونی رشتوں سے محروم نہیں کرسکتی تھی' جو ان کی زندگی تھے۔

ادھر اس کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں' اور وہ منگنی توڑنے کے متعلق سوچ رہی تھی؟ وہ ایسا کبھی بھی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ جانتی تھی' اگر پاپا افق کے لیے بے دلی سے مان بھی گئے تو افق کبھی بھی ترکی نہیں چھوڑے گا' اسے اس کے ساتھ ترکی جانا پڑے گا۔ پیچھے پاپا اپنے رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی ویسے ہی اکیلے ہوں گے۔ جیسے وہ اس وقت ان ویران پہاڑوں میں اکیلی پڑی تھی۔ وہ شخص اس کا باپ تھا' وہ اس کو دکھ نہیں دے سکتی تھی۔ وہ بروکے خطرناک گلیشیئر سے لڑ سکتی تھی' مگر وہ اپنے رشتے داروں کی منگنی توڑنے کے بعد کی ممکنہ "بلیک میلنگ" سے ہار گئی تھی۔

رات کے اس پہر اس اندھیرے برفانی غار میں بیٹھے' اسے افق اور اپنے باپ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

اس نے ایک نظر اپنے گھٹنے پر سر رکھ کر بے خبر سوتے افق کو دیکھا' جو نیند میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کراہتا تھا' شاید اس کا زخم ناسور بنتا جا رہا تھا اور اسے ناقابل برداشت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے ٹوپی پہن رکھی تھی' مگر اس میں سے بھورے بال نکل کر ماتھے پر بکھرے تھے۔ باہر چاند تھا نہ تارے' غار میں روشنی نہ ہونے کے باعث وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"کچھ عشق تھا' کچھ مجبوری تھی۔"

وہ زیر لب بڑبڑائی اور آنکھیں موند لیں۔ اس نے اپنا انتخاب کر لیا تھا۔

"تم مجھے بہت دیر سے ملے افق ارسلان! کاش پہلے ملے ہوتے....." آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

21 اگست 2005ء

کسی دھماکے کی آواز نے اسے جگایا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ برفانی غار میں بالکل تنہا تھی۔ اس کے گھٹنے پر بوجھ نہیں تھا۔

"افق کہاں گیا؟ اوہ میرے اللہ!" وہ چکرا کر رہ گئی۔ اور پھر بہت تیزی سے دونوں ہاتھوں پیروں پر بلی کی طرح رینگتی غار سے باہر نکلی۔

وہ غار کے دہانے کے دائیں طرف چند قدم دور بیٹھا تھا۔ اس نے زخمی ٹانگ برف پر لٹا رکھی تھی' جبکہ بایاں گھٹنا سیدھا کھڑا تھا۔ کمر برفیلی دیوار سے ٹکائے وہ بے تاثر نگاہوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔

"تم ادھر کیوں بیٹھے ہو؟" اس کے ساتھ ویسے ہی دو زانو ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے فکرمندی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ برستی برف کے کچھ ٹکڑے اس کے کپڑوں' ٹوپی اور چھوٹی چھوٹی بھوری شیو میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ طوفان برس برس کر اب تھمنے کو تھا' مگر برف بے حد خراب تھی۔ چند چند منٹ بعد ایولانچز آ رہے تھے۔ اب بھی اسے کسی گرتے ایولانچ کی آواز نے جگایا تھا۔

"نہیں بیٹھ..... سکتا..... اس قبر میں..... نو مور..... نو مور....." اس کی سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ کل کے مقابلے میں آج اس کے چہرے سے چھلکتی نقاہت اور کمزوری میں اضافہ ہوا تھا۔ اب اس کی توانائی ختم ہونے کو تھی۔ وہ اندر ہی اندر مر رہا تھا۔

"تمہیں درد ہو رہا ہے؟"

"ہاں۔" اب وہ جھوٹ بول بول کر تھک گیا تھا۔

جانے کتنی دیر سے باہر آ کر بیٹھا تھا۔ پریشے نے پلٹ کر ایک نگاہ غار پر ڈالی۔ وہ واقعی برفانی قبر تھی۔

"بس تم فکر مت کرو۔ صبح ہو گئی ہے۔ طوفان تھمنے کو ہے۔ وہ بس آتے ہی ہوں گے۔" اس کی دھند میں دور دور تک دیکھنے کی سعی کرتی آنکھیں کسی ہیلی کاپٹر کو نہ پا کر مایوس سی لوٹ آئیں۔ افق جواب دیے بنا نیم وا بوجھل پپوٹوں سے سامنے کو دیکھتا رہا۔

صبح کی سفیدی سے قراقرم کے پہاڑ منور تو ہوئے تھے' مگر سورج کی سرخ روشنی اور تمازت دھند کے پردے میں چھپ کر رہ گئی تھی۔

وہ غار سے دو آئس اسکریوز اور ایک **Prusik** اٹھا لائی اور افق کو باندھ دیا۔ خود کو بھی حفاظتی رسّی سے محفوظ کر لیا۔ طوفان کی رفتار سست ضرور پڑی تھی' مگر برفیلی ہوائیں اور برف باری ہنوز جاری تھی۔

دفعتاً اس کی نگاہ افق کے ہاتھوں میں پکڑے سرخ مفلر پر پڑی۔ اس مفلر کے ساتھ اسے بیتے لمحے بہت یاد آئے تھے۔ ماہو ڈھنڈ کے پانیوں پر رقص کرتی حسین پریاں' اشوکا پتھروں سے سر پٹختا پانی' مری مال روڈ پر اترے بادل..... وہ سب اب صدیوں پرانی یاد لگتا تھا۔

اس لمحے گرتی برف اور کہر میں ڈوبے پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ وہ دو انچ کا یہ فاصلہ مٹا دے اور اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر خوب روئے' اتنا روئے کہ اس کے آنسوؤں سے راکا پوشی کی ساری برف پگھل جائے' اور پھر وہ تھک کر سو جائے اور جب جاگے تو ساری مشکلات' تکالیف اور پریشانیاں اس کی زندگی سے غائب ہوں۔ وہ جاگے تو وہ اپنے گھر میں ہو اور سوات جیسا ہنستا مسکراتا شوخ سا افق اس کے سرہانے کرسی ڈالے بیٹھا ہو۔ مگر سوچ اور حقیقت میں کتنا فرق ہوتا ہے نا؟

اس نے اپنے منجمد ہوتے ہاتھوں میں افق کا ٹھنڈا دایاں ہاتھ تھام لیا۔ دونوں کے ہاتھ دستانوں کے باوجود اتنے یخ تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے برف کے تین ٹکڑے اوپر نیچے رکھے ہوں۔

"جب میں چھوٹی تھی تو ایک کہانی بہت شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ اس کہانی میں حسین وادیوں اور فلک بوس پہاڑوں کا ذکر تھا' ہجر کی طویل راتوں کے بعد ملن کی خوش کن گھڑیوں کا ذکر تھا۔ ایک بہادر شہزادہ' دنیا کے سب سے حسین پہاڑ کی چوٹی پر سونے کے پنجرے میں مقید ایک پری کو چھڑانے جاتا ہے' جس کو ظالم دیو نے صدیوں سے اس پنجرے میں قید کر رکھا تھا۔ ہزاروں سال سے' دنیا کے بننے سے بھی پہلے سے' وہ پری سونے کی سلاخوں کے اس پار نگاہیں جمائے شہزادے کی راہ تک رہی تھی۔ پھر شہزادہ اس پہاڑ پر جاتا ہے اور....."

وہ یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئی۔ افق اب گردن ترچھی کیے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح دھند میں سامنے ہاراموش پر نئی پڑی برف کو تک رہی تھی۔

"جب میں ایک ڈسٹرکٹ میں تھی تو گرمیوں کی چھٹیوں میں پاپا کو بتائے بغیر اپنے ٹیچرز کے ساتھ' کمبریا کے ٹوا اسکول کے ٹیچرز کے ساتھ' سوئس مرغزار میں جایا کرتی تھی۔ یہ میرا اور ماما کا سیکریٹ تھا۔ ہم نے پاپا کو اس کے متعلق کبھی آگاہ نہیں کیا۔ صرف اس لیے کہ وہ پریشان ہوں گے اور میں پاپا کو پریشان یا اپ سیٹ نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اپنے رشتے داروں سے بہت محبت کرتے ہیں' انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ ماما ہمیشہ میری ڈھال بنا کرتی تھیں' اب ہوتیں تو ڈھال بن جاتیں' مگر وہ نہیں ہیں۔"

وہ ادھوری باتیں کر رہی تھی۔ دور ہاراموش کی چوٹی کے قریب برف میں دراڑ پڑ رہی تھی۔ وہ بنا پلک جھپکے اس کریک کو دیکھے گئی۔

"فکر کیوں کرتی ہو؟ خود ہی تو کہتی ہو کہ وہ آ جائیں گے' جیسے ہالی ووڈ کے فلموں کے آخر میں پولیس آ جاتی ہے۔ ہمیں بچا کر لے جائیں گے۔ پھر میں تمہارے پاپا کے پاس جاؤں گا۔" وہ مبہم سا ہنسی۔ "کیوں جاؤ گے؟" اس کی نگاہیں دراڑ سے نیچے ٹوٹتی برف پر تھیں۔

"تم میرے منہ سے کیا سننا چاہتی ہو؟" وہ بہ دقّت بول پا رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ اب کچھ سننے کی حسرت نہیں رہی۔" دراڑ کے نیچے کی برف کے ٹکڑے ٹوٹ کر زور سے چند فٹ نیچے گرے اور پھر ساری برف سفید دھول میں تبدیل ہو کر تیزی سے نشیب میں گرنے لگی۔

"پری.....! پریشان مت ہو۔ ہم سب کو منا لیں گے۔ پھر میں تمہیں ترکی لے جاؤں گا اور....." وہ کھانسنے کو رکا۔

"مجھے خواب مت دکھاؤ افق۔" اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ "خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ یہ ٹوٹ کر ساری عمر آنکھوں میں کرچیوں کی طرح چبھتے رہتے ہیں۔ آنکھیں زخمی ہو جاتی ہیں' روح بھی زخمی ہو جاتی ہے۔ مجھے خواب مت دکھاؤ۔"

سفید دھول نے نیچے گرتے ہوئے ایک بڑا حصہ اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"پری! تم....."

"نہیں افق..... ابھی تم صرف میری سنو۔ میں ساری رات ٹھیک سے سو نہیں سکی۔ میں غلط تھی افق! انشاء' تم' ہم سب غلط تھے۔ پاپا نے دس لوگوں کے سامنے میری منگنی کی ہے۔ میں وہ منگنی توڑ کر ان کو دکھ نہیں دے سکتی۔ میں ایسا کوئی نیا رشتہ نہیں بنانا چاہتی جس کی بنیاد میں پرانے رشتوں کی قبریں ہوں۔ میں

نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میری بات غور سے سنو۔
افق! تم مجھ سے آج اس برفانی غار کے باہر بیٹھے ایک وعدہ کرو۔ راکاپوشی کے گلیشیئرز، ہاراموش پر آتا ایولانچ، اور یہ گرتی برف اس عہد کی گواہ ہوگی۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ یہاں سے نکلتے ہی تم فوراً واپس چلے جاؤ گے۔ ہمیشہ کے لیے واپس ترکی چلے جاؤ گے اور پھر پری کے لیے کبھی واپس نہ آنا۔ پری اب سونے کے پنجرے سے آزاد نہیں ہونا چاہتی۔"

وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ "بس؟ صرف اپنے بارے میں سوچا اور فیصلہ سنا دیا؟ میرے بارے میں کچھ نہیں سوچا؟"

"تمہیں واقعی لگتا ہے میں نے تمہارے بارے میں کچھ نہیں سوچا؟" دور ہاراموش پر اب بالکل سکوت تھا، جیسے ایولانچ کبھی آیا ہی نہ ہو۔

افق نے گردن نفی میں ہلائی اور دوبارہ سر پیچھے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ "جو تم کہو میں ویسا ہی کروں گا۔" وہ ہار مان گیا تھا۔ اتنے مختصر الفاظ میں فیصلہ صادر کر کے پریشے نے اس کے پاس کوئی چوائس نہیں چھوڑی تھی۔

"مگر پری..... تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔" وہ پھر کتنی ہی دیر چپ رہا، اور کچھ نہ بولا۔ اس میں مزید بولنے کی سکت نہیں تھی۔

برف کے تینوں ٹکڑوں نے ابھی تک ایک دوسرے کو تھاما ہوا تھا۔ پھر پریشے نے ان کے درمیان پھنسا وہ سرخ کپڑا نکالا، ترکی کا جھنڈا، جسے کئی دن تک وہ مفلر سمجھتی رہی تھی۔ اس نے "سرخ مفلر" جھاڑا۔ برف کے کرسٹلز نیچے گرے۔ وہ بے حد گیلا تھا۔ ان دونوں کے کپڑوں اور جرابوں کی طرح گیلا۔

پھر اس نے غار کے دہانے کے قریب برف چند انچ گہری کھودی، سرخ مفلر اندر دبایا اور اوپر برف ڈالنے لگی۔ چند لمحوں بعد کپڑا برف کی تہوں تلے چھپ گیا۔

"بس اب یہ ہمیشہ ادھر رہے گا۔" غار کے دہانے پر برف برابر کرتے ہوئے وہ بہت پیار سے بولی، جیسے کوئی اپنی بے حد قیمتی شے محفوظ کرنے کے لیے دفن کرتا ہے۔

"جانتے ہو افق! قطبین کے بعد..... دنیا کے سب سے بڑے گلیشیئرز میرے ملک میں ہیں۔ سیاچن، بیافو ہسپر، بلتورو۔ کہتے ہیں یہ گلیشیئرز اب تیزی سے پگھل رہے ہیں۔ میں سوچتی ہوں افق! آج سے دس، بیس، سو سال یا پھر سینکڑوں، ہزاروں سال بعد جب یہ گلیشیئرز پگھل جائیں گے تو پھر ایک روز ایسا آئے گا، جب قراقرم کے پہاڑوں پر سورج بہت روشن طلوع ہوگا، جس کی گرمائش سے راکاپوشی کی صدیوں پرانی برف پگھل جائے گی اور پھر "برو" میں دفن یہ مفلر اور قراقرم کے تاج محل میں دبی داستان نگر کے دریا میں بہہ جائے گی۔ پھر جہاں جہاں نگر بہے گا، اس کے کناروں کے ساتھ پڑے پتھر، پتھروں سے دور اُگے درخت، درختوں پر پھدکتی نیلی چڑیاں، چڑیوں سے اوپر سیاہ پہاڑوں کی سفید چوٹیوں کو چومتے روئی سے نرم بادل، بادلوں کے درمیان سے جھانکتی سورج کی سرخ شعائیں، اور ان سب کے اوپر چھایا نیلا آسمان، سب نگر کے دریا میں بہنے والی داستان کے نغمے سنیں گے۔ پھر نگر جس وادی میں جائے گا، جس دریا کے ساتھ ملے گا، ہنزہ، برالدو، جہلم اور نیلم کے دریاؤں میں ہر سو وہ داستان خاموشی سے سنائی جائے گی۔ کبھی تو نگر کا پانی اور اس پر چڑھی چاندنی کی تہہ سوات کے مرغزاروں میں اس جھرنے کے قریب پہنچے گی، وہ جھرنا جس کے اوپر پہاڑ پر کبھی ہم بیٹھا کرتے تھے، جہاں اداس چڑیا گیت گاتی تھی، کسی کی روٹھی محبت کے، کسی کی نارسائی کے، کسی کی جدائی کے..... تب وہ چڑیا ہماری کہانی سیاحوں کو سنایا کرے گی۔ وہ کہانی جو اس جھرنے کے پانی اور پانی میں پڑے سرمئی پتھروں کے نیچے بہت پہلے سے دبی ہوگی۔ قراقرم کی پری اور کوہ پیما کی کہانی..... ہاں کبھی تو راکاپوشی کی برف پگھلے گی اور برف میں دبی..... کہانی نگر کے دریا میں بہہ جائے گی۔"

وہ اتنی مدھم سرگوشی میں کہہ رہی تھی کہ اسے یقین بھی نہیں تھا کہ وہ سن رہا ہے۔

"اس مفلر کو یہیں رہنے دو۔ یہیں قراقرم کے تاج محل میں سونے دو۔ جانے اس کی دیواروں پر اور کتنے پیار کرنے والوں کی یادیں رقم ہیں۔ ایک اور سہی۔"
وہ خود سے بڑبڑائی۔

برف ویسے ہی اس کے اوپر ادھر آس پاس گرتی رہی۔ دھند کبھی بڑھتی، کبھی گھٹتی۔ ہلکی ہوا خاموش تھی۔ افق خاموش تھا۔ قراقرم کے پہاڑ خاموش تھے۔

سورج تب بھی نہیں چمکا، جب اسے سوا نیزے پر ہونا چاہیے تھا۔ پھر سفید سی دوپہر ڈھل گئی اور شام کا ملگوں اندھیرا قراقرم کے پربتوں اور ان کی دیوی کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔

ہر دو گھنٹے بعد پانی کی آدھی پیالی اس کی ضرورت تھی، مگر اس ڈھلتی شام میں جب اس نے اندازاً "دو ڈھائی گھنٹے بعد چولہا جلایا تو وہ ٹھنڈا پڑا رہا۔ اس نے فیول کی آخری بوتل ہلائی۔ وہ خالی تھی۔ اس نے ریڈیو اٹھا کر ٹرانسمٹ بٹن دبایا۔ وہ بھی مردہ تھا۔ اس کی بیٹری مر چکی تھی۔ اضافی بیٹریاں افق کے بیک پیک میں کہیں بہت اوپر برف میں دفن تھیں۔

[illegible]کہر میں ڈوبے دیو ہیکل جامنی پہاڑ اپنے چہروں پر سفید چادر کا بکل مارے خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ ان پہاڑوں کے اس پار بھی میلوں تک پھیلے پہاڑی سلسلے تھے۔ وہ ان کے اوپر فضا میں بے قرار منتظر نگاہوں سے کسی کی راہ تک رہی تھی۔

نہ گیس تھی، نہ پانی۔ خشکی اور سردی کے باوجود پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ بغیر پانی کے اب اس کے پاس زندگی کے چند آخری گھنٹے رہ گئے تھے۔ وہ Shiver بھی نہیں کر رہی تھی۔ Shiver کرنے سے گو کہ ایک دو لمحے کے لیے اس کا جسم گرم ہو جاتا، مگر اس اضافی حرکت سے اس کی دسترس میں موجود چند آخری گھنٹوں میں کمی ہو جاتی۔ کانپنے کے لیے توانائی خرچ ہونی تھی، اور اسے توانائی بچانا تھی۔ چند گھنٹوں کی مہلت کو کھینچنے کے لیے..... چند منٹ مزید حاصل کرنے کے لیے..... زیادہ سے زیادہ زندگی کا ایک دن مزید گزارنے کے لیے.....

"بس وہ آتے ہی ہوں گے رات کی تاریکی پھیلنے سے پہلے وہ آتے ہی ہوں گے۔ ہمیں بے آب ایک اور سفید رات نہیں گزارنی پڑے گی۔" اس کی متلاشی نگاہیں دور پہاڑی سلسلوں پر بھٹک کر بار بار مایوس لوٹ رہی تھیں۔

"سب کہاں چلے گئے؟ کرنل فاروق، آپ نے تو کہا تھا کہ آپ ہمیں لینے آجائیں گے۔ آپ کدھر رہ گئے ہیں؟ میرے اللہ! ان کو جلدی بھیج دو۔ ورنہ افق مر جائے گا۔ وہ بغیر پانی کے اس سفید رات میں مر جائے گا۔" وہ بے اختیار رونے لگی۔

برف باری پھر سے تیز ہو گئی، یوں جیسے وہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ پریشے نے امید کا ٹمٹماتا دیا نم آنکھوں میں سجائے دھند میں لپٹے آسمان پر دور تک نگاہ ڈالی۔ اس کی پلکیں بھیگتی چلی گئیں۔

"کوئی ہے؟" اس نے زور سے چلا کر کہا۔ "کوئی ہے جو ہماری مدد کرے، ہمیں اس برفیلے صحرا سے نکالے؟ خدا کے لیے کوئی تو آئے۔ ورنہ افق مر جائے گا۔" اس کی آواز پہاڑوں میں گونجتی، ان سے ٹکرا کر واپس آگئی۔

"ہمت کرو، وہ آتے ہی ہوں گے۔" بند آنکھوں سے وہ بڑبڑایا۔

پریشے نے نفی میں سر ہلایا اور نڈھال سی ہو کر پیچھے برف سے ٹیک لگالی اور ایک آخری بار دعا کی، کوئی آجائے، مگر راکاپوشی پر تو دعائیں بھی قبول نہیں ہوتی تھیں۔

"وہ کبھی نہیں آئیں گے افق کبھی نہیں۔ ہم نے جانے کتنے دن ان کا انتظار کیا، مگر وہ نہیں آئے۔ وہ اب نہیں آئیں گے۔ یہاں سے ہمیں نکالنے کوئی نہیں آئے گا۔ ہمیں ادھر ہی مرنا ہے۔ آہستہ آہستہ..... دھیرے دھیرے....."

اس نے آنکھیں بند نہیں کیں۔ بس بے تاثر پتھرائی نگاہوں سے دھند میں تقریباً "سو میٹر تک نظر آتے سرمئی سے سفید پن کو دیکھتی رہی۔ پھر برف باری اور تیز ہو گئی تو اس کا ہینو راما چھوٹا ہوتا چلا گیا۔
طوفان کئی گھنٹے ہوئے تھم چکا تھا۔ لمحے بھی تھم

چکے تھے۔ لوگ کہتے ہیں، وقت نہیں ٹھہرتا، مگر جیسے تو ماز ہومر کہا کرتا تھا، بعض اوقات وقت بھی ٹھہر جایا کرتا ہے۔

زندگی میں چند لمحے ایسے آتے ہیں، جب وقت رک جاتا ہے، گھڑیاں جم جاتی ہیں۔

تب کوئی گزرا کل اور کوئی آنے والا کل نہیں ہوتا۔

تب صرف آپ ہوتے ہیں اور آپ کی تنہائی۔

وقت کی تفریق اور حساب ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

آپ عجیب سے timeless time میں پھنسے ہوتے ہیں، جو در حقیقت وہاں ہوتا ہی نہیں ہے۔

ان لمحوں میں پوری کائنات رک جاتی ہے۔

راکاپوشی پر بھی وقت ٹھہر گیا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ نہ وہ سوچ پا رہی تھی، نہ وہ وقت کا حساب رکھ پا رہی تھی۔ کتنے بجے تھے، رات کا کون سا پہر تھا، اس کی یادداشت نے کام کرنا ترک کر دیا تھا۔ ہاں بس اسے نیند آ رہی تھی۔ وہ گہری میٹھی نیند سونا چاہتی تھی، مگر اسے اپنے لبوں کی قید سے آزاد ہوتے الفاظ فضا میں تحلیل ہوتے سنائی دے رہے تھے۔

"سونا نہیں افق...! سونا نہیں۔ اگر ہم سو گئے تو پھر کبھی نہیں جاگیں گے۔"

وہ سونا چاہتی تھی، نیند تھکاوٹ اور پیاس سے اس کا برا حال تھا ـــــ مگر دور اندر کوئی اسے جھنجوڑ کر اسے جگائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، اسے کہہ رہا تھا کہ وہ نہ سوئے۔ ہاں اندر سے وہ بھی جانتی تھی کہ اگر وہ اس رات سو گئی تو پھر وہ کبھی نہیں جاگے گی۔ اسے سونا نہیں تھا، خود کو اور افق کو جگائے رکھنا تھا۔ وہ وہی الفاظ بار بار کسی غیر ارادی عمل کے طور پر دہراتی، جانے کب اس دنیا سے، سردی، برف اور دھند کی اس دنیا سے اس دنیا میں چلی گئی، جہاں کوئی درد، کوئی تکلیف، کوئی خیال، کوئی ذہنی کشمکش، کوئی زماں اور مکاں ـــ کی تفریق نہ تھی۔ وہ دنیا زمان و مکان کی قید سے آزاد تھی۔ وہاں مکمل خاموشی اور سکون تھا۔

وہ سو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

22 اگست 2005ء

اس کے ذہن میں اندھیرا تھا۔ سماعتوں میں کوئی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی، مگر نگاہوں کے سامنے گہری تاریکی چھائی تھی۔ کمر کے پیچھے برف کی دیوار وہ محسوس کر سکتی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں سے تاریکی چھٹنے لگی اور گہرا نیلاہٹ بھرا اندھیرا ان میں بھرنے لگا۔

اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ اور پھر کئی دفعہ۔ منظر قدرے واضح ہوا تھا۔

سامنے دور دور تک پھیلے سلسلہ "قراقرم کی چاندی" چوٹیوں کی برف نیلگوں روشنی میں چمک اٹھی تھی۔ آسمان صاف تھا۔ دھند چھٹ چکی تھی۔ گہرے نیلے آسمان پر ستارے بکھرے تھے۔ جھلملاتے، ہر سو بکھرے چمکتے ستارے..... پہاڑوں سے بہت اوپر بہت اوپر تیرتے بادلوں کے پیچھے سے نارنجی شعاعیں جھانک رہی تھیں۔

راکاپوشی پر صبح اتر رہی تھی۔

گھومتے سر اور چکراتے ذہن کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھ برف پر رکھ کر زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ بہ مشکل گھٹنوں پر زور دے کر کھڑی ہو پائی۔ اس کی ٹانگیں جم کر سن ہو چکی تھیں اور دماغ پوری طرح ماؤف تھا۔

افق وہیں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ جاگ رہا تھا۔ پریشے کو کھڑے ہونے کی کوشش کرتے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ جلد اتنی خشک ہو چکی تھی کہ مسکراتے ہوئے کھنچنے سے جگہ جگہ سے خون نکلنے لگا۔

پریشے نے بے یقینی سے خود کو اور اسے دیکھا۔ وہ زندہ تھی۔ وہ اب تک مری نہیں تھی۔ اور اب بھی شاید کسی کے پکارنے پر اٹھی تھی۔ کس نے پکارا تھا اسے؟ اس نے سامنے پھیلے پہاڑی سلسلے پر نگاہ دوڑائی۔ دوران پہاڑوں کے درمیان سے آواز آ رہی

تھی۔ برفانی طوفان کے چنگھاڑنے کی آواز مگر وہ طوفان کی آواز نہیں تھی۔ وہ کوئی دھبّہ سا تھا جو ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ دھبّہ بڑا ہوتا جارہا تھا۔ سبز رنگ درمیان میں چمکتا چاند ستارہ۔۔۔

"افق اٹھو۔ وہ آگئے ہیں۔" وہ ایک دم زور سے پھٹی آواز میں چلّائی۔ اس کی بے حد خشک جلد سے خون نکلنے لگا مگر وہ پروا کیے بغیر اس سبز ہیلی کاپٹر کو دیکھتے چلّانے لگی جو فضا کا سینہ چیرتے ہوئے ان کے قریب پہاڑ کے سامنے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"افق اٹھو۔۔۔ میں نے کہا تھا نا وہ آجائیں گے۔ وہ آگئے ہیں۔" وہ خوشی سے رونے لگی تھی۔ "وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں گئے۔۔۔ دیکھو سامنے وہ آگئے ہیں۔"

وہ کھڑی تو تھی ہی اب اس نے پوری قوت سے دونوں بازو ان کی جانب ہلائے پھر منہ کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بنا کر ان کو آواز دینے لگی۔

"ہیلپ۔۔۔ ہیلپ!" وہ انہیں دونوں ہاتھوں کو ——— ہلاتی اپنی جانب بلا رہی تھی۔ سبز ہیلی کاپٹر کی ایک جھلک نے اس میں جیسے نئی روح پھونک دی تھی۔

ہیلی کاپٹر بہت چھوٹا سا تھا۔ اس میں دو سبز گرے یونیفارم میں ملبوس پائلٹ بیٹھے تھے۔ ایک کے چہرے پر گلاسز تھے اور قدرے درمیانی عمر کے دکھائی دیتے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر اڑا رہے تھے۔ وہ جان گئی کہ وہ کرنل فاروق تھے۔ ان کا کو پائلٹ نوجوان تھا۔ اور اس کے چہرے پر گلاسز نہیں تھے۔ اس نے پریشے کو ہاتھ سے اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا۔

"چلو افق۔۔۔ اٹھو۔" نقاہت کے باوجود اس نے افق کو کندھے سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

"تم جاؤ ان کے قریب۔" بہ دقت تمام وہ بولا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ وہ افق کو چلنے کا کہہ رہی تھی اور وہ اسے آگے بھیج رہا تھا دوسری جانب وہ کو پائلٹ مسلسل اسے اپنی جانب آنے کا اشارہ کررہا تھا۔

"جاؤ نا!" افق نے بیٹھے بیٹھے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے دھکیلا۔ پریشے نے اپنی حفاظتی رسّی کھولنی چاہی افق کی کھولنی چاہی۔ وہ کھل کے نہیں دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اس نے چاقو نکال کر رسی کاٹنے کی کوشش کی۔ اس کے اردگرد دستانوں پر برف گرنے لگی۔ رسی کٹ کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر بے چینی سے ہیلی کاپٹر کو دیکھا۔ کو پائلٹ نے اپنی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا اور ہاتھ میں چھوٹا سا مووی کیمرہ پکڑے فلم بنا رہا تھا۔

لرزتے منجمد ہاتھوں سے اس نے رسی کاٹی اور آزاد ہوکر ہیلی کاپٹر کے قریب جانے لگی۔ وہ جگہ کسی چھت کی منڈیر کی طرح تھی۔

برف کا پل صراط۔

وہ سہج سہج اس پر قدم رکھتی۔ ہیلی کاپٹر کے قریب بڑھنے لگی جو ابھی تک ان کے نزدیک ہی ادھر ادھر چکرا رہا تھا۔ اس کے "پنجے" برف سے بہت قریب تھے مگر وہ وہاں لینڈ نہیں کرسکتا تھا۔ پریشے سے چلا نہیں جارہا تھا۔ قدم من من بھر کے ہورہے تھے۔

اسے قریب آتے دیکھ کر مووی بناتے کو پائلٹ نے کیمرہ رکھا اور بازو اس کی جانب بڑھایا۔ وہ اس کو اندر آنے کو کہہ رہا تھا۔

پریشے نے الجھ کر اسے اور پھر گردن پھیر کر افق کو دیکھا وہ اسے اپنی جانب دیکھتا پاکر ہاتھ سے اندر جانے کا اشارہ کرنے لگا۔ وہ واپس ہیلی کاپٹر کی جانب پلٹی۔ میجر بلال اسے اندر آنے کو کہہ رہے تھے۔

"میرا ساتھی زخمی ہے پہلے اسے اٹھاؤ۔" وہ زور سے چلّائی مگر ہیلی کاپٹر کے پروں کی بھاری گڑگڑاہٹ میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔

میجر بلال نے سمجھنے والے انداز میں سرہلایا اور اسے دوبارہ اندر آنے کو کہا۔ وہ ایک پل کو ہچکچائی پھر اس کا بڑھا ہوا بازو تھام لیا۔ دوسرے ہی پل وہ ہیلی کاپٹر کے اندر تھی۔

"اوہ سر! ہم گئے۔۔۔ بس ہم گئے۔۔۔ کلمہ پڑھ لیں سر!" ہنس کر کہتے ہوئے میجر بلال نے ڈور بند کیا۔

"میرا ساتھی زخمی ہے۔ اسے سہارا دے کر اٹھانا پڑے گا۔ وہ چل نہیں سکتا۔" ہیلی کاپٹر کے اندر اتنا شور تھا کہ وہ چیخ کر بولی۔ میجر بلال نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور پھر ہیڈ فون اس کی جانب بڑھایا۔

"یو اوکے میم؟ اسے پہن لیں۔"

اس نے ہیڈ فون تھاما مگر پہنا نہیں۔ بس وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شیشے کے اس پار برف پر بیٹھے افق کو دیکھتی رہی جس نے سر برفیلی دیوار سے ٹکا کر آنکھیں موندلی تھیں۔ تب دفعتاً اسے احساس ہوا کہ افق دور ہوتا جارہا تھا۔ ہیلی کاپٹر فضا میں اوپر بلند ہو رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے الارم سا بجا۔

"وہ۔۔۔ میرا ساتھی۔۔۔ اسے بھی تو اٹھائیں آپ۔۔۔ مجھے کہاں لے کر جارہے ہیں۔" بھاری گڑگڑاہٹ اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ اس کی بے چین نگاہیں نیچے برف پر بیٹھے افق پر جمی تھیں جس کی آنکھیں بند تھیں اور گردن شانے پر ڈھلک گئی تھی۔ وہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا؟ وہ گردن سیدھی کیوں نہیں کررہا؟ کوئی اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔

"اسے مت چھوڑ کر جائیں آفیسر۔۔۔! وہ۔۔۔ وہ زخمی ہے۔ آپ لوگ اسے اٹھاتے کیوں نہیں ہیں؟" جیسے جیسے ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوتا جارہا تھا پروں کا شور بڑھتا جارہا تھا۔ اس شور کے درمیان اسے آگے والی دونوں نشستوں پر بیٹھے پائلٹس کی آوازیں ہلکی ہلکی سنائی دے رہی تھیں۔

"لڑکی چیخ کیوں رہی ہے؟"

"سر! آئی تھنک ان کو شاک ہے یا کوئی نفسیاتی اثر۔"

"اور وہ دوسرا لڑکا؟ بلال تمہارا خیال ہے وہ وہاں ہے؟"

"نہیں سر! آئی تھنک وہ مرچکا ہے۔"

"اچھا مگر باڈی تو ری کور کرنی پڑے گی۔ ترک گورنمنٹ کو۔۔۔"

شور بلند ہو رہا تھا۔ اس کے کانوں کے پردے پھٹ

رہے تھے۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ وہ کیا کہہ رہے تھے' وہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی نظریں دور ہوتے افق پر تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ آنکھیں کھولے' وہ اسے جھنجوڑنا چاہتی تھی' اسے گھسیٹ کر اپنے ساتھ ہیلی کاپٹر پر لانا چاہتی تھی' مگر وہ کانوں کے پردے پھاڑتا شور..... اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ اس نے خود کو زور زور سے چلاتے سنا۔

"وہ زندہ ہے۔ خدا کے لیے اسے بچاؤ۔ وہ زندہ ہے۔ وہ مرا نہیں ہے۔ اسے پکارو' وہ آنکھیں کھول دے گا۔"

میجر بلال نے شاید مڑ کر اس کی طرف ترحم بھری نظروں سے دیکھا بھی' اور ہیڈ فون کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا بھی' جو اس کی گود میں دھرا تھا' مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھاتا گیا..... گہرا دبیز اندھیرا..... سیاہ دھند.....

اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ پلکوں کی ادھ کھلی درزوں سے نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ وہ کسی چیز پر لیٹی ہوئی تھی اور کچھ لوگ اس چیز کو حرکت دے کر کہیں لے جا رہے تھے۔ اس سے آنکھیں نہیں کھولی جا رہی تھیں۔ وہ بس چیخ رہی تھی' چلا رہی تھی۔

"تم نے مار دیا اسے..... تم اسے مرنے کے لیے چھوڑ آئے۔"

وہ پتا نہیں کس پر چلا رہی تھی۔ کوئی سوئی کی نوک اس کی جلد میں کہیں چبھی اور پھر گہرا اندھیرا اور غنودگی تھی..... پھر اس کے کان میں کوئی مدھم سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ دھیمی دھیمی خوبصورت آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ کوئی اس کے بہت قریب تھا' اور کسی نے آہستگی سے اس کے بالوں کو چھوا۔ گرم سانسوں کی تپش اسے اپنی گردن پر محسوس ہوئی تھی۔

اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔

وہ کسی اسپتال کا کمرہ تھا۔ سفید دیواریں' سفید چھت' بستر کی سفید چادر' اس نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ قریب کھڑی ساڑھی میں ملبوس نرس نے جھٹ اس کے پیچھے تکیہ رکھا۔ وہ بیٹھ گئی تو اس نے بغور اپنے دائیں پہلو میں دیکھا' جہاں تھوڑی دیر پہلے کوئی بیٹھا کچھ کہہ رہا تھا۔

اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ بستر پر اکیلی تھی۔

Happy Second Birthday

Dr Parisheh! ———— (دوسری زندگی مبارک ہو ڈاکٹر پریشے!)

چونک کر سر اٹھایا۔ قریب ہی آرمی یونیفارم میں کرنل کے رینک کے ڈاکٹر نے اس کی فائل پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے اسے مبارک باد دی۔

"تھینک یو سر!" اس کو اپنا گلا بیٹھا ہوا محسوس ہوا۔ ساتھ ساتھ زکام بھی تھا۔

"کیسی ہیں آپ 'لٹل بریو گرل؟"

"بالکل ٹھیک۔" وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس کے جسم کے کسی حصے میں درد نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر خود پر ڈالی۔ اس نے ہلکے سے سفید کپڑے پہن رکھے تھے' جن کی آدھی آستینوں سے اس کے دودھیا بازو باہر نکل رہے تھے۔ گرم موٹے کپڑوں سے اسے بالآخر نجات مل گئی تھی۔ جلد بھی خاصی نرم تھی۔

"مجھے کیا ہوا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ صرف سائیکولوجکل شاک تھا' جو ظاہر ہے کسی ساتھی کے مرجانے پر محسوس ہوتا ہے۔ باقی صرف دائیں ہاتھ کی کلائی سوجی ہوئی تھی' کئی چھوٹے موٹے زخم بھی تھے۔"

وہ "کسی ساتھی کے مرجانے پر" کے الفاظ پر چونک سی گئی۔

"مم..... میں بے ہوش تھی کیا؟ کتنی دیر تک؟"

"تین دن تک۔ آج 25 اگست ہے میم۔" وہ مسکرائے۔ وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

"تین دن تک؟ میں اتنی لمبی بے ہوش نہیں رہ سکتی۔ ناممکن۔" بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"آپ کو کرنا پڑا تھا۔ آپ ہسٹریک ہو رہی تھیں۔ میجر بلال نے بتایا تھا کہ سم فرینڈ آف یورز ڈائیڈ آن راکا پوشی۔"

"ڈائیڈ؟" وہ سانس نہیں لے سکی۔

"آپ کے انکل' آنٹی اور ایک کزن بھی اسلام آباد سے آئی ہوئی ہیں۔"

"اسلام آباد سے؟ تو میں کدھر ہوں؟"

"آپ گلگت سی ایم ایچ میں ہیں۔ شاید آپ کو یقین نہیں آ رہا کہ آپ ایک ڈیڈلی ماؤنٹین سے بچ کر آگئی ہیں۔ آپ کا ریسکیو ماؤنٹین کلائمبنگ کی تاریخ کا۔"

"پلیز میری کزن کو بلا دیں' مجھے اس سے بات کرنی ہے۔" اس نے بے چینی سے ان کی بات کاٹی۔ وہ سر ہلا کر اسے آرام کرنے کو کہہ کر باہر چلے گئے۔

"ڈائیڈ؟ انہوں نے یہ کیوں کہا؟ وہ..... وہ کسی اور کی بات کر رہے ہوں گے۔ افق..... افق کی نہیں..... ہرگز نہیں۔"

اس کی نگاہوں نے سامنے آخری بار دیکھا' افق کا چہرہ گھوم گیا۔ بند آنکھیں' کندھے پر ڈھلکی گردن..... پریشے کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔

دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھلا اور نشاء اندر داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں متورم تھیں۔

"کیسی ہو پری؟" وہ اس کے بیڈ کے کنارے کھڑی ہو گئی۔ بیٹھی نہیں۔

"نشاء' افق کیسا ہے؟" اس نے بے قرار ہوتی دھڑکنوں کو بمشکل قابو کیا۔

نشاء کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی' پھر لبوں کو جنبش دی۔ "تم ٹھیک ہو جاؤ گی پری! شکر ہے تمہارے ہاتھ پاؤں فراسٹ بائٹ ہونے سے بچ گئے۔"

"نشاء! میں تم سے پوچھ رہی ہوں' افق کیسا ہے؟" وہ زور سے بولی۔ اس کو اپنے قدم کسی کچی برف پر کھڑے لگ رہے تھے۔ ابھی نشاء کچھ کہے گی اور اس کے نیچے کچی برف پھٹ جائے گی۔

"تم آرام کرو پری! ہم پھر بات کریں گے۔ تمہاری طبیعت....."

"نشاء! خدا کے لیے مجھے بتاؤ افق کیسا ہے؟" کوئی اس کے جسم سے جان نکال رہا تھا۔

نشاء چپ چاپ کھڑی لب کاٹتی رہی۔ وہ بول کیوں نہیں رہی' وہ چپ کیوں ہے؟ پریشے کا دل گھبرانے لگا۔

"نشاء پلیز مجھے بتاؤ' وہ ٹھیک تو ہے؟ وہ اسے بچانے گئے تھے یا نہیں؟ خدا کے لیے نشاء مجھے بتا دو' ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔"

(باقی آئندہ)

قارئین!

اس مقام پر آکر ہمارے دل کی دھڑکن بھی رُک سی گئی ہے۔ کیا اس مہم جو کہانی کا انجام یہیں پر ہو جاتا؟ یہ سوال ہمارے ذہن میں بھی ابھرا ہے۔ یقیناً "نمرہ احمد بھی سچی کہانی کہتے کہتے اس مقام پر آکر ٹھہر گئی ہیں۔ ارادہ تو یہی تھا کہ اس ماہ آخری قسط ہو۔ لیکن اب ہم "آخری قسط" کے لیے مزید صفحات ان کے لیے مختص کرتے ہیں کہ وہ صراحت سے اپنی کہانی کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے اطمینان خیز "اختتام" پر لاکھوں قارئین کو مطمئن کریں۔ سو آخری قسط آپ اپریل کے شمارے میں ملاحظہ کیجیے گا۔ اور اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

نمرہ احمد

قراقرم کا تاج محل

یہ کہانی ڈاکٹر بریرہ جہانزیب کی ہے، جو خوابوں کے حقیقت بننے پر یقین رکھتی ہے۔ وہ طبیعتاً "مشکل پسند ہے اور ہر چیز میں خوب صورتی تلاشتی ہے۔ پریشے، والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ پریشے کو یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن کوئی شہزادہ اس کے خوابوں کو تعبیر کا روپ دے گا۔ اسے جھٹکا اس وقت لگتا ہے، جب اس کے والد اس کی

مکمل ناول

منگنی پھوپی زاد سیف سے کردیتے ہیں۔ سیف اور پھوپھو کی فیملی کی طبیعت حاکمانہ ہے‘ مگر والد کے فیصلے پر پریشے سر جھکا دیتی ہے۔ ماموں زاد کزن نشاء سے اس کی گاڑھی چھنتی ہے۔ ماموں کی پوری فیملی بھی پریشے کے رشتے پر ناخوش ہیں۔ پھوپھو کو ہر وقت پریشے کا رشتہ ہاتھ سے نکل جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس لیے وہ جلد شادی پر زور دیتی ہیں۔ شادی دو مہینے بعد طے پاتی ہے۔ کچھ دن آزاد زندگی گزارنے کے لیے وہ‘ نشاء کے ساتھ نادرن ایریاز جانے کا پلان بنالیتی ہے۔ جس پر سیف ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔

مال روڈ پر پریشے اور نشاء کی ملاقات ایک ترک انجینئر افق ارسلان سے ہوتی ہے‘ جو راکاپوشی پہاڑی سر کرنے پاکستان آیا ہے۔ اس کی ساحرانہ اور پراسرار شخصیت پہ پریشے ٹھٹک سی جاتی ہے۔ بظاہر وہ سرد مہری کا مظاہرہ کرتی ہے‘ بعد میں پتا چلتا ہے کہ افق بھی پریشے اور نشاء کے ساتھ ہی ٹور کمپنی کے تحت نادرن ایریا جارہا ہے۔ ٹور کے دوران ان کی ملاقات ایک لڑکی ارسہ سے ہوتی ہے جو ادیبہ بھی ہے۔ پریشے اور افق ارسلان کی نوک جھونک غیر محسوس انداز میں دونوں کو ان کہے خوب صورت جذبے میں جکڑ دیتی ہے۔ افق کا خصوصی لگاؤ دیکھتے ہوئے پریشے اسے اپنی منگنی کا بتا دیتی ہے‘ جس پر وہ ساکت رہ جاتا ہے۔

واپس آکر بھی پریشے اپنے آپ کو ایک سحر گرفتار میں محسوس کرتی ہے۔ وہ جہانزیب صاحب سے راکاپوشی کی ایکسپیڈیشن پر جانے کی اجازت مانگتی ہے‘ حیرت انگیز طور پر اسے اجازت مل جاتی ہے۔ نشاء‘ حبیب (نشاء کا بھائی) کے دوستوں کے گروپ کے ساتھ پریشے محض افق ارسلان سے ملنے راکاپوشی آتی ہے۔ افق بے حد نارمل انداز میں اس سے ملتا ہے۔ اس ملاقات میں افق ارسلان‘ پریشے کو ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر دکھاتا ہے۔ پریشے کے استفسار پر افق بتاتا ہے کہ یہ اس کی بیوی حنادے ہے۔ پریشے اس خبر پہ گم صم ہوجاتی ہے۔

پریشے واپس جانے کا فیصلہ کرلیتی ہے‘ جس پر افق کو خاصی حیرت ہوتی ہے۔ غصے میں وہ حنادے کو برے القاب سے نوازتی ہے تو افق اسے بتاتا ہے کہ حنادے مرچکی ہے۔ پریشے کو اپنے رویے کی بد صورتی کا احساس ہوتا ہے تو وہ افق سے معافی مانگ لیتی ہے۔

راکاپوشی ایکسپیڈیشن پر ان کا گروپ روانہ ہوتا ہے تو راستے میں موسم خراب ہے۔ ایک کریوس میں ارسہ گر کر مر جاتی ہے۔ یہ حادثہ افق اور پریشے کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ان کا ساتھی پورٹر بھی موسم کی خرابی کے باعث انہیں چھوڑ جاتا ہے۔ پریشے‘ افق کے ساتھ اس مہم کی جانب رواں ہوتی ہے کہ اچانک ایک ایوالانچ افق کو گہری کھائی میں دھکیل دیتا ہے۔ یہ صورتِ حال پریشے کے حواس مختل کردیتی ہے۔ وہ رسی کے ذریعے افق کو ڈھونڈنے اکیلی نیچے اترتی ہے۔

کئی میٹر نیچے افق زخمی حالت میں پریشے کو مل جاتا ہے۔ ان کے سروائیول کا زیادہ تر سامان طوفان کی نظر ہوچکا ہے۔ پریشے بہت مشکل سے بیس کیمپ سے رابطہ کرپاتی ہے۔ وہ پاکستان آرمی سے بھی مدد کی اپیل کرتی ہے۔ خراب موسم ان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ بہت دقتوں سے تین دن وہ کیمپ میں گزار پاتے ہیں۔ پریشے ہمت کرکے افق کو لے کر نیچے اترنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ تقریباً ”ڈیڑھ ہزار میٹر نیچے کا سفر کرتے ہیں۔ پھر افق کی ہمت جواب دینے لگتی ہے۔ ایسے میں صرف پریشے کا ساتھ اس کی سانس کی ڈور کو باندھے ہوئے ہے۔ پریشے‘ افق سے وعدہ لیتی ہے کہ صحت یاب ہوکر وہ واپس اپنے ملک چلا جائے گا۔ شدید مشکلات کے بعد جب وہ مایوس ہوجاتے ہیں تو آرمی ٹیم انہیں ریسکیو کرنے آپہنچتی ہے۔

افق اسے پہلے ہیلی کاپٹر میں سوار ہونے کا کہتا ہے۔ کپتان اسے بٹھاتے ہی ہیلی کاپٹر اڑا لیتا ہے۔ یہ صدمہ کہ افق وہیں رہ گیا ہے۔ پریشے کے حواس سلب کرلیتا ہے۔ وہ تین دن اسپتال میں بے ہوش رہتی ہے۔ ہوش میں آتے ہی وہ نشاء سے افق کے متعلق پوچھتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

چوتھی اور آخری قسط

نشاء نے آہستہ سے سرہلایا۔ ”وہ ٹھیک ہے۔“

پریشے نے بے اختیار اپنا سر تکیے پر گرا دیا اور تھک کر سینے میں دبی سانس خارج کی تو ڈاکٹر ارسہ کی بات کررہا تھا۔

”مگر...“ نشاء ایک لحظہ کو رکی۔

”مگر کیا؟“ ایک ثانیے کو پوری کائنات رک گئی۔ وہ سانس روکے نشاء کو دیکھ رہی تھی۔

”مگر... مگر وہ چلا گیا پریشے!“

”چلا گیا؟“ اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ ”کدھر چلا گیا؟“

”واپس ترکی۔ میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کہتا تھا‘ میں نے پری سے وعدہ کیا ہے کہ میں چلا جاؤں گا‘ میں نے کہا بھی کہ میں ممی پاپا سے بات کروں گی‘ انکل سے بات کروں گی‘ مگر وہ نہیں رکا۔ تم نے اچھا نہیں کیا پری! تم نے اس سے وعدہ کرکے اس کے ساتھ اور اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“

”پھر اور کیا کرتی؟“ کہیں بہت اندر زور سے کچھ ٹوٹا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ”اچھا ہوا وہ چلا گیا۔ میں اس کے لیے پاپا کو دکھ نہیں دے سکتی تھی۔“

کتنے ہی پل خاموشی سے سرک گئے۔

”کب گیا وہ؟“ نظریں اٹھائے بغیر اس نے رندھی آواز میں سوال کیا۔

”کل دوپہر میں۔ جانے سے پہلے تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ اس کی ٹانگ بہت خراب تھی‘ مگر ضائع ہونے سے بچ گئی۔ دونوں ہاتھ پیر فروسٹ بائٹ ہوچکے تھے‘ مگر پرمننٹ ڈیمج نہیں ہوا اور جو ڈیمج ہوا‘ وہ تم نے کیا اس کے ساتھ پریشے! تم اس کی شکل دیکھ لیتیں تو تمہارا دل پھٹ جاتا۔ تم نے اسے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ وہ اتنا بکھرا بکھرا اور شکست خوردہ لگ رہا تھا کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی زندہ دل افق ہے جس کے ساتھ ہم نے سوات میں آٹھ دن گزارے تھے۔ وہ تو کبھی بھی ایسا نہیں تھا پری! تم نے اس کے ساتھ بہت برا کیا۔ بہت برا۔“

اسے یاد تھا‘ جب وہ بے ہوش تھی‘ تب بھی لاشعور میں کہیں نہ کہیں اسے افق کی آمد کا پتا چل گیا تھا۔ اس کے لمس کی تمازت‘ سانس کی حدت‘ نرم دھیمی آواز‘ مگر وہ کیا کہہ رہا تھا‘ وہ کوشش کے باوجود یاد نہ کرپائی۔

”مجھے اس سب کے بارے میں ڈاکٹر احمت دوران نے فون کرکے بتایا تھا۔ ترک گورنمنٹ کا بہت پریشر تھا‘ جس کے باعث پریذیڈنٹ نے فوری ریسکیو آپریشن کا آرڈر دیا۔ پھر وہ تمہیں سیدھا گلگت لائے۔ میں‘ ممی اور پاپا بھی یہاں آچکے تھے۔ افق کو انہوں نے بیس کیمپ اتارا۔ وہ تندرست نہیں تھا‘ مگر کل وہ گلگت آیا‘ مجھ سے ملا اور پھر تم سے ملا۔ پھر وہ اسلام آباد چلا گیا۔ کل شام اس کی فلائٹ تھی۔

سیف بھائی اور تمہاری پھپھو کو پاپا نے اپنے طریقے سے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ تم بے فکر رہو‘ وہ تم سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ سیف بھائی کو نیوز پیپر سے پتا چلا تھا‘ اور ان کی تنگ نظری کو تو تم جانتی ہو‘ اسی لیے پاپا نے سب ہینڈل کرلیا۔ انہیں افق کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ویسے بھی وہ دو دن سے کراچی میں ہیں اور انہیں کوئی اتنی خاص پروا بھی نہیں۔ پھپھو کو بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ پڑے بھی تو ارسہ کی ڈیتھ کے اثر کے باعث وہ تم سے کچھ نہیں پوچھیں گی۔“

”اور ارسہ کے پیرنٹس؟“

”وہ آئے تھے اور افق سے ملے بھی۔ افق نے انہیں ارسہ کا ادھورا ناول دے دیا۔ افق کہہ رہا تھا‘ اس ناول کا اینڈ ہیپی ہونے والا تھا‘ مگر شاید اب نہ ہوسکے۔“

”میں جانتی ہوں۔ ارسہ! وہ ہماری کہانی لکھ رہی تھی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”حیرت ہے‘ افق مجھ سے زیادہ زخمی تھا‘ پھر بھی ہر کسی سے ملتا پھر رہا تھا‘ جبکہ مجھے بے ہوش کرکے رکھا ہوا تھا؟“

”اس لیے کہ وہ ہسٹریک نہیں ہورہا تھا۔“ نشاء ہولے سے ہنسی۔

وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

☼ ☼ ☼

26 اگست 2005ء

ہیلی کاپٹر سبز گھاس پر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔وہ بالوں کو انگلیوں سے سنوار کر انہیں اونچی پونی ٹیل میں مقید کر کے برآمدے سے باہر نکل آئی۔(اس کا کیچر گھر میں پڑا تھا۔)

اسے گلگت سے اسی ہیلی کاپٹر پر اسلام آباد جانا تھا' کرنل فاروق جا رہے تھے' تو وہ بھی ساتھ ہی چلی آئی۔ ہیلی کاپٹر کے پر ساکن تھے۔اس کے دروازے کے قریب میجر بلال کھڑا تھا۔

"ہیپی سیکنڈ برتھ ڈے میم!" اسے آتے دیکھ کر وہ خوش دلی سے مسکرایا۔وہ بھی جواباً" مسکرا دی۔ کتنا غلط سمجھتی رہی تھی وہ ان کو' کتنی بدگمان تھی کہ وہ اسے بھول گئے ہوں گے' مگر انہوں نے اسے نہیں بھلایا تھا۔وہ اسے وقت پر بچانے آ گئے تھے۔

"میں نے اپنے ریسکیو کی ویڈیو دیکھی تھی آج۔ مجھے میجر خالد نے دکھائی۔ بہت امیزنگ کام کیا آپ نے۔ اتنا مشکل ریسکیو کیسے کر لیا آپ نے؟ میں اب تک امیزڈ (ششدر) ہوں۔"

"ارے میم! جو کیا اللہ نے کیا۔پاک فوج نے بس ہمت کی۔ ویسے امید ہے اب آپ مجھے برا بھلا نہیں کہیں گی۔"

وہ شرمندہ سی ہو گئی "نہیں وہ دراصل۔میں پریشان ہو گئی تھی۔ آپ بیس کیمپ سے اچانک چلے کیوں گئے تھے؟"

"میم! ہم فیول کے لیے گئے تھے' اور ہنزہ کے باہر تین دن موسم ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جیسے ہی آسمان صاف ہوا ہم آ گئے۔"

"مگر آپ نے افق ارسلان کو ہیلی کاپٹر میں کیوں نہیں بٹھایا؟ یہ اچھا خاصا بڑا ہیلی کاپٹر ہے۔" اس نے سامنے کھڑے ہیلی کاپٹر کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ وہ نہیں ہے جس نے آپ کو ریسکیو کیا تھا۔ آپ کو ٹھیک سے یاد نہیں۔وہ "لاما" تھا' اس میں ہم ارسلان کو کیسے بٹھاتے؟ وہ تو بالکل مچھر تھا۔"

"کون ارسلان؟"

"نہیں میڈم! ہمارا ہیلی! لاما مچھر ہوتا ہے۔" وہ ہنسا۔ "وہ زیادہ ویٹ نہیں اٹھا سکتا۔ تین سے زیادہ بندے اس میں نہیں بیٹھ سکتے۔ کرنل زبیر اور میجر عاصم نے اپنی گلہری' آئی مین اپنے squirrel سے ارسلان کو ریسکیو کیا۔اس دفعہ راکاپوشی پر ہم نے دو ہیلی کاپٹر بھیجے تھے' جیسے بلتورو پر ریسکیو آپریشن کرتے ہوئے بھیجتے ہیں۔"

پریشے نے غور سے سبز رنگ کے ہیلی کاپٹر کو دیکھا۔ "ہاں یہ وہ مچھر تو نہیں لگ رہا۔"

"ارے میم! اسے کچھ مت کہیں' یہ مائنڈ کرے گا۔"

وہ ہنس دی۔ "میجر بلال' یہ ہیلی کاپٹر ہے۔" جیسے وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ "یہ انسان نہیں ہے۔"

"جناب! یہ شیر جوان ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے سبز رنگ کی دھات کو تھپکی دی۔

"انی ویز میجر بلال میں میجر عاصم سے مل نہیں سکی۔ان کو میری طرف سے شکریہ بول دیجیے گا۔"

"راجر میم!" پھر یکدم وہ بولا "ہاں میجر عاصم آپ کا پوچھ رہے تھے ۔شاید کوئی چیز تھی آپ کی ان کے پاس۔۔۔"

"نہیں کچھ بھی نہیں تھا۔ اچھا خدا حافظ۔اور ایک دفعہ پھر شکریہ۔" وہ بات کاٹ کر ہیلی کاپٹر کے کھلے دروازے سے اندر چڑھنے لگی۔

میجر بلال نے اب قدرے الجھ کر کچھ کہنا چاہا' شاید اسے کوئی الجھن تھی' مگر پریشے کو علم تھا کہ وہ کوئی قیمتی شے چھوڑے نہیں جا رہی تھی۔ جو وہ کھو چکی تھی' اس کے بعد اگر کچھ رہ بھی گیا تھا تو اسے پروانہ تھی۔وہ اندر بیٹھ گئی۔ کرنل فاروق تیار ہی تھے' سو دروازہ بند کر دیا۔

ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہونے لگا۔اس نے ہیڈ فون کانوں پر چڑھا لیے۔ شور نسبتاً" کم ہوا۔

وہ کھڑکی کے پار چھوٹے ہوتے گلگت اور دور نظر آتے پہاڑوں کو دیکھنے لگی' جن کے درمیان بہت تمکنت اور غرور سے پربتوں کی دیوی کھڑی تھی۔

"thank you raka poshi!" اس نے چمکتی دیوار کو کس بات کا شکریہ ادا کیا' وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

دور دور تک پھیلے یہ وہ پہاڑ تھے جن کی پیشانیاں آسمان جھک کر چوم رہا تھا۔ وہ واقعی عظیم پہاڑ تھے اور ان کے درمیان میں قراقرم کا تاج محل کھڑا تھا' جس کی سفید مرمریں دیواروں پر محبت کی ایک خاموش داستان لکھی تھی۔وہ بلاشبہ آگرہ کے تاج محل سے زیادہ سفید اور حسین تھا۔

اس نے ایک آخری نظر قراقرم کے کوہساروں پر ڈالی۔

"الوداع قراقرم ۔الوداع ہمالیہ۔۔مجھے تم عظیم چوٹیوں کی قسم! میں زندگی میں پھر کبھی تم ظالم پہاڑوں میں نہیں آؤں گی۔"

اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ کتنے دنوں بعد آج اس کی کمر کے پیچھے برف نہیں تھی۔

"تو یہ تھا میری کہانی کا اختتام۔ آخر اس موڑ پر آکر قراقرم کی پری اور کوہ پیما کی کہانی بالآخر ختم ہو گئی۔" وہ بند آنکھوں سے بے حد افسردگی سے مسکرائی۔

لیکن قراقرم کی پری اور کوہ پیما کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے
کبھی دل سوز لمحوں سے
کبھی بے کار رسموں سے
کبھی تقدیر والوں سے
کبھی مجبور قسموں سے
مگر یہ ہار جاتی ہے
کبھی یہ پھول جیسی ہے
کبھی یہ دھول جیسی ہے
کبھی یہ چاند جیسی ہے
کبھی یہ دھوپ جیسی ہے
کبھی مسرور کرتی ہے
کبھی یہ روگ دیتی ہے
کسی کا چین بنتی ہے
کسی کو رول دیتی ہے
کبھی لے پار جاتی ہے
کبھی یہ مار جاتی ہے
محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے

اسلام آباد واپسی پر اسے ہر اس بندے سے لیکچر ملا جس کی اس نے توقع کی تھی ۔ پھپھو' ندا آپا' ماموں' ممانی' اور سب سے بڑھ کر سیف سے۔

"تمہیں احساس ہے کہ تمہاری زندگی ہمارے نزدیک کتنی اہمیت رکھتی ہے؟" وہ کتنی ہی دیر بولتا رہا' اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے اور کوہ پیمائی کے نقصانات بتاتا رہا' مگر جس طرح وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی تو وہ جھنجوڑ کر بولا۔ پریشے نے سر اٹھایا۔اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

"آپ کے لیے میری زندگی اہم ہے یا میں آپ کی زندگی ہوں؟" سیف کچھ بول نہ سکا۔

"اگر آپ کا لیکچر ختم ہو چکا ہے تو میں جاؤں؟"

"پریشے! تم آئندہ۔۔۔"

"آئندہ تم پہاڑوں کا نام نہیں لو گی' کلائمبنگ جیسی فضول اسپورٹ میں حصہ نہیں لو گی' میری ہر ای میل کا جواب دو گی' یہی نا؟ تو میں یہ باتیں سن چکی ہوں۔ جواب دینا میں ضروری نہیں سمجھتی۔" وہ میز پر رکھے

غذ فائل میں جوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سیف اتنا بے وقوف نہ تھا کہ اس کا سرد مہر رویّہ نوٹ نہ کرتا مگر وہ اس سب کو اس کی دوست کے مرنے کے باعث اپ سیٹ ہونا سمجھ رہا تھا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ پرس کندھے پر 'اوور آل بازو پر ڈال کر باہر چلی آئی۔ وہ ہسپتال جا رہی تھی۔ گزشتہ روز ہی اس نے پمز جوائن کیا تھا۔

پاپا آج صبح ہی واپس پہنچے تھے۔ یہ پریشے کو بعد میں علم ہوا کہ پاپا کو سارے معاملے کی مکمل خبر تھی مگر جانے کیوں شاید ارسہ کی ڈیتھ کے باعث 'انہوں نے پریشے کی ذہنی حالت محسوس کرتے ہوئے کچھ نہ پوچھا کوئی باز پرس نہیں کی' کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔ اخبار میں یقیناً" انہوں نے تمام خبر پڑھ لی تھی۔ "مایہ ناز ترک کلائمبر افق ارسلان" کو انہوں نے نظر انداز کر دیا یا اہمیت نہ دی۔ جیسے وہ خود ایک ماہ پہلے تک کئی دفعہ کلائمبنگ میگزین اور اسپورٹس میگزینز میں افق ارسلان کا نام پڑھنے کے بعد اسے نظر انداز کر دیتی تھی۔

پاپا اس کے معاملے میں بہت حسّاس تھے۔ مگر چونکہ وہ بالکل ٹھیک واپس آگئی تھی' اس لیے انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔

مگر وہ "بالکل ٹھیک" نہیں تھی۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ وہ زندگی بھر کبھی اتنی خاموش اور الگ تھلگ نہیں رہتی تھی' جتنی ان دنوں رہنے لگی تھی۔ پھپھو نے اسے دیکھا تو ان کو تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ وہی پریشے ہے۔ جو پانچ اگست کو ہنزہ گئی تھی۔

اس کی گوری رنگت ٹین ہو چکی تھی اور وزن بیس بائیس پاؤنڈ گھٹ چکا تھا۔ سب کو یہ بات نظر آئی تھی' مگر کسی کو وہ نظر نہیں آیا تھا جو اسے اصل میں ہوا تھا۔

وہ بیماری جو اسے دراصل لاحق ہوئی تھی۔

پریشے جہاں زیب کو عشق ہو گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

6 ستمبر 2005ء

اس روز ندا آپا آئیں تو اسے اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ کسی اور وجہ یا پھر شاید یوم دفاع کی چھٹی کے باعث سیف گھر پر ہی تھا۔ اسے ندا آپا کے ہمراہ آتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وہی مخصوص چمک آگئی۔ جس سے پریشے کو نفرت تھی۔

"کیسی ہو پری؟" وہ اس کا سر سے پیر تک جائزہ لے کر مسکرایا۔

پریشے نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ "سیف! آپ کو نہیں لگتا کہ میں اب بڑی ہو گئی.... ہوں اور آپ کو مجھے پورے نام سے پکارنا چاہیے۔"

اس کی بات پر سیف ہنس پڑا' مگر اس کی پیشانی پر پڑے بل دیکھ کر اسے خاموش ہونا پڑا۔ "پریشیو.... آپا آپ بھی سن لیں' آئندہ پریشے کو پری نہیں کہنا۔" وہ خاموشی سے سیف کو دیکھتی رہی جیسے اسے اس کے مذاق پر ہنسی نہیں آئی۔

"اوہ پری آئی ہے!" پھپھو بھی کمرے سے باہر نکل آئیں۔ "آج تو فریش لگ رہی ہو۔"

"جی پھپھو! بس ڈائٹ تھوڑی ہیلدی رکھی ہوئی ہے۔" وہ بیٹھ گئی ندا آپا اندر سے بری کے جوڑوں والے شاپر اور ڈبے اٹھا لائیں۔

"سیفی بتا رہا تھا تم نے پمز میں جاب شروع کر دی ہے؟"

"جی پھپھو!"

"کب سے جا رہی ہو؟"

"چند دن ہوئے ہیں۔" اسے اب اس تفتیش سے الجھن ہو رہی تھی۔

"خیر سے کتنی تنخواہ دیتے ہیں؟"

اس کو وہاں بیٹھنا مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے سیف کو دیکھا جو' بہت دھیان سے اس سوال کے جواب کا منتظر تھا۔

اس نے آہستگی سے اپنی تنخواہ بتائی۔

"ہاں یہ اچھی ہے۔ ویسے بھی بیٹا اچھی بیوی وہ ہوتی ہے جو شوہر کے شانہ بشانہ کام کرے۔ آخر کو شوہر بھی تو اس کے لیے کماتا ہے۔" یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ شادی کے بعد بھی جاب کرتی رہے گی۔

"اور نہیں تو کیا اچھا پری! یہ دیکھو' یہ جناح سپر سے فرنچ ویلوٹ کا لے کر آئی ہوں' پورے پانچ ہزار کا ہے۔" انہوں نے نیوی بلیو ویلوٹ پر فیروزی ستاروں والا دوپٹہ سامنے پھیلایا۔ وہ غیر دلچسپی اور قدرے بے توجہی سے وہ سارا سامان دیکھتی رہی۔

سیف بھی ساتھ بیٹھا کپڑوں کے بارے میں' دکان داروں کی بے ایمانی کے بارے میں مسلسل تبصرہ کر رہا تھا جیسے عموماً" عورتیں کرتی ہیں۔ اس نے کلاس بدل لی تھی لیکن اس کلاس میں رہنے کا سلیقہ اسے ابھی تک نہیں آیا تھا۔

دفعتاً" اس کے موبائل کی بپ بجی۔ اس نے موبائل نکال کر روشن اسکرین کو دیکھا۔ وہاں ایک غیر شناسا نمبر سے میسج آیا ہوا تھا۔ اس نے میسج کھولا۔ "کیا میں آپ کو اس ٹائم کال کر سکتا ہوں؟ آپ فارغ ہیں؟" میسج رومن اردو میں تھا' تاکہ لکھنے والے کی جنس واضح ہو۔ اس نے کوفت سے اسے ڈیلیٹ کر دیا۔ جب سے موبائل کمپنیوں نے نرخ سستے کیے تھے ایسے میسجز۔ اور غیر شناسا نمبرز سے کالز آتی رہتی تھیں۔ دنیا جہاں کے فارغ اور لوفر لڑکے ایسے کام کر کے لڑکیوں سے دوستی کے خواہش مند ہوتے تھے۔ اس نے "ہو آر یو؟" لکھ کر جواب بھی نہیں دیا اور موبائل رکھ دیا۔

"کس کا میسج تھا؟" سیف نے فوراً" پوچھا۔

"پاپا کا!" اس نے یہ کہنے سے احتراز کیا کہ کسی کے ایس ایم ایس کے متعلق پوچھنا نہایت غیر اخلاقی حرکت ہے۔

"اچھا یہ والا دیکھو۔ یہ بریزے کا ہے۔" انہوں نے بازو پر ایک اور ہلکا سا گرین کپڑا پھیلایا۔ وہ "ہوں اچھا ہے" کہہ کر خاموش ہو گئی۔

اسی اثنا میں روشان اور سنی جانے کہاں سے وارد ہو گئے۔

"ماما دیکھیں! سیفی ماموں ہمارے لیے مونو پلی لائے ہیں۔" روشان مونو پلی کا گتّہ اس کے کارڈز اور گوٹ ماں کو دکھانے لگا۔

"بھلا اتنے چھوٹے بچے یہ گیم کھیلیں گے؟" ندا آپا نے کہا۔ پریشے کو بے اختیار کچھ یاد آیا۔

رات کی تاریکی' جلتے الاؤ سے اڑ کر فضا میں گم ہوتی چنگاریاں' لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز' ماہو ڈھنڈ کے خاموش پانیوں پر چڑھی چاندنی کی تہہ' دور دور تک پھیلا سبزہ زار....

اس نے سر جھٹکا۔ اس کو مزید وہاں بیٹھنا مشکل لگ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرا ڈیوٹی ٹائم ہے۔ ڈاکٹر واسطی بہت خفا ہوں گے مجھے جانا ہو گا۔" بہانہ اسے سوجھ گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

12 ستمبر 2005ء

جیولری شاپ کا گلاس ڈور دھکیل کر وہ اندر داخل ہوئی۔ سیف اس کے عقب میں تھا۔ وہ بہت اعتماد سے چلتی شوکیس کے سامنے سیٹوں کی لمبی قطار میں سے ایک کرسی کھینچ کر' ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے بیٹھا سیلز مین پروفیشنل خوش اخلاقی سے اس کی جانب متوجہ ہوا۔ "جی میڈم۔"

سیلز مین کے پیچھے والی دیوار شیشے سے کورڈ تھی' چمکتی ہوئی شیشے کی دیوار.... چمکتی دیوار.... اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے سر جھٹکا اور آئینے میں ایک نظر خود پر ڈالی۔ لمبے اور سیدھے بالوں کو ہاف باندھ کر اس نے کیچر لگا دیا تھا۔ قیمتی پتھروں سے مزین کیچر جس کا دو رنگا پتھر ڈھیلا تھا کیچر سے چند لٹیں نکل کر گالوں پر ملتے ہوئے چھو رہی تھیں۔ چند دنوں سے بہت کھانے پینے کے باعث اس کا چہرہ آج خاصا ترو تازہ اور گال قدرے بھرے بھرے لگ رہے تھے۔

سیف اس کے ساتھ والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا اس کو دیکھ کر دور بیٹھا ادھیڑ عمر سنار لپک کر اس کی طرف آیا۔

"جی سیٹھ صاحب! کوئی یونیک چیز دکھائیں۔ ہماری ہونے والی دلہن کو شادی کے دن پہننے کے لیے۔"

اس کو سیف کا متعارف کرانے کا انداز زہر لگا تھا۔ مگر وہ خاموش رہی۔

سنار سیٹھ جھٹ سیاہ ویلوٹ کے ڈبوں میں سجے چمکتے دمکتے سونے کے سیٹ شوکیس پر رکھنے لگا۔ دوسرا لڑکا اس کی مدد کر رہا تھا۔

پریشے ایک ایک کر کے ہر سیٹ کو ریجیکٹ کرتی رہی۔ اسے اس سب میں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ وہ تو پاپا اور پھپھو نے کہا کہ وہ سیف کے ساتھ اپنی مرضی کی شاپنگ کر آئے تو وہ چلی آئی۔

سیف نے بہت سے ڈبے کھلوا لیے جیولر کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔ یقیناً" وہ پہلے یہاں آتا رہتا تھا۔ ندا آپا کی شادی کو عرصہ گزر چکا تھا' جب ان کی شادی ہوئی تھی' تب سیف اتنے مہنگے جیولرز کو افورڈ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ یقیناً" وہ پچھلے چند برسوں میں یہاں آتا رہا تھا۔ جانے کتنی عورتوں کو زیورات دلوانے۔ شاید اسی لیے اس نے دکان دار پر واضح کیا تھا کہ وہ لڑکی اس کی ہونے والی بیوی ہے' سو وہ محتاط رہے۔

ایک لمحے کو بھی اس کا دل نہیں چاہا تھا کہ وہ جیولرز سے سیف کے چکروں کے متعلق پوچھے۔ اسے سیف اور اس کے افیئرز میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر پاپا جانتے بوجھتے اپنی آنکھیں بند کر رہے تھے تو وہ بھی اپنی آنکھیں اور دل کب کی بند کر چکی تھی۔

"یہ فیروزی پتھروں والا تو بہت اچھا ہے۔ یہ لے لو۔" اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے بالوں پر لگا کیچر اتارا' سیاہ آبشار کمر اور چہرے کے اطراف میں گرتی چلی گئی۔

"آپ کے پاس اس طرح کا کوئی دوسرا پتھر ہوگا' یا آپ اس پتھر کو جوڑ دیں۔ یہ ڈھیلا ہے اور کسی بھی لمحے اکھڑ جائے گا۔" پریشے نے کیچر شوکیس پر رکھتے ہوئے دور نگے پتھر کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ بالکل گرنے والا ہے۔ اس کیچر کو پھینک دو' میں تمہیں نیا لے دوں گا۔" سیف نے لاپروائی سے کیچر اٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینکنا چاہا۔ کسی چیتے کی تیزی سے پری نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے کیچر چھینا۔

"ہاتھ مت لگاؤ اسے' یہ بہت قیمتی ہے' سمجھے آپ؟" کسی متاعِ عزیز کی طرح اسے مٹھی میں بند کیے پریشے نے سیف کو غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔

وہ اس کے ردِعمل پر ششدر رہ گیا۔ "پریشے! تم..." اس نے آہستہ آواز میں کچھ کہنا چاہا۔

"میں گاڑی میں بیٹھ رہی ہوں آپ کو آنا ہے تو آجائیں' نہیں تو میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔" بالوں کو پورا کیچر میں جکڑ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کھٹ کھٹ چلتی گلاس ڈور دھکیل کر باہر نکل گئی۔ سیف جیولر سے معذرت کرتا کچھ حیران' کچھ دبے دبے غصے کے ساتھ اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

جیولر نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹک کر ساتھ والے لڑکے کو بتایا۔ "بیگم صاحبہ! شادی پر خوش نہیں ہیں چچ چچ..."

لڑکا دانت نکوسنے لگا' جیولر پھر سے اپنی سیٹ سنبھال کر رجسٹر پر جھک گیا۔ جبکہ لڑکا شوکیس پر رکھے زیورات کے مخملیں ڈبے بند کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

13 ستمبر 2005ء

وہ ہسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اوور آل بازو پر لپیٹا' اسٹیتھسکوپ پاکٹ میں گھسایا' جلدی جلدی جوتوں کی اسٹریپس بند کیں' بالوں کو اسی طرح اسی کیچر میں جکڑا اور پرس کندھے پر ڈال کر باہر نکل آئی۔

گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے نشاء کو گیٹ سے اندر آتے دیکھا۔

"تم ہسپتال جا رہی ہو؟" وہ اس کی تیاری اور عجلت بھرے انداز کو دور سے ہی پہچان گئی تھی۔

"ہاں کہو کوئی کام ہے؟" وہ گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے کھڑی ہونے لگی۔

"میڈم آپ کے جہیز کی شاپنگ کرنی ہے۔ آپ کو ممی بلا رہی ہیں۔"

"او ہو نشاء! امی کی چوائس بہت اچھی ہے' وہ خود کر لیں گی۔ تم ان کی ہیلپ کروا دینا' تمہیں میری پسند ناپسند کا علم تو ہے۔"

"مگر ابھی ہم جوتے لینے جا رہے ہیں' جو تمہیں ہی لینے ہوں گے۔"

"یار! ادھر اسلام آباد پنڈی سے کہاں اچھے جوتے ملتے ہیں؟ اور میرے پاس بہت جوتے ہیں۔ چھوڑو رہنے دو مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے فکرمندی سے گھڑی دیکھی۔

"بے وقوف! لینے تو پڑیں گے آخر کو شادی ہے تمہاری۔"

اس کے چہرے سے سایہ سا گزر گیا۔ دروازے کے ہینڈل پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"پری!" وہ اس کے قریب چلی آئی۔ "اگر فیصلہ کر لیا تھا تو کمپرومائز کرنا بھی سیکھو۔ سیف بھائی جیسے بھی ہیں انہیں قبول کرو اور دل سے کرو۔"

"دل؟" ایک پھیکی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ "دل تو کہیں دور قراقرم کے پہاڑوں میں رہ گیا ہے۔ اب تو یاد بھی نہیں کہ کس جگہ کھویا تھا اسے۔ ماہو اسنڈ کی جھیل میں یا رومانی کی دھند میں۔"

"کوئی فون' کوئی خط' کوئی رابطہ نہیں کیا اس نے؟" وہ جانتی تھی نشاء کس کی بات کر رہی تھی۔

"نہیں اس کو فون نمبر دیا کب تھا۔"

"ای میل؟"

"احمت دوران کی وائف کی آئی تھی' میں نے جواب نہیں دیا۔ مجھے ترکی کے باسیوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا۔" وہ سر جھٹک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ کھلے شیشے کے اس پار نشاء کھڑکی پر جھکی۔ پریشے نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"خوش رہا کرو پری! ورنہ لوگ سب جان جائیں گے۔"

"جانے دو۔" اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔

گاڑی کے انجن میں حرکت ہوئی۔ نشاء کھڑکی سے ہٹ گئی۔ وہ پیچھے دیکھتے ہوئے گاڑی باہر نکالنے لگی۔

ہاتھ کی لکیروں میں کیا تلاش کرتے ہو؟
ان فضول باتوں میں کس لیے الجھتے ہو
جس کو ملنا ہوتا ہے۔
بن لکیر دیکھے ہی
زندگی کے رستوں پر
ساتھ ساتھ چلتا ہے
پھر کہاں بچھڑتا ہے؟
جو نہیں مقدر میں
کب ہمیں وہ ملتا ہے؟
کب وہ ساتھ چلتا ہے؟
ہاتھ کی لکیروں میں
کیا تلاش کرتے ہو؟

☼ ☼ ☼

اور یہ اسی شام کی بات ہے جب اسے ہسپتال میں فون کر کے نہایت بدحواسی کے عالم میں وحید نے بتایا کہ جہاں زیب صاحب کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ وہ آفس سے جلدی آ گئے تھے اور ابھی گاڑی سے نکلے ہی تھے کہ ان کی حالت بگڑ گئی۔

وہ اپنے سب کام چھوڑ کر بھاگم بھاگ گھر پہنچی' مگر جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئی' ممانی اور نشاء پہلے سے ہی وہاں موجود تھیں اور پاپا... وہ کافی دیر ہوئی جا چکے تھے۔ انہوں نے اس کے پہنچنے کا' اس سے آخری بار ملنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

اسے نہیں معلوم وہ کتنے دن بغیر کچھ کھائے پیے روتی رہی تھی۔ اس کے غم بہت تھے' وہ کس کس کا ماتم کرتی؟ اپنی زندگی کی پہلی اور آخری محبت کو اس نے جس شخص کے لیے چھوڑا تھا' وہ اسے چھوڑ کر' بھری دنیا میں تنہا کر کے جا چکا تھا۔ وقت ایک دفعہ پھر چھ برس پیچھے چلا گیا تھا۔ تب بھی یوں ہی لوگوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیا تھا' کھوکھلے دلاسے اور جھوٹی تسلیاں۔ آج بھی اسے یہی مل رہی تھیں۔

اس نے بہت لوگوں کو پاپا کی میت کے سرہانے بین کرتے دیکھا تھا' ان میں ندا آپا بھی تھیں اور پھپھو بھی۔ وہ بے تاثر' بھیگی نگاہوں سے سب کو دیکھتی رہی۔ وہ ان سب کو اندر باہر سے جانتی تھی۔ ان کے آنسوؤں کی حقیقت کو سمجھتی تھی' اور یہ بھی جانتی تھی کہ اگر کسی کو اس بھری دنیا میں پاپا کی خوشی اور دکھوں کا خیال تھا تو وہ صرف وہ خود تھی۔ اس کی زندگی میں دو ہی تو مرد تھے' ایک پاپا اور ایک افق ارسلان۔ ایک پہلے چھوڑ گیا تھا اور دوسرے نے اب چھوڑ دیا تھا۔ وہ پھر سے اکیلی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
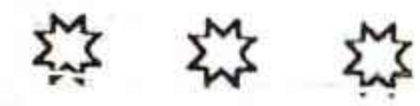
وقت کا کام ہے گزرنا' اور وہ تو گزر ہی جاتا ہے۔

رو کر نہیں تو ہنس کر.....
ہنس کر نہیں تو رو کر...
بھلا وقت کب ایک سا رہتا ہے؟

سو پریشے جہاں زیب کی زندگی میں بھی وقت گزر رہا تھا۔ چند دن اس نے بہت ماتم کیے تھے' اسے لگتا تھا۔ اب زندگی ختم ہو چکی' مگر پھر گزرتے دنوں کے ساتھ اس نے خود کو سنبھال ہی لیا تھا۔ ہاں اب وہ پھر سے کمزور ہوتی جا رہی تھی' ہنسنا بولنا اس نے ترک کر کے خود کو زندگی بہتے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

اب اس اتنے بڑے' ویران بنگلے میں وہ رہ کر کیا کرتی؟ سو شادی تک' جو جہاں زیب صاحب کی ڈیتھ کے باعث فی الحال ملتوی ہو چکی تھی' اس نے ماموں کی طرف رہنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی ماموں اب اسے اکیلے نہیں رہنے دے رہے تھے' وہ اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے۔

چند دن تو خاموشی سے کمرے میں بند رہ کر اس نے بتا دیے' پھر اس روز نشاء اس کے پاس آئی اور سمجھانے لگی۔

"زندگی میں غم آتے رہتے ہیں' یہ غم اتنا بڑا ہے کہ میں تمہیں صبر کرنے کو تو نہیں کہوں گی' مگر تمہیں خود کو سنبھالنا ہو گا۔"

"میں کوشش کر رہی ہوں۔"

"میری بات مانو تو ہسپتال پھر سے جوائن کر لو۔"

"ہاں' یہی سوچ رہی تھی۔ مصروف رہوں گی تو شاید صبر آ ہی جائے۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"پری! اب تم زندگی کو نئے سرے سے شروع کرو۔" نشاء بہت آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

"جو کچھ جیسے ہو رہا ہے' اسے ویسے ہی ہونے دو نشاء! مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں۔ پاپا نے میرے لیے اچھا ہی سوچا ہو گا۔ اس لیے مجھے مزید کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔ مجھے سیف قبول ہے۔" اس کے کہنے سے قبل ہی اس کا مطلب سمجھ کر پریشے نے کہا۔

نشاء احتجاجاً کچھ کہنے لگی تھی' مگر پھر مصلحتاً اس قصے کو کچھ عرصے تک پس پشت ڈالنے کا سوچ کر رک گئی۔ پریشے خود بھی ابھی اس معاملے پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

پھر اس نے ہسپتال جانا شروع کر دیا۔ حالات اب دوبارہ معمول پر آنے لگے تھے۔ اسے لاشعوری طور پر انتظار تھا کہ نشاء پھر اس سے اس بارے میں کوئی بات کرے گی' مگر اس روز کے بعد نشاء نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

ماموں' ممانی اور نشاء کی محبتوں کے قرض اٹھائے' اس نے خود کو زندگی کے جھمیلوں میں گم کر لیا۔

شاید اسے صبر آ گیا تھا۔
یا شاید اس نے سمجھوتا کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

30 ستمبر 2005ء

وہ ہسپتال میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ سامنے والی کرسی پر ایک معمر عورت اور ساتھ ایک نوعمر لڑکی نشست سنبھالے' منتظر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے' دونوں کہنیاں ٹیبل پر رکھے تیزی سے پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے نسخہ لکھ رہی تھی۔ کیچر سے نکلی چند لٹیں اس کے ماتھے سے لٹک کر کاغذ کو چھو رہی تھیں۔

نسخہ لکھ کر وہ سیدھی ہوئی۔ کاغذ پیڈ سے پھاڑا اور پھر تہہ کیے معمر خاتون کی جانب بڑھایا۔

"بچی کی خوراک کا خیال رکھو۔ یہ تو ویسے بھی بہت کم عمر ہے۔ اب گھر جا کر اس سے کام وغیرہ نہ کرواتی رہنا۔"

بوڑھی عورت نسخہ تھام کر شکریہ ادا کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ سہمی ہوئی لڑکی نے اس کی تقلید کی۔ اس نے سیاہ چادر کا کونہ چہرے کے گرد کر کے انگلیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کی انگلیوں پر مہندی کے مدھم بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ کلائی میں سستا سا زیور بھی تھا۔

پریشے... نے اپنی سونی کلائیوں اور مرمریں ہاتھوں کو دیکھا۔ چند ماہ گزر جائیں' پھر ان پر بھی مہندی لگی ہو گی۔ ان کلائیوں میں بھی کسی کے نام کا.....

وہ سر جھٹک کر سامنے رکھی فائل کی جانب متوجہ ہو گئی۔ دفعتاً اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے فائل کا صفحہ پلٹتے ہوئے فون کان سے لگا کر مصروف سے انداز میں ہیلو کہا۔

"ڈاکٹر پریشے جہاں زیب بات کر رہی ہیں' جی؟"

آواز مردانہ اور غیر شناسا تھی۔ اس نے موبائل کان سے ہٹا کر نمبر دیکھا۔ پنڈی اسلام آباد کے کوڈ کا سرکاری نمبر تھا۔

"جی بات کر رہی ہوں' آپ کون؟"

"ڈاکٹر صاحبہ! میں رائزنگ پاکستان سے بول رہا ہوں۔ ہم آپ کو اپنے شو میں انوائٹ کرنا چاہ رہے تھے۔" دوسری جانب کوئی پروڈیوسر صاحب تھے۔

"اچھا؟ مگر کس سلسلے میں؟"

"آپ کو ابھی چند ہفتے قبل راکاپوشی سے آرمی نے ریسکیو....."

"سوری۔ مجھے کوئی انٹرویو نہیں دینا۔" وہ رکھائی سے کہہ کر فون بند کر کے دوبارہ فائل پر جھک گئی۔

چند لمحوں بعد دوبارہ گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر چمکتا نمبر دیکھا۔ وہی نو سے شروع ہونے والا سرکاری نمبر تھا۔

"جی؟"

"ڈاکٹر صاحبہ! ہم آپ کو انٹرویو کے لیے بہت اچھا..."

"رانگ نمبر' میں وہ پریشے جہاں زیب نہیں ہوں۔ بائے۔" اس نے درشتی سے بات کاٹ کر فون رکھ دیا۔ فوراً ہی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ اس نے دیکھا بھی نہیں کہ اس بار اسکرین پر جگمگاتا نمبر کوئی سیلولر نمبر ہے اور تیزی سے فون کان سے لگایا۔

"جی فرمایئے؟" لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔

"السلام علیکم' ڈاکٹر پریشے جہاں زیب؟" لہجہ بھاری اور رعب دار تھا۔

"جی اب آپ کو کیا پرابلم ہے؟" اس کو اتنا شدید غصہ چڑھا تھا کہ اس نے مختلف آواز اور لب و لہجہ بھی نوٹ نہیں کیا۔

"میم! آپ کو یاد ہو گا' آپ کو راکاپوشی سے پاک آرمی نے....."

"گناہ کر دیا تھا پاک آرمی نے مجھے ریسکیو کر کے۔ میں معافی چاہتی ہوں کہ میں بچ کر زمین پر واپس آ گئی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں اگلی دفعہ زندہ بچ کر آنے والی غلطی نہیں کروں گی۔ اب مجھے کال مت کیجیے گا۔" کھری کھری سنا کر اس نے کال منقطع کی اور پھر موبائل آف کر کے رکھ دیا۔

"اتنے دن ہو گئے' پھر بھی لوگ بھولے نہیں ابھی

تک .....“ بڑبڑاتے ہوئے اس کی نگاہ میز پر رکھے کیلنڈر پر پڑی جو اسے سعید بک بینک سے کتابوں کی خریداری پر مفت ملا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی رات کے آٹھ بجنے کو تھے وہ اٹھنے ہی لگی تھی‘ سو کیلنڈر کا صفحہ پلٹ کر وقت کو چار گھنٹے پہلے اکتوبر میں لا کھڑا کیا۔

اکتوبر کے صفحے پر تاریخوں سے اس طرف دیار کے درختوں کے جھنڈ کے اس پار راکاپوشی کھڑا تھا۔ اس کی چوٹی دھند میں لپٹی تھی۔

جو چیزیں وہ بھول جانا چاہتی تھی‘ جانے کیوں بار بار اس کے راستے کو کسی ڈراؤنی کالی بلی کی طرح کاٹ جاتی تھیں۔

اس نے کیلنڈر اٹھا کر میز کی دراز میں ڈال دیا‘ در کرسی پیچھے کر کے کھڑی ہو گئی۔ اس کا موبائل ابھی تک آف تھا۔

☼ ☼ ☼

8 اکتوبر 2005ء

سفید دودھ سی اجلی برف کے درمیان سیدھی لکیر کی طرح کریک پڑ رہا تھا۔ کریک کی نیچے کی سا..ی برف سلائیڈ ہو کر نشیب میں گرنے لگی۔ ہر سو برفیلی سفید دھول تھی۔ افق اس دھول میں چھپ گیا۔ وہ حلق کے بل چلا کر افق کو پکار رہی تھی۔ وہ کہیں نہیں تھا ارد گرد کے پہاڑ اس پر قہقہے لگا رہے تھے۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں اپنے چہرے کو چھوا وہاں برف نہیں لگی تھی۔ وہ راکاپوشی پر نہیں تھے۔ وہ اپنے نرم گرم بستر میں‘ اپنے خوب صورت اور آرام دہ بیڈ روم میں تھی۔

اس نے دوپٹہ اٹھا کر چہرہ خشک کیا۔ خود کو نارمل کرنے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔

وہ خواب‘ وہ خوف زدہ کر دینے والے خواب اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔

اس نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ پونے نو ہونے والے تھے۔

”گاڈ‘ مجھے تو آٹھ بجے تک ہسپتال پہنچنا تھا۔“ وہ تیزی سے پاؤں میں سلیپر ڈالے باتھ روم کی جانب بھاگی۔ منہ پر چند چھینٹے مارے‘ بالوں کو سنوارے بغیر کیچر میں کسا‘ الٹے سیدھے جوتے پہن کر وہ پانچ منٹ میں باہر آ گئی۔ ممانی اور نشاء سامنے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ماموں تو شاید آفس جا چکے تھے۔

ڈائننگ ہال میں ناشتہ نہیں لگا تھا۔ اس نے جلدی سے فریج کا دروازہ کھول کر نیسلے اورنج کا بڑا سا پیکٹ نکالا اور اسے منہ سے لگانے ہی لگی تھی کہ یاد آیا آج تو روزہ تھا۔

اسے خود پر ہنسی بھی آئی اور شرمندگی بھی محسوس ہوئی‘ جوس کا پیکٹ ہاتھ میں پکڑے‘ اس نے دوسرا ہاتھ فریج کھولنے کو بڑھایا اور دوسرے ہی پل زمین زور سے ہلی۔

جوس کا پیکٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ بے اختیار لڑکھڑاتے ہوئے اس نے قریبی میز کا کنارہ تھاما اور اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ زمین نے زوردار جھٹکے اور دیے‘ اور پھر سکوت چھا گیا۔

”مجھے خواب اور چکر بہت آنے لگے ہیں۔“ خود کو کوستے ہوئے اس نے پیکٹ اٹھا کر فریج میں رکھا اور ملازم کو فرش صاف کرنے کا حکم صادر کر کے پرس کندھے پر ڈالے باہر نکل آئی۔

اس کا ذہن تیزی سے کام کرتے ہوئے ڈاکٹر واسطی سے دیر سے آنے پر کیے جانے والا بہانہ سوچ رہا تھا۔

ہسپتال میں ماحول معمول کا تھا۔ سامنے ریسیپشن تھا‘ دونوں اطراف میں چمکتی دمکتی راہداریاں مگر ان راہداریوں میں ادھر ادھر بھاگتے لوگوں میں ہلکا سا ”غیر معمولی پن“ تھا۔ تھوڑی سی ہلچل‘ تھوڑی سی افراتفری۔

وہ تیزی سے سامنے سے آتے ڈاکٹر واسطی کی جانب بڑھی۔

”وہ سر! میں آنے ہی والی تھی کہ میری کار.....“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے‘ آپ ایمرجنسی میں جائیں۔“ وہ عجلت میں کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

”ایں؟ آج سر نے ڈانٹا نہیں؟“ وہ حیران ہوتی پلٹی تو سامنے ریسیپشن ڈیسک سے اوپر دیوار پر لگے ٹی وی کی اسکرین پر نظر پڑی۔

وہ جیو کی نیوز فلیش تھی جس سے اسے علم ہوا کہ چند منٹ قبل اس کا سر نہیں چکرایا تھا۔

وہ زلزلہ تھا۔

☼ ☼ ☼

عجیب حشر برپا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنے گھنٹوں سے مسلسل مریضوں میں گھری تھی۔ اس کی ایک ٹانگ ایمرجنسی میں تھی تو دوسری جنرل وارڈ میں۔ زخمیوں کو لانے کا سلسلہ کئی گھنٹوں سے جاری تھا‘ بلکہ اب تو کشمیر سے بھی زخمی لائے جا رہے تھے۔ راولپنڈی‘ اسلام آباد کے تمام ہسپتال بھرے ہوئے تھے۔ ہر چند منٹ بعد اسٹریچر پر زخمی لائے جا رہے تھے۔ کوئی خون میں لت پت تھا تو کوئی جسمانی اعضا سے محروم تو کسی کا چہرہ مسخ ہو کر سیاہ ہو چکا تھا‘ عجب منظر تھا۔

زلزلہ صرف مارگلہ ٹاورز تک محدود نہیں رہا تھا‘ بلکہ کشمیر کے چناروں تک یہ قیامت خیز ہلاکت پھیلتی چلی گئی تھی۔ مانسہرہ‘ ایبٹ آباد‘ باغ‘ وادی نیلم‘ وادی جہلم‘ گڑھی دوپٹہ‘ گڑھی حدیگل‘ بانا ڈسٹرکٹ‘ کالا ڈھاکہ اور ایسے نام والے بہت سے شہر اور گاؤں جو آدھے پاکستان نے زندگی بھر نہیں سنے تھے۔ سیاست دان اور وزیر تو مارگلہ ٹاورز کے ملبے پر کھڑے ہو کر تقریر کر کے اور فوٹو بنوا کر جا چکے تھے‘ مگر ہسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ تھی۔ جانے کتنی دیر بعد وہ ذرا جو کمر سیدھی کرنے کو ہسپتال کی لابی میں ایک طرف رکھے صوفے پر جا کر بیٹھی تو قریب بیٹھے کسی ڈاکٹر کا فقرہ کانوں سے ٹکرایا۔

”یہ سب ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔“

اس کا ایک دم پارہ ہائی ہو گیا۔ ”گناہوں کی سزا ہے تو پھر اللہ سے معافی مانگیں اور اپنی اصلاح کریں‘ بجائے ادھر بیٹھ کر دوسروں کو نصیحت کرنے کے تبدیلی ہمیشہ میں سے شروع ہوتی ہے آپ سے نہیں۔“ غصے سے کہہ کر وہ اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی راہداری کا موڑ مڑتے ہوئے بے اختیار کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

”سوری میں.....“ اسی بگڑے موڈ میں سوری کرتے کرتے وہ رک کر اس نوعمر لڑکے کو دیکھنے لگی جس سے وہ ٹکرانے والی تھی۔ بہت جانی پہچانی شکل تھی۔

”ارے ڈاکٹر پریشے؟ کیسی ہیں آپ؟“ اس نے آستینیں کہنی تک چڑھا رکھی تھیں اور غالباً“ زخمیوں کو مارگلہ ٹاورز سے لانے میں رضاکارانہ طور پر مدد رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں تم وہی ہو نا جس کے ابا.....“

”جی‘ جس کے ابا کے بارے میں آپ نے پیش گوئی کی تھی کہ انہیں ترقی ملے گی‘ جبکہ وہ پچھلے ہفتے ریٹائر ہو گئے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”تو مجھے تو حسیب نے کہا تھا۔ وہی بڑا امپریس تھا جنرل صاحب سے! میں تو نہیں تھی۔“

”ظاہر ہے‘ ان جیسا ہینڈسم کور کمانڈر پنڈی کو کبھی نہیں ملا۔“

”اچھا ہٹو راستے سے۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر اس کے ایک طرف سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا‘ اس وقت تک جب تک وہ راہداری کے آخری سرے سے آگے غائب نہ ہو گئی اور پھر سر جھٹک کر خود بھی مخالف سمت کو ہو لیا۔

☼ ☼ ☼

12 اکتوبر 2005ء

”کچھ پتہ چلا تمہارے کزن کا‘ فرح؟“ ہسپتال

جانے کے لیے تیار ہوتے ہوئے اس نے فون کان سے لگائے پوچھا۔ فرح اس کی کولیگ ڈاکٹر تھی اور 8 اکتوبر کے زلزلے کے بعد اکٹھے کام کرنے کے باعث دونوں میں اچھی خاصی دوستی بھی ہو گئی تھی۔

"نہیں یار! ان کا اپارٹمنٹ دوسرے فلور پر تھا اور مارگلہ ٹاورز کے دوسرے فلور پر تو آٹھ اور فلورز گر پڑے ہیں۔ اچھا میں نے تمہیں فون اس لیے کیا تھا کہ مظفر آباد میں پیرا میڈیکل اسٹاف کی ضرورت ہے' میں نے وولینٹئر کر دیا ہے۔ تم چلو گی؟؟"

"نہیں میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ ویسے تم جاؤ گی کیسے؟؟"

"آرمی ہیلی کاپٹر اور کیسے؟ روڈز تو ابھی تک بلاک ہیں۔ لینڈ سلائیڈنگ بھی خاصی ہوئی ہے۔ چلو پھر بات ہو گی۔"

پریشے نے الوداعی کلمات کہہ کر فون رکھ دیا اور جلدی جلدی تیار ہو کر باہر نکلی۔ رات تین بجے آکر سوئی تھی' سو آج دیر سے آنکھ کھلی تھی۔

"السلام علیکم پھپھو! ماموں! آپ ابھی تک آفس نہیں گئے؟" پھپھو بھی ماموں کے ہمراہ لاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں' وہ بیک وقت دونوں کو مخاطب کر کے بولی۔

"بس نکلنے لگا ہوں۔ تم نے سحری نہیں کی؟؟"

"بس اٹھ نہیں سکی مگر نیت کر لی تھی۔" وہ اپنی ازلی لاپروائی سے بولی۔ ماموں واقعی جانے ہی والے تھے سو اٹھ کر چلے گئے۔ وہ مروتاً کچھ دیر کے لیے پھپھو کے پاس بیٹھ گئی۔

"شادی تو ظاہر ہے اب بھائی کی وجہ سے لیٹ ہی کریں گے مگر تیاری تو بہرحال کرنی ہے۔ پری! ابھی میں پٹیالہ والوں سے دونوں سیٹ اٹھانے جا رہی ہوں' تم بھی چلو۔ پھر آگے مہندی کا جوڑا بھی پسند کرنا ہے' وہ تم خود ہی کرنا۔ اب مجھے کیا پتا آج کل کی لڑکیوں کی پسند کا۔"

وہ حیرت سے منہ کھولے انہیں دیکھنے لگی۔

"میں تمہیں لینے ہی آئی تھی۔" انہوں نے وضاحت کی۔

"خدا کے لیے پھپھو! ملک پر اس وقت آفت ٹوٹی ہوئی ہے' لوگ مر رہے ہیں اور آپ لوگوں کو مہندی کے جوڑے کی پڑی ہے؟" اسے سخت صدمہ پہنچا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے' مگر زلزلہ ہم تو نہیں لائے۔ یہ دکھ سکھ تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ اب ان کے لیے ہم خود پر خوشیاں بھی حرام کر لیں؟" پھپھو کو اس کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

"دکھ سکھ چلتے نہیں رہتے۔ دکھ تو آتے ہیں اور ٹھہر جاتے ہیں۔ جانے کتنے بچے بوڑھے اور خاندان اس زلزلے میں جان ہار گئے۔ فرض کریں' ہم تب بھی خوشیاں مناتے اگر ان مرنے والوں میں' میں یا سیف ہوتے؟؟"

"خدا نہ کرے' سیف کیوں ہوتا؟" وہ دہل کر بولیں۔

وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ انہوں نے صرف سیف کا نام لیا تھا۔ انہیں صرف سیف پیارا تھا۔ یہ نہیں کہا کہ "خدا نہ کرے تم اور سیف کیوں ہوتے؟" وہ کسی گنتی میں بھی نہ تھی۔

"کم از کم پاپا کا کفن تو میلا ہونے دیا ہوتا پھپھو!" وہ تیزی سے کہہ کر باہر نکل آئی اور پھر کتنی ہی دیر گاڑی کے دروازے کے ساتھ کھڑی خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ شاید اس دنیا میں کسی کے لیے بھی اہم نہیں تھی' سوائے اس شخص کے' جو اسے قراقرم کی پری کہا کرتا تھا' جس نے محبت بھی کی تھی اور اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

ہاسپٹل کے سارے راستے وہ بے آواز روتی آئی تھی۔ پھر ہاسپٹل پہنچ کر اس نے فوراً" ڈاکٹر فرح کو ڈھونڈا۔

"فرح! تم مظفر آباد جا رہی ہو نا؟ تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو۔" اس نے فرح کو ملتے ہی اپنا یکدم کہا جانے والا فیصلہ سنا دیا' جو وہ تمام راستہ سوچتی آئی تھی۔

"ٹھیک' پھر ابھی چلو۔" فرح نے مصروف سے انداز میں کہا اور آگے کو بڑھ گئی۔

اور وہ... وہ آج پھر... ایک دفعہ پھر ان پہاڑوں میں واپس جا رہی تھی جن کی شکل نہ دیکھنے کی قسم اس نے کھائی تھی۔ تین ماہ قبل بھی وہ پھپھو اور ندا آپا کے لگائے زخموں سے نجات کے لیے پہاڑوں میں گئی تھی۔ آج پھر اس نے فرار حاصل کرنے کا وہی راستہ سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

14 اکتوبر 2005ء' مظفر آباد

وہی بارشوں کا موسم
وہی سردیوں کی شامیں
وہی دلربا گھٹائیں
وہی سانس لیتی خوشبو
وہی موڑ مڑتی سڑکیں
وہی پرسکوں جگہ ہے
ہے فرق بس ذرا سا
جو گزشتہ موسموں میں
میرا ہمنوا اپنا تھا
جانے وہ اب کہاں ہے؟
جانے وہ اب کہاں ہے؟

وہ ایک اسکول کی منہدم عمارت کے ملبے کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی پشت پر سبزہ زار تھا' جس کے آخری کنارے پر کھڑے ہیلی کاپٹر کے پروں کی بھاری گڑگڑاہٹ اس احاطے میں موجود بیسیوں لوگوں کو کانوں پر ہاتھ رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔

چھت کے ٹوٹے ٹکڑوں اور وزنی لوہے کی سلوں تلے جانے کتنے بچے ابھی تک زندہ دفن تھے۔ مقامی افراد' ریسکیو ٹیمیں' رضا کار' اور فوجی جوان مسلسل ملبہ ہٹا کر بچوں کو نکالنے میں لگے ہوئے تھے۔

وہ ملبے سے چند قدم دور سینے پر ہاتھ باندھے خاموشی سے کھڑی ان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کیچر سے نکلتے بال تیز ہوا سے اڑ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔

کسی بچے کے زخمی وجود کو نکال کر اسٹریچر پر ڈالے دو فوجی جوان کیمپ لے جا رہے تھے۔

وہ گردن موڑ کر اسٹریچر پر موجود معصوم بچے کو دیکھتی رہی۔

ہیلی کاپٹر کی جانب سے کیموفلاج یونیفارم میں ملبوس ایک آرمی آفیسر تیزی سے دو جوانوں کو کوئی ہدایت دے رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا کہ دس سے بیس کلو والے پیکٹ بنانے ہیں ایزی ڈراپ کے لیے مگر انہوں نے....." بولتے بولتے وہ یک لخت رک کر پریشے کو دیکھنے لگا۔

پریشے نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈال کر چہرہ واپس منہدم عمارت کی جانب موڑ لیا۔ اسے کیپٹن بشیر کا انتظار تھا جس کے ساتھ اس نے ابھی باغ کے میڈیکل کیمپ جانا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اسمارٹ سا آفیسر ابھی تک اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اب پری کی جانب اشارہ کر کے کیپٹن بشیر سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ کیپٹن بشیر چند لمحوں بعد کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ آفیسر پھر سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ پریشے کے لیے قطعاً" اجنبی تھا۔ وہ اگر کسی آرمی والے کو جانتی بھی تھی تو وہ' وہ تھے جنہوں نے اسے راکاپوشی سے ریسکیو کیا تھا اور وہ آفیسران میں سے نہیں تھا۔

پھر جب کیپٹن بشیر آیا تو وہ اس کے ہمراہ وہاں سے جانے لگی۔

کیپٹن بشیر سے اس کا تعارف وہیں مظفر آباد میں ہوا تھا۔ وہ بہت سادہ' مؤدب اور اونچا لمبا سا تھا۔ اس کا باپ فوج میں صوبے دار رہا تھا۔ وہ اپنے گاؤں کا تیسرا لڑکا تھا جو فوج میں گیا تھا اور اسے اس پر بے حد فخر تھا۔

پریشے وہاں آرمی کے فیلڈ ہسپتال میں ہی رہ رہی تھی۔ بشیر اس دوران اس کی ہر ممکن مدد کرتا رہتا تھا۔

مذاق سے اسے ایک دن پریشے نے اپنا "لیزان آفیسر" کہا تو ڈاکٹر فرح حیرت سے بولی۔
"کیا مطلب؟"
"کچھ نہیں یہ ماؤنٹین کلائمبرز اور پاکستان آرمی کا آپس کا جوک ہے۔" وہ ہنس کر بولی تھی اور پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔ اس سے زیادہ وہ کسی سے فری نہیں ہوتی تھی۔
"سنو کیپٹن بشیر! یہ آدمی میرے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟" اس کے ہمراہ چلتے ہوئے پریشے نے پوچھ لیا۔
"وہ آپ کا نام وغیرہ پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا۔"
"اچھا۔" (جانے کون تھا) اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔
"ویسے میڈم! میں نہیں جانتا یہ کون تھے۔ ایوی ایشن کے تھے شاید اور......"
"اچھا ٹھیک ہے' اٹس او کے۔" لمبی وضاحت سے بچنے کو وہ بولی تو کیپٹن بشیر فوراً" خاموش ہو گیا۔ یہ سویلین ڈاکٹر بہت موڈی تھی' یہ وہ اندازہ کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

21 اکتوبر 2005ء

"کتنا خراب ہو رہا ہے زخم' اوہ گاڈ!" وہ بڑبڑاتے ہوئے بچی کی پٹی کھولنے لگی۔ اس بچی کا گھر مسمار ہو گیا تھا۔ وہ 8 اکتوبر کی رات ہی نکال لی گئی تھی مگر ابتدائی طبی امداد کے طور پر اس کا زخم چائے کی پتی سے بند کیا گیا تھا' جو اب اسے خراب کر رہی تھی۔
ادھر باغ میں بھی تمام لوگوں کے زخم یونہی بند کیے گئے تھے جو بے حد نقصان دے رہے ہیں' مگر خیر وہ اور کرتے بھی کیا۔ وہ اب زخم کو صاف کرتے ہوئے افسوس کر رہی تھی۔
وہ کل ہی باغ سے واپس آئی تھی۔ وہاں روز تقریباً" ڈیڑھ سو مریض دیکھتی تھی جو چھ' چھ گھنٹے سفر کر کے کیمپ تک پہنچتے تھے۔ جانے کتنے دنوں سے اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔
وہ اس وقت مظفر آباد کے نیلم اسٹیڈیم میں نصب فیلڈ ہسپتال کے ایک خیمے میں تھی۔ اس کی میز کے سامنے اور اس کے دائیں طرف چند اور مریض بھی بیٹھے تھے۔
دفعتاً" کیپٹن بشیر خیمے کا کپڑا ہٹا کر اندر آیا۔
"میڈم! ویکسین آ گئی ہے۔" اس نے پیکٹ اس کی میز پر رکھا۔ پریشے نے سر اٹھا کر کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔
"اتنی جلدی؟ ابھی تو کہا تھا۔"
"یہ دراصل یونسیف کے جو ڈاکٹرز تھے' وہ لائے ہیں۔ ساتھ میں ہائی انرجی بسکٹ بھی ہیں۔"
"اچھا اور اس اسکول کا پورا ملبہ ہٹا؟"
"تقریباً" برٹش ٹیم آئی ہوئی ہے۔"
"ہوں۔" وہ سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گئی۔ برٹش' یونسیف' جانے کتنے غیر ملکی ادھر آئے ہوئے تھے۔
ایک دم اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "کیپٹن بشیر!" وہ جانے لگا تھا' اس کی آواز پر جاتے جاتے پلٹا۔
"جی میڈم؟"
"یہاں بہت سے غیر ملکی آئے ہوئے ہیں۔ ترکی سے کوئی نہیں آیا؟" اس نے بظاہر سرسری سا استفسار کیا۔
"آیا تھا۔"
کائنات ایک پل کو ساکن ہو گئی۔
"کون؟" وہ سانس روکے اس کے جواب کی منتظر تھی۔
"رجب طیب اردگان آیا تھا شوکت عزیز کے ساتھ کل پورے علاقے کا دورہ کیا۔"
اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ "اچھا۔" وہ پھر سے بچی کے زخم پر جھک گئی۔
کیپٹن بشیر نے باہر جانے کے لیے خیمے کا پردہ اٹھایا' تب پریشے نے پھر اسے پکارا "سنو کیپٹن!" وہ کپڑا ہاتھ میں لیے' رک کر اس کی بات سننے لگا۔
"ترکی سے کوئی آئے تو مجھے بتانا۔" جانے کس امید پر اس نے کہہ ڈالا۔
"کسی نے آنا ہے کیا؟"
"نہیں' آنا تو نہیں ہے۔ آنا تو کسی نے نہیں ہے۔" وہ اداسی سے سر جھٹک کر بچی کی پٹی کرنے لگی۔
وہ نہ سمجھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ خیمے کا کپڑا اس کے پیچھے ہلتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

22 اکتوبر 2005ء

فیلڈ ہسپتال سے کچھ دور وہ ایک پتھر پر خاموشی سے بیٹھی خنک ہوا کی سرسراہٹ سن رہی تھی۔ اس نے سفید اوور آل پہن رکھا تھا' بال کیچو میں مقید تھے' پاؤں میں سفید اور ہلکے گلابی جوگرز تھے جن کے رنگ اب پھیکے پڑ گئے تھے۔ اس کی زندگی کی طرح۔
یہ بارش سے کچھ دیر پہلے کا موسم تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح اس موسم میں اداس ہو گئی تھی۔ آج سارا دن وقفے وقفے سے آفٹر شاکس آتے رہے تھے۔ سامنے موجود پہاڑ تو ایک جھٹکے کے دوران حقیقتاً" دو ٹکڑوں میں ٹوٹنے کو تھا۔ آج اس کی چوٹی پر برف بھی پڑی تھی۔

وہ اس ڈھلتی شام میں وہاں تنہا بیٹھی گنگنا رہی تھی۔

"ہم لیلیٰ ہیں' ہم مجنوں ہیں۔"
یہ گیت افق بیس کیمپ میں ہنزو کٹر پورٹرز کو سناتا تھا اور اوپر جب وہ برفانی غار میں "قید" تھے تب بھی تھک کر وہ یہی گنگناتا تھا۔
وہ اتنا بھولا ہی کب تھا۔ وہ تو ہر لمحہ' ہر پل اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ کہیں برف دیکھتی' تو اسے آئس کیو میں چت لیٹا افق یاد آ جاتا' وہ بارش دیکھتی تو اسے وائٹ پیلس کی سیڑھیوں پر کھڑا' موروں کو یہی لیلیٰ مجنوں والا ترک گیت سناتا افق یاد آ جاتا۔ وہ خواب میں آ کر اسے کہتا۔
"پری! کیوں پریشان ہوتی ہو؟ مجھے درد نہیں ہو رہا۔" اور وہ جانتی تھی اسے درد ہو رہا ہے۔
کبھی وہ کہتا "میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں ترکی لے جاؤں گا۔" اور وہ نیند میں ہی رونے لگتی۔
اس نے اپنے ہاتھ پر اس جگہ دیکھا جہاں تین ماہ قبل ماہو ڈھنڈ کے کنارے افق نے آئنمنٹ لگایا تھا۔ اب وہ معمولی خراش وہاں نہیں تھی' مگر درد' اندر ہی اندر "درد" بہت ہوتا تھا۔ اور جب یہ درد شدت اختیار کر لیتا تو وہ رو دیا کرتی تھی۔ "افق...! واپس لوٹ آؤ...... میرا زخم ہرا ہو گیا ہے...... مجھے بینڈیج کر دو...... اسی بہانے ہی لوٹ آؤ۔"
وہ اب بھی اس کے ساتھ تھا' اس کے کہیں بہت اندر موجود تھا۔ اس کے ساتھ سانس لیتا تھا' اس کے ساتھ ہنستا تھا' اس کے ساتھ روتا تھا۔
اس کے خیالات میں مخل ہونے والی آواز بھاری بوٹوں کی دھمک تھی جو اسے اپنی پشت پر سنائی دی تھی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ وہی اس روز والا آرمی آفیسر تھا جو اسے گھور رہا تھا۔ کھلتی رنگت' تیکھے نقوش' کافی ہینڈسم سا میجر کے رینک کا آفیسر تھا۔
"آپ ڈاکٹر پریشے جہاں زیب ہیں؟"
وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "یہ بات آپ اس روز کیپٹن بشیر سے معلوم کر چکے ہیں۔" وہ رکھائی سے بولی۔
"معلوم نہیں کنفرم کیا تھا۔ آپ نے مجھے پہچانا' میں میجر عاصم رؤف ہوں۔ میں نے ہی ارسلان کو راکاپوشی سے ریسکیو کیا تھا۔"
"اوہ!" اس کے ماتھے پر بل غائب ہو گئے۔ "اچھا' پھر وہی یادیں۔ خدایا یہ دوماہی میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا؟" "دراصل میں میجر صاحب! میں نے آپ کو سرسری سا ایک دو دفعہ ہی دیکھا تھا' اس لیے پہچان نہیں پائی۔" وہ مروتاً" کہنے لگی۔
"اٹس او کے میم! مجھے آپ سے ملنا تھا۔ آپ سی ایم ایچ میں بیہوش تھیں اور جس دن ہوش میں آئیں' مجھے اسی صبح سی او نے فارورڈ ایریاز میں بھیج دیا۔ میں ان فیکٹ تین دن وہاں موسم خراب ہونے کی وجہ سے

اپنے ہیلی کاپٹر کے ساتھ stuck ہو کر رہا‘ جب واپس آیا تو آپ جا چکی تھیں۔“

”میں چلتی ہوں‘ مجھے کچھ مریض دیکھنے ہیں۔ تھینکس اینی ویز۔“ اسے اس کی تفصیلات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سو رسمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی پلٹ کر جانے لگی۔

”میم! میرے پاس آپ کی ایک امانت تھی۔ افق ارسلان نے یہ آپ کے لیے دیا تھا کہ آپ کو ہوش آئے تو دے دوں۔“

وہ بے حد تیزی سے میجر عاصم کی جانب گھومی تھی۔

”کیا ..... کیا دیا تھا افق نے؟“ اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔

”اس روز آپ کو دیکھا تو یہ میرے پاس نہیں تھا‘ ورنہ دے دیتا۔ کل اسلام آباد گیا تو لے آیا۔“ اس نے والٹ سے ایک چھوٹا سا خط کا لفافہ نکال کر پریشے کی جانب بڑھایا جسے اس نے تیزی سے پکڑا۔

لفافے کے کونے میں سبز رنگ کا آرمی کا کوئی نشان بنا تھا اور اوپر گلگت کنٹونمنٹ کا ایڈریس لکھا تھا‘ جیسے وہ جی ایچ کیو سے آیا ہو۔

”یہ لفافہ اس نے مجھ سے لیا تھا۔“ اس کے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھنے پر میجر عاصم نے وضاحت کی۔

پریشے نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ چھوٹی سی ٹیپ اتاری۔ میجر عاصم اتنا مہذب تھا کہ پریشے کو یقین تھا‘ افق کے ٹیپ لگانے کے بعد وہی پہلی دفعہ اسے کھول رہی ہے۔

لفافے کے اندر ٹشو میں لپٹی تصویر تھی۔

دور تک پھیلا سبزہ‘ دائیں طرف جھیل‘ بائیں جانب گھوڑا‘ گھوڑے کے ساتھ پریشے اور پریشے کے اس طرف افق۔ وہ ہنستے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ سیاہ گھڑی کے ڈائل کا اہرام چمک رہا تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا ”گھوڑا پریشے کے دائیں طرف ہے۔“

اس نے تصویر کو پلٹا‘ پیچھے سفید کاغذ چپکا کر سبز روشنائی سے ہاتھ سے انگریزی میں لکھا تھا۔

زندگی کے سفر میں بچھڑنے سے پہلے
ملن کے آخری شام کے ڈھلنے سے پہلے
اور ایک دوسرے کی سانسوں اور
دھڑکنوں کی آخری آواز سننے سے پہلے
کہ جس کے بعد تم میری دنیا سے دور چلے جاؤ گے
تمہیں مجھ سے
ایک وعدہ کرنا ہوگا
کہ جب بھی سورج طلوع ہوگا
اور سوات کی وادیوں میں روشنی بارش کے قطروں کی طرح گرے گی
اور قراقرم کے جامنی پہاڑوں پر جمی برف پگھلے گی
اور پھر جب اس برف میں دبی داستان نگر کے درمیان میں بہہ جائے گی
تب تم کو مجھ سے ایک وعدہ نبھانا ہوگا
کہ اس رات کے بعد اپنی زندگی میں آنے والی ہر صبح کی ٹھنڈی ہوا
اور ہر بارش کے بعد گیلی مٹی
اور جامنی پہاڑوں پر دودھ کی سی جمی برف کو دیکھ کر تم مجھے یاد کرنا
کہ یہ میرا تم پر
اور تمہارا مجھ پر
قرض ہے

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

اسے یاد تھا۔ برف کی دیوار سے ٹیک لگائے اس کی جانب گردن پھیرے بیٹھا افق۔

”تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“ اور پھر اس نے گہرے کرب سے آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ اس میں بولنے کی‘ وعدہ لینے کی سکت بھی نہیں تھی۔

”آر یو او کے ڈاکٹر پریشے؟“ اس کو پرائیویسی دینے کے لیے میجر عاصم جو نامحسوس انداز میں چند قدم دور ہٹ چکا تھا‘ اسے روتے دیکھ کر تشویش سے بولا۔

”کب دی اس نے یہ آپ کو؟“ ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کر کے وہ زبردستی مسکرائی۔

”جب وہ آپ سے ملنے ہسپتال آیا تھا۔ آپ بے ہوش تھیں۔ وہ آپ کے کمرے سے باہر نکلا اور مجھ سے لفافہ‘ ٹشو‘ پین اور صاف کاغذ مانگا۔

پھر اس نے پاکٹ سے ایک پکچر نکالی‘ اس کی بیک پر کاغذ لگا کر کچھ لکھا‘ ٹشو میں لپیٹا‘ پین مجھے دیا اور لفافے میں بند کر کے قریب پڑی کسی دوائی کی ڈبی پر لگی ٹیپ اتار کر لگائی۔ اس نے یہ مجھے آپ کو خود دینے کی تاکید کی تھی‘ ورنہ جب میں کام سے اسکردو گیا تھا‘ تو بلال یا خالد کو دے کر جا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے بعد میں یہ آپ کو کوریئر بھی نہیں کیا‘ حالانکہ آپ کا ایڈریس اور نمبر میرے پاس تھا۔ آپ کو کال بھی کی‘ ایس ایم ایس بھی کیا‘ مگر کسی غلط فہمی کی بنا پر آپ نے میری بات نہیں سنی۔ پھر میرا پنڈی آنا ہی نہیں ہوا۔ کام میں بہت بزی تھا۔ اب اتفاق سے آپ مل گئیں تو میں یہ لے آیا۔ بہت معذرت دیر کرنے پر۔“

”مجھے آپ کی کال ریسیو کرنا قطعاً یاد نہیں‘ مگر تھینک یو سو مچ میجر عاصم!“

”مائی پلیژر میم!“ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کیوں رو دی تھی۔ کوئی تجسس‘ کوئی سوال نہیں۔ وہی ٹپیکل‘ بہت ڈیسنٹ آرمی مین!

”اور‘ وائف اور بچے ٹھیک ہیں آپ کے؟“ پریشے نے یونہی اخلاقاً پوچھ لیا۔

”جی مہوش بالکل ٹھیک ہے۔ بچے بھی پنڈی میں ہوتے ہیں۔“ وہ شائستگی سے مسکرایا۔ پھر چند ایک باتیں کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

اور وہ وہاں کھڑی سوچنے لگی کہ کیا افق کو واقعی ”یاد کرنے کا وعدہ“ کرنے کی ضرورت تھی؟ کیا وہ اسے بھول سکتی تھی؟

☆ ☆ ☆

23 اکتوبر 2005ء

زلزلے کے متاثرین میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ tetnus کی وبا پھوٹ رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ اور فرح اپنے خیمے میں بیٹھی متاثرہ افراد کو انجکشن لگا رہی تھیں۔

”فرح! میں ابھی اسلام آباد واپس جا رہی ہوں۔ تم چلو گی یا ادھر مزید رہو گی؟“

”تم جا رہی ہو تو میں بھی چلتی ہوں۔ ویسے تم بائی ایئر جا رہی ہو؟“

”ہاں‘ ابھی بشیر آ کر بتائے گا کہ ..... ہیلی کاپٹر فارغ ہے یا نہیں۔“ اسی اثناء میں کیپٹن بشیر اندر آیا۔

”میڈم! ہیلی بس آنے ہی والا ہے۔ کرنل طارق اس میں کچھ لوگوں کو لے کر آ رہے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔“

”اچھا۔“ وہ جھک کر بچے کو ٹیکہ لگا رہی تھی‘ پھر بے حد فکر مندی سے ساتھ بیٹھی اس کی ماں سے اس کے بارے میں سوالات کرنے لگی‘ کیونکہ اسے تیز بخار تھا۔

کیپٹن بشیر نے ایک لمحے کو سوچا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو

بتائے کہ جو لوگ کرنل طارق کے ہیلی پر مظفر آباد آ رہے تھے، وہ ترکی سے آئے تھے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اس سے ترکی سے آنے والوں کے متعلق پوچھا تھا، مگر ایک تو وہ اتنی مصروف تھی، دوسرا اس نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ ترکی سے آنا تو کسی نے نہیں ہے اور پھر، ڈاکٹر صاحب کو اگر ترکی سے آنے والوں میں کوئی دلچسپی ہوگی تو وہ یقیناً" ترک ڈاکٹرز سے ہوگی۔ کیپٹن بشیر کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا، کیونکہ آنے والے ڈاکٹرز نہیں، انجینئرز تھے۔

آدھے گھنٹے بعد یہ کیپٹن بشیر ہی تھا جس نے دونوں کو کرنل طارق کے پہنچنے کی اطلاع دی۔

"آپ سامان وغیرہ پیک کر کے جلدی آجائیں، کیونکہ کرنل صاحب نے فوراً" واپس جانا ہے۔ پلیز میڈم دیر مت کیجیے گا، کیونکہ کرنل صاحب کا غصہ پوری یونٹ میں مشہور ہے۔"

"ہاں میں ذرا اپنا سامان اس خیمے سے لے لوں جہاں رات ہم سوئے تھے۔" وہ اس خیمے سے نکل آئی۔ اس کا رخ چند گز کے فاصلے پر موجود اس میدان کے سب سے آخری سبز خیمے کی جانب تھا جس میں وہ اور فرح اتنے دن سے رہ رہی تھیں۔

وہاں کھلا سا میدان تھا، ایک طرف خیمہ بستی تھی، دوسری جانب خالی قطعۂ اراضی پر ہیلی کاپٹر نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے پنجے ابھی گھاس سے چند فٹ دور تھے۔

وہ اس آخری خیمے میں چلی آئی جلدی جلدی سامان سمیٹا، بالوں کو ایک دفعہ پھر اوپر کر کے کیچر میں باندھا۔ کسی چیز کے چٹخنے کی آواز بھی سنائی دی مگر وہ دھیان دیے بغیر شال لپیٹے، بیگ کندھے پر ڈالے باہر آگئی۔

فرح اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

"چلو۔"

وہ دونوں ساتھ ساتھ ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھنے لگیں۔ وہاں ارد گرد ڈھیروں لوگ، جن میں اکثریت فوجی جوانوں کی تھی، ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

چند فوجی جوان ان مریضوں کو ہیلی کاپٹر میں چڑھا رہے تھے جن کو انہیں سرجری اور طبی امداد کے لیے اسلام آباد لے جانا تھا۔ بشیر نے قریب سے گزرتے ایک جوان کو روک کر ہدایت دی۔ "Tok.1 کی ٹیم کو اس آخری خیمے میں لے جاؤ۔ ابھی وہی خالی ہے۔"

وہ دونوں سر نیچے کیے، تیز ہوا سے بچتی آگے پیچھے اندر داخل ہوئیں۔ مریض پہنچ چکے تھے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ پریشے نے ہیڈ فون چڑھانے سے قبل شال اتار کر بالوں کو دوبارہ سنوارنا چاہا مگر یہ کیا؟ اس کے کیچر کے ایک طرف لگا دو رنگا پتھر غائب تھا۔

"اب کہاں ڈھونڈوں اسے؟ کبھی سستی میں ایلفی سے بھی نہیں جوڑا۔" وہ کپڑے جھاڑنے لگی۔ اندر روشنی خاصی کم تھی، اسے پتھر کہیں بھی نظر نہیں آیا۔

"فرح! اس کا پتھر گر گیا ہے۔ وہ کونے والے خیمے میں گرا ہوگا۔ میں لے آؤں؟"

"بیوقوف! ہیلی اڑنے لگا ہے۔ کرنل طارق کے غصے کے قصے نہیں سنے؟ خوامخواہ ان کو غصہ مت دلاؤ۔"

"مگر فرح وہ قیمتی پتھر تھا اور......"

"لوگوں کا گھر بار لٹ گیا اور تمہیں پتھر کی پڑی ہے؟ ایک پتھر کے لیے۔ کرنل صاحب سے دوبارہ ہیلی اترواؤ گی؟" فرح بالکل نشاء کی گھرکتی تھی۔ وہ خاموشی سے پیچھے ہو کر بیٹھ گئی، مگر جانے کیوں اس لمحے اس کا دل چاہا کہ وہ کرنل طارق سے ہیلی اتارنے کی درخواست کرے، صرف ایک منٹ کے لیے۔ بس وہ اپنا پتھر لے آئے۔

صرف پتھر نہیں، اس لمحے اسے مظفر آباد کے شہر خموشاں کی اداس اور سوگوار فضا میں "کچھ اور" محسوس ہوا تھا، کچھ ایسا جو ان پچھلے بہت سارے دنوں میں جو اس نے وہاں گزارے تھے، نہیں تھا۔ وہ اس وقت ہیلی کاپٹر سے نیچے اترنا چاہتی تھی، وہ مظفر آباد چھوڑنا نہیں چاہتی تھی، مگر محض مروت میں، وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔

پریشے اور فرح کو ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر کیپٹن بشیر تیز قدموں سے واپس آیا۔ جس جوان کو اس نے Tok.1 کی ٹیم کو خیمے میں بٹھانے کو کہا تھا، وہ ان تین افراد کے ہمراہ اس آخری خیمے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ تینوں افراد کی بشیر کی جانب پیٹھ تھی۔

وہ ان کے قریب آیا۔

"السلام علیکم سر!"

تینوں ایک ساتھ پلٹے۔

پہلا ترک انجینئر اچھی قد و قامت کا مالک تھا۔ بال سیاہ، گوری رنگت، یورپین نقوش۔

بشیر نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "آئی ایم کیپٹن بشیر۔" اس کی انگریزی پورے گاؤں میں بہترین تھی۔

"کینن جینک۔" ترک انجینئر نے گرمجوشی سے ہاتھ تھاما۔ کیپٹن بشیر دوسرے کی جانب بڑھا۔ وہ قد میں باقی دونوں سے چار پانچ انچ چھوٹا تھا۔ بال گھنگھریالے اور سنہری مائل بھورے تھے۔ سر پر الٹی پی کیپ تھی جس پر سفید مارکر سے کچھ لکھا تھا۔

"جینک یقین۔" اس نے خوشدلی سے بشیر سے ہاتھ ملایا۔

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اب اس نے تیسرے کی جانب دیکھا۔

تیسرا انجینئر ان دونوں سے ایک قدم پیچھے کھڑا تھا، ایسے کہ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ اس کے سر پر سیدھی پی کیپ تھی اور دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔

کیپٹن بشیر کے ہاتھ بڑھانے پر وہ دایاں ہاتھ جیب سے نکال کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے دو قدم آگے بڑھا اس کا چہرہ روشنی میں آیا جس پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

"افق حسین ارسلان۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔ اس میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جس سے کیپٹن بشیر متاثر ہوا تھا۔ شاید وہ بہت ہینڈسم تھا، یا شاید اس کی شخصیت میں عجیب سی مقناطیسیت تھی جو مقابل کو مسمرائز کر دیا کرتی تھی۔

"آپ کو انجینئرنگ کور والوں سے بس تھوڑی دیر میں ملواتا ہوں۔ تب تک آپ اندر آرام کریں۔" وہ عجلت میں کہہ کر پلٹ گیا۔

جہنک آگے بڑھا اور خیمے کا پردہ ہٹا کر اندر قدم رکھا۔ کینن نے اس کی تقلید کی۔ افق سب سے آخر میں جھک کر خیمے میں داخل ہوا۔

تینوں ایک ساتھ نیچے زمین پر بیٹھنے ہی لگے تھے۔ جب افق بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔ اس کی نگاہ زمین پر گرے دور نگے پتھر پہ پڑی۔ اس نے جھک کر پتھر اٹھایا اور انگلیوں کے درمیان پکڑے آنکھوں کے قریب لا کر روشنی میں بغور دیکھا۔

اس پتھر کا سائز اس کے انگوٹھے کے ناخن سے دگنا تھا' اس کے عین وسط میں لکیر پڑی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے انگلیوں کے پوروں میں پکڑے دیکھتا رہا' پھر کچھ سوچتے ہوئے جیب میں ڈال لیا اور باہر نکل آیا۔

اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہا تھا۔

"کچھ چاہیے تھا مسٹر ارسلان؟" کیپٹن بشیر کسی سے بات کر رہا تھا' اسے باہر آتا دیکھ کر اس کے قریب آیا۔

"نہیں۔" وہ ایک لمحے کو رکا' پھر آخری خیمے کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ خیمہ فوج کا ہے یا امداد میں آیا تھا

"میرا خیال ہے سر! امداد میں آیا تھا۔"

"اچھا ویسے زیادہ مسئلہ تو نہیں ہے' مگر پھر بھی' مجھے یوں لگا کہ اس کی شیٹ سردی کو روکنے کے لیے ناکافی ہے۔"

"نہیں سر! یہ تمام خیمے خاصے گرم ہیں۔ آرمی کینوس کے بنے ہیں' اور ان میں پیراشوٹ لائنو زہیں۔"

"مجھے نازک مزاج مت سمجھنا کیپٹن' مگر پہلے رہنے والوں کو شکایت تو نہیں ہوئی؟" انداز سرسری سا تھا۔

"نہیں' بلکہ جن کو ٹھہرایا تھا' انہوں نے تو ذکر بھی نہیں کیا۔"

"ہو سکتا ہے جن کو آپ نے ٹھہرایا ہو' ان کا تعلق انٹارکٹیکا سے ہو' ان کو تو ظاہر ہے یہ گرم ہی لگے گا۔" وہ ہولے سے ہنسا وہ انگریزی تیز تیز بولتا تھا اور بعض الفاظ سمجھنے میں بشیر کو دقت ہو رہی تھی۔

"نہیں سر! وہ دونوں تو اسلام آباد کی ڈاکٹرز تھیں۔ پمز ہسپتال سے آئی تھیں۔ انہوں نے تو کوئی شکایت نہیں کی۔" کیپٹن نے ذہن پر زور دے کر نفی میں سر ہلایا۔

"پمز ہسپتال۔" وہ بڑبڑایا' پھر جیب سے پتھر نکالا۔

"یہ کس کا ہے؟ مجھے خیمے کے فرش پر سے ملا ہے۔"

"یہ تو ڈاکٹر صاحبہ کے کلپ پر لگا تھا شاید۔ میں غور نہ کرتا مگر یہ ڈھیلا تھا اور گرنے کو تھا' میں نے ڈاکٹر صاحبہ کو کہا بھی تھا کہ یہ قیمتی ہے' دھیان رکھیں مگر یہ پھر بھی گر گیا۔"

"وہ ڈاکٹر صاحبہ کہاں ہیں؟" اس نے بظاہر عام سے انداز میں پوچھا۔

"وہ تو ابھی' بالکل ابھی ہیلی پر اسلام آباد چلی گئیں ہیں۔"

ترک انجینئر کے چہرے پر پھیلتی واضح مایوسی پر بشیر کو حیرت ہوئی تھی۔

"سر! آپ یہ مجھے دے دیں' میں اسلام آباد گیا تو ان کو دے دوں گا۔"

"تم اسلام آباد کب جاؤ گے؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"آج 23 ہے' میں دو دن چھوڑ کر 26 کو جاؤں گا۔"

"پھر مجھے بھی ساتھ لے چلنا۔ یہ میں تمہاری ڈاکٹر صاحبہ کو خود ہی لوٹا دوں گا' یہ قیمتی پتھر ہے۔ یہ میرے پاس امانت رہے گا۔" اس نے پتھر واپس جیب میں ڈال لیا' چہرے پر ہنوز سنجیدگی چھائی تھی۔

"چلیں..... جیسی آپ کی مرضی۔" کیپٹن بشیر نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ترک انجینئر پلٹ کر واپس خیمے کی جانب چلا گیا۔ وہ اسی طرح حیرت اور اچنبھے سے اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔

"عجیب بندہ ہے۔ ابھی اسلام آباد سے ہی آیا ہے' اور ابھی جانے کی بات کر رہا ہے۔ بریگیڈیئر صاحب تو کہہ رہے تھے کہ یہ ترکی کی سب سے بڑی انجینئرنگ فرم سے آنے والے ترکی کے بہترین انجینئرز ہیں' مگر تو..... خیر سانوں کی!" وہ شانے اچکا کر دوسری جانب کو ہو لیا۔ ابھی اسے انجینئرنگ کور کے دوسرے انجینئرز سے ان ترکوں کو ملوانا تھا۔

میجر ڈاکٹر نعمان کے خیمے کے قریب رک کر اس نے اطلاع دی۔ "سر! کرنل صاحب کہہ رہے تھے آپ ترک انجینئرز سے مل لیں۔" پھر وہ ایک ڈاکٹر کو انجینئرز سے ملوانے کی منطق پر حیران ہوتا وہاں سے چل دیا۔

ان تین انجینئرز نے اگلے دو دنوں میں اتنی لگن' محنت اور جانفشانی سے کام کیا کہ آرمی آفیسرز حیران تھے۔ وہ ان کے ملک کے نہیں تھے' ان کا کوئی دور پار کا عزیز بھی کشمیر میں نہیں رہتا تھا' نہ ایسا کوئی امکان تھا' وہ ایک اور خطے سے تعلق رکھتے تھے' اس سب کے باوجود وہ اپنا آپ بھلائے کام میں لگے تھے۔ باقی دونوں تو پھر سوئے بھی تھے' مگر افق حسین ارسلان نے بغیر رکے کئی گھنٹے کام کیا تھا۔ وہ شخص بھی عجیب تھا' کم از کم کیپٹن بشیر کو لگا تھا۔

اس کی شخصیت میں مشرقی و مغربی وجاہت کا ملاپ تھا۔ مرد ہونے کے باوجود کیپٹن بشیر کو اعتراف تھا کہ اس نے افق ارسلان جیسی خوب صورت آنکھیں آج تک کہیں نہیں دیکھی تھیں۔ آزردہ' حزن و ملال لیے اداس شہد رنگ آنکھیں۔

وہاں بہت سے مرد خاصے وجیہہ تھے مگر یہ اس شخص کی اداس شہد رنگ آنکھیں تھیں جو اِدھر موجود ہر لڑکی کو رک کر اسے دیکھنے پر مجبور کرتی تھیں۔ لیکن نہیں وہ آدمی کس مٹی سے بنا تھا' اس کو کیپٹن بشیر نے کسی عورت سے بات کرنا تو درکنار' سر اٹھا کر کسی کو دیکھتے بھی نہیں پایا تھا۔ وہ ویسے بھی بہت کم بولتا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی' خصوصاً" جہنک یقین بے حد زندہ دل اور شوخ سا تھا۔ ماحول سوگوار تھا' مگر پھر بھی فضا میں چھائے حزن کو کم کرتی جہنک کی باتیں اچھی لگتی تھیں۔ کیپٹن بشیر کو حیرت تھی کہ دو بہت بولنے والوں سے اس خاموش طبع انسان کی دوستی کیسے ہو گئی۔ اس نے شروع رات کے علاوہ پھر ان دو دنوں میں بشیر سے صرف دو دفعہ بات کی۔ ایک تب' جب وہ اسے کچھ دینے آیا تھا۔

"ہمارے ہاں ایک قدیم رواج ہے۔ ترکی میں ہر پیدا ہونے والی بچی کو اس کے ماں باپ' چاہے کتنے غریب ہوں' سونے کا کوئی زیور تحفے میں دیتے ہیں۔ یہ زیور ایک ترک لڑکی کی جان سے قیمتی متاع ہوتی ہے۔ ترک لڑکی مر سکتی ہے' مگر اپنا وہ زیور کسی کو نہیں دیتی۔ چاہے جتنی غربت ہو' ترکی میں کبھی یہ والا زیور فروخت نہیں کیا جاتا۔" وہ چند لمحوں کے وقفے سے کہنے لگا۔ "8 اکتوبر کو جب پاکستان میں زلزلہ آیا' تو انقرہ کے پبلک اسکول میں ٹیچرز نے فنڈز اکٹھے کرنے شروع کیے۔ اپنے مسلمان برادر ملک پاکستان کے لیے۔ ایک سات سالہ بچی عروہ بلیم کے پاس فنڈ میں دینے کو لاکھوں کروڑوں ڈالرز نہیں تھے۔ اس کا باپ اتنا غریب تھا کہ اس کو تو پاکٹ منی بھی نہیں ملتی تھی۔ سو اس بچی نے وہ کیا جس نے وہاں اسکول میں موجود تمام افراد کو رلا دیا۔" افق نے جیب سے چھوٹی چھوٹی سونے کی چوڑیاں نکال کر بشیر کے سامنے کیں۔ "عروہ کے پاس دینے کو کچھ نہیں تھا' سو اس نے اپنی سب سے عزیز چیز 'اپنی پیدائش کا تحفہ' یہ چوڑیاں اپنے مسلم بھائیوں کے لیے دے دیں۔ ایک ترک ہونے کے ناتے مجھے عروہ پر فخر ہے۔ ایک پاکستانی ہونے کے ناتے آپ کو بھی اس پر فخر کرنا چاہیے۔"

وہ چوڑیاں بشیر نے متعلقہ افراد تک پہنچا دیں۔

☆ ☆ ☆

25 اکتوبر 2005ء

وہ اس روزناموں کے ایک دوست کی اہلیہ کی عیادت کے لیے سی ایم ایچ آئی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ آسمان' سمندر کے پانی کی طرح نیلا

اور صاف تھا ماسوائے دور افق پر تیرتے سیاہ بادلوں کے جھنڈ کے، جو ابھی اسلام آباد سے خاصے دور تھے۔

گاڑی کھڑی کرکے، وہ مین گیٹ عبور کرکے سی ایم ایچ کی بلڈنگ کی جانب جانے والی ڈھلوان پہ بنی سڑک اترنے لگی۔ ڈھلوان کی اترائی کے آغاز میں سڑک کے دونوں اطراف میں دو بڑے بڑے سرسبز درخت تھے۔ وہ ان کے قریب سے گزرنے ہی لگی تھی کہ نیچے سے آتے میجر ڈاکٹر نعمان پر نگاہ پڑی۔ وہ عجلت میں اپنے بھاری بوٹوں کی دھمک پیدا کرتا سڑک پر اوپر چڑھ ہی رہا تھا کہ اسے وہاں دیکھ کر ٹھٹکا اور پھر شناسائی سے مسکرا کر تیزی سے اس کی جانب بلند ہوتے راستے پر چڑھنے لگا۔

اس نے وہیں دونوں درختوں کے درمیان سڑک پر قدم روک لیے اور جوابی مسکراہٹ کے ساتھ میجر نعمان کو دیکھا۔

ان دونوں نے کئی دن سی ایم ایچ میں ساتھ کام کیا تھا، یوں سی ایم ایچ میں ملنا کوئی اتفاق نہ تھا کہ ظاہر ہے، وہ پنڈی پوسٹڈ تھا اور سی ایم ایچ آنے پر پریشے کا اس سے ٹکراؤ ہونا لازم تھا۔

"کیسے مزاج ہیں ڈاکٹر صاحبہ؟ خیریت سے سی ایم ایچ آئی ہیں؟" وہ چند قدموں کی بلندی عبور کرکے اس تک آگیا تھا۔

"خیریت سے ہسپتال کون آتا ہے میجر صاحب؟ بریگیڈیئر باجوہ کی مسز کی عیادت کے لیے آئی تھی، ان کا آپریشن ہوا تھا اور آپ کب آئے مظفر آباد سے؟"

ٹھنڈی ہوا ایک لمحے کو زور سے چلی۔ دونوں درختوں کے سبز پتّوں کے درمیان سے سوکھے زرد پتّے نیچے آن گرے۔

"صبح ارلی پہنچا تھا، اور اب آپ کے سامنے ہوں۔" یونیفارم اور سرخ ٹوپی میں ملبوس، اس کے ترو تازہ چہرے پر تھکاوٹ اور سفر کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔

"کیسی گزر رہی ہے مظفر آباد میں؟"

دائیں جانب والے درخت تلے گھاس پہ گرے خشک پتوں کے قریب ایک چڑیا پھدک رہی تھی۔

"بس میڈم! کام ہو رہا ہے۔ کوشش تو سب کر رہے ہیں، آگے جو اللہ کو منظور اور آپ ٹھیک ہیں؟" چڑیا اب ایک سوکھے، بھورے پتّے کو چونچ مارنے لگی تھی۔

"ایم فائن، تھینکس اور کیپٹن بشیر وغیرہ سب ٹھیک ہیں؟" ٹھنڈی ہوا ایک دفعہ پھر زور سے چلی۔ گھاس پر گرے زرد پتے اڑ کر اِدھر اُدھر بکھرتے ہوئے سڑک تک آگئے۔

"الحمدللہ سب ٹھیک ہیں۔ کیمپ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ کچھ فارنرز بھی آئے ہوئے ہیں۔ فارنرز تو پہلے بھی تھے، مگر پرسوں جن لوگوں سے مل کر آرہا ہوں، ان کے سوشل ورک کے جذبے نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔ خیر کام تو ہو رہا ہے، آگے دیکھیں۔" (شاید وہ بولنے کا خاصا شوقین تھا، ورنہ آرمی والوں کو عموماً اس نے ٹو دی پوائنٹ بات کرتے دیکھا تھا۔) مسز باجوہ کو تو خیر ابھی کچھ ٹیسٹ کروانے تھے، انہیں دوسرے ڈیپارٹمنٹ تک لے کر گئے ہیں، آپ کو کچھ در ویٹ کرنا پڑے گا۔ میں پتہ کرتا ہوں، وہ روم میں آجائیں تو میں آپ کو بتا دوں گا۔"

"ارے میجر نعمان! میں خود دیکھ لوں گی۔ آپ خوامخواہ اتنی تکلیف نہ کریں۔" وہ اس کا صرف اس وجہ سے کہ وہ کیمپ میں ساتھ تھی، اتنا خیال کر رہا تھا، وہ شرمندہ ہونے لگی۔

"کوئی پرابلم نہیں، میں دیکھ آتا ہوں۔ آپ تب تک ویٹنگ روم میں بیٹھ جائیں۔"

چڑیا اب میجر نعمان کے عقب میں سڑک پر گرے پتوں تک پھدک کر آگئی اور ایک پتے پر چونچ مارنے لگی۔

"نہیں، میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ آج موسم بہت اچھا ہے۔" اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا، جہاں نیلی چادر میں عین اس کے سر کے اوپر روئی کے گال کی طرح کا چھوٹا سا بادل تیر رہا تھا اور اداسی سے مسکرائی "اور میں تو ویسے بھی خوب صورت موسموں کی دیوانی ہوں۔ میں یہاں قطعاً "بور نہیں ہوں گی۔"

چلیں، پھر میں آپ کو بتاتا ہوں۔" وہ الٹے
وں پر مڑ گیا۔ بھوری چڑیا سہم کر اڑ گئی۔ میجر نعمان
ب کی ڈھلوان اترنے لگا۔ چڑیا دائیں طرف والے
ت پر جا بیٹھی۔ وہ دور ہو تا گیا تو وہ واپس درخت کے
گھاس پر آ گئی۔

پریشے اسے جاتا دیکھتی رہی، پھر بائیں طرف اگے
ت کے قریب آئی اور اس کے تنے سے ٹیک لگا کر
گئی۔ بھوری چڑیا اس کے بالکل سامنے والے
خت کے نیچے گھاس پر چونچیں مار رہی تھی۔

ٹھنڈی ہوا کا زور دار جھونکا آیا۔ دونوں درختوں
ے پھر سے زرد پتوں کی بارش ہوئی۔ کچھ اس کے
راف اور کچھ اوپر گر گئے۔

وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیتے لمحوں کو یاد
رنے لگی جب انہی خوب صورت موسموں میں وہ
اتھ ساتھ وادیوں، مرغزاروں اور چشموں میں پھرتے
تھے، ایسا ہی ایک درخت تھا جس کے تنے سے کبھی وہ
یک لگا کر بیٹھتے تھے اور ایسی ہی گھاس تھی جس پر اپنا
گھٹنا جھاڑتے ہوئے افق کی پینٹ پر سے سرخ رنگ کا
کیڑا گرا تھا۔

بھوری چڑیا اب پھدکتی ہوئی سڑک تک آ گئی اور
سرمئی تارکول میں اِدھر اُدھر چونچ مارتی کچھ تلاش
کرنے لگی تھی۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ زرد سوکھے چر مر
کرتے چند پتے ابھی تک اس کے بالوں گودا اور دوپٹے
میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے لب دھیرے
دھیرے گنگنانے لگے، وہ گیت جو کبھی موسلا دھار
بارش میں بھیگتے ہوئے ان چوڑی سیڑھیوں پر کھڑے،
افق ارسلان پنجرے میں مقید موروں کو سنایا کرتا تھا۔

نہ کچھ کہو ہمیں
ہم اس راہ کے مسافر ہیں
ہم عشق میں پاگل ہیں
نہ کچھ کہو ہمیں
ہم لیلیٰ ہیں، ہم مجنوں ہیں
شاید لیلیٰ نے قیس سے اتنی محبت نہیں کی ہو گی

جتنی پری نے اپنے کوہ پیما سے کی تھی، پھر بھی آج وہ
تہی داماں تھی۔

وہ جانے کتنی دیر Kayahan کا وہ ترک گیت
گنگناتی رہی، دفعتاً کسی احساس کے تحت آنکھیں
کھولیں۔

بھوری چڑیا دوبارہ سہم کر سامنے والے درخت کے
عقب میں چھپ گئی تھی کیونکہ اب وہاں سڑک پر میجر
نعمان کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آپ نے غلط پروفیشن چوز کیا ڈاکٹر صاحبہ! آپ تو
بہت اچھا گنگنا لیتی ہیں، پھر میڈیکل میں کیوں آ گئیں؟"

"نہیں، یہ تو بس ایسے ہی!" جھینپ کر کہتی وہ اٹھ
کھڑی ہوئی۔ زرد پتوں کا ڈھیر اس کی گود سے نیچے
گھاس پر گرا۔

"بریگیڈیر صاحب کی وائف واپس روم میں آ چکی
ہیں، آپ ان سے مل لیں۔" پھر وہ ایک لحظے کے
توقف سے کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "ویسے ڈاکٹر
صاحب! یہ گیت خاصا مشہور ہے کیا؟"

"نہیں تو۔" اس نے ہنس کر سر جھٹکا۔ چند پتے اور
ٹوٹ کر نیچے گر گئے۔ "آپ پاکستان میں اسے کسی کے
منہ سے نہیں سنیں گے۔"

"ارے نہیں میڈم! میں نے کل اِن فیکٹ یہی
گیت افق ارسلان کو گاتے سنا تھا۔"

سرد ہوا کا تیز جھونکا پھر سے آیا، اس کے اوپر سوکھے
پتوں کی بارش پھر سے ہوئی اور وہ ..... وہ اسی طرح
ساکت سی میجر نعمان کو دیکھ رہی تھی۔

"کس کو؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ شاید اس
کی سماعتوں کو دھوکا ہوا تھا۔

"افق ارسلان کو آپ نہیں جانتیں، وہ ترک انجینئر
ہے نا، اس کی بات کر رہا تھا۔ خیر آپ مسز باجوہ سے مل
لیں جا کر۔" اس نے پھر سے اطلاع دی، مگر وہ مسز باجوہ
سمیت دنیا کی ہر شے بھول چکی تھی۔

"کک ..... کون سا ترک انجینئر؟" شاید اس نے
غلط سنا تھا۔ وہ شاید کوئی اور نام لے رہا تھا۔

"افق ارسلان نام ہے اس کا۔"

وہ پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی تھی۔ "وہ آپ
کو کہاں ملا؟"

"وہیں مظفر آباد میں۔ وہ ریلیف اینڈ ریسکیو
ورک کے لیے ترکی سے آیا ہے۔ کل یہی گانا گا رہا تھا،
شاید یہ ترک گیت ہے۔" وہ جس طرح میجر نعمان کو
دیکھ رہی تھی، وہ الجھ سا گیا۔

"مگر ..... مگر میں نے تو مظفر آباد میں کوئی ترک
انجینئر نہیں دیکھا۔" اس کا وجود قیامت خیز زلزلوں کی
زد میں تھا، آواز پھنسی پھنسی سی نکلی۔

"وہ اسی روز، بلکہ اسی ہیلی پر آیا تھا کرنل طارق کے
ہمراہ، جس پر آپ واپس گئی تھیں، شاید اسی لیے۔"
اب کے میجر نعمان کو واضح بے چینی ہوئی تھی۔

"اسی ہیلی پر؟" وہ بے خبر سی کہیں دور کھو گئی تھی۔
اسے یاد تھا، اس روز وہ کرنل طارق کے ہمراہ آنے
والے مسافروں کو دیکھ نہیں سکی تھی۔

"آر یو او کے ڈاکٹر جہاں زیب؟"
وہ بے اختیار چونکی۔ میجر نعمان تشویش سے اسے
دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔

"نہیں وہ ..... وہ اس کا پورا نام کیا ہے؟"
میجر نعمان نے ایک گہری سانس بھری۔ "افق
حسین ارسلان۔" اب وہ کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ وہ شاید
اسے جانتی تھی اور اب کنفرم کرنا چاہ رہی تھی۔

"یہ حسن حسین ارسلان کی خون پسینے کی کمائی ہے
جسے ہم یوں ہمالیہ میں جھونک رہے ہیں۔" اس کے
ذہن میں بہت سارے دن پہلے کہا گیا افق کا فقرہ گونجا۔

"افق حسین ارسلان؟" اس نے زیر لب دہرایا۔
افق ارسلان ترکی کا سب سے کامن نام تھا، مگر
حسین تو شاید صرف اس کے افق کے نام میں آتا تھا۔ تو
کیا میجر نعمان اس کے افق کی بات کر رہا تھا؟
عجیب بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"میجر نعمان ..... وہ، وہ کیسا دکھتا ہے؟" وہ کھوئے
کھوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"آ ....." میجر نعمان سوچتے ہوئے بتانے لگا۔ "خاصا
اونچا لمبا سا ہے، مجھ سے بھی دو انچ لمبا ہو گا۔ سکس
ون یا سکس ٹو ..... بال براؤن ہیں اور آنکھیں۔"

"اور آنکھیں؟" وہ سانس روکے جواب کی منتظر
تھی۔

"کوئی لائٹ کلر تھا۔"

"ہنی کلرڈ؟"

"شاید ایسی ہی تھیں۔ سوری میں نے غور نہیں
کیا۔ یہ لڑکیوں کا شعبہ ہے۔" وہ ہنس دیا مگر وہ کسی اور
ہی سوچ میں گم تھی۔

"وہ انجینئر ہے نا تو سر پر کیپ تو لیتا ہو گا؟"
میجر نعمان نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔

"اس کی کیپ کی پشت پر کچھ لکھا بھی ہو گا؟" وہ
اپنے دماغ کی تصدیق و تشفی کے لیے کہہ رہی تھی ورنہ
دل تو چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ وہ افق ارسلان اس کا
کوہ پیما ہی تھا۔

"نہیں ..... کچھ نہیں لکھا تھا۔"

"اچھا .....؟" اسے واضح مایوسی ہوئی۔ اسے یاد تھا
افق کی کیپ کی پشت پر ..... مگر وہ افق کی کیپ تو نہیں
تھی، وہ تو .....

"اس کے ..... اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہو گا۔ کوئی
دوسرا انجینئر؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"جی دو انجینئرز اور بھی تھے۔" پھر وہ قدرے توقف
سے بولا۔ "ہاں ان میں سے ایک کے سر پر جو کیپ تھی،
اس پر وائٹ کلر سے طیب اردگان کے حق میں نعرہ
درج تھا۔ جینیک یقین نام ہے اس کا۔"

اب تو کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

"اور تیسرا کون ہے؟ ڈاکٹر ہے؟"

"نہیں، وہ بھی انجینئر ہے۔ کینن۔"

"ان کے ساتھ کوئی ترک ڈاکٹر نہیں ہے؟"

"میں نے تو نہیں دیکھا، شاید یونیسف کے ساتھ
جو ڈاکٹرز تھے، ان میں سے کوئی ترک ہو۔ آپ جانتی
ہیں انہیں؟ اینی پرابلم؟" بہت تحمل سے اس کے تمام
سوالوں کا جواب دینے کے بعد وہ اپنے فطری تجسس کو

چھپانہ سکا۔

"میرا کچھ کھو گیا تھا ان پہاڑوں میں۔ وہی ڈھونڈتا ہے۔" وہ جیسے خود سے بولی تھی۔

"کیا کھویا تھا؟ آپ کی جیولری وغیرہ کا وہ دو رنگا جیم اسٹون جو وہاں خیمے میں گر گیا تھا؟"

پریشے نے چونک کر اسے دیکھا' پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں وہی۔"

"وہ کیپٹن بشیر کے پاس ہے' بلکہ اِن فیکٹ انہی انجینئرز کے پاس ہے۔ شاید کل کیپٹن بشیر اس کو ساتھ لے آئے۔"

"پتھر کو؟"

"نہیں' اس انجینئر افق ارسلان کو۔ اس نے امانتاً آپ کا قیمتی پتھر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میں بتانا بھول گیا تھا۔ وہ آپ کو مل جائے گا ڈونٹ وری۔ آپ مسز باجوہ سے مل لیں۔" وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا' مگر وہ سن نہیں رہی تھی۔

وہ مظفر آباد میں تھا؟ اس روز وہ مظفر آباد آیا تھا اور وہ چلی گئی تھی' مگر جانے سے قبل اسے محسوس ہوا تھا کہ اس شہر خموشاں کی سی ویرانیوں والی وادی میں' جہاں نیلم کا پانی اونچی آواز میں روتا تھا' کوئی اس لمحے آیا تھا۔ کوئی جو اس کی زندگی تھا۔

وہ مظفر آباد میں اسی آسمان تلے تھا جس کے نیچے وہ اس وقت کھڑی تھی؟ اوہ خدایا! وہ کیوں چلی آئی وہاں سے؟

اور نعمان کیا کہہ رہا تھا؟ بشیر کل افق کو اس کے پاس لانے والا تھا؟ مگر کل میں تو ابھی کئی گھنٹے پڑے تھے' وہ کل کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے عجیب سی بے چینی و بے قراری ہونے لگی۔ اسے افق کے پاس جانا تھا' ابھی اور اسی وقت۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ میجر نعمان کب کا وہاں سے جا چکا تھا۔ اس کے سر کے اوپر نیلے آسمان میں وہ بادل کا ٹکڑا دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ بھوری چڑیا اب وہاں نہیں تھی۔ سڑک پر زرد پتے اسی طرح بکھرے تھے۔

وہ تیزی سے ڈھلوان اترنے لگی۔ سوکھے پتوں سے اس کے پنک اور سفید جوگرز ٹکرائے تو وہ چرمر کی آواز کے ساتھ کچلتے گئے۔ وہ تقریباً" بھاگتے ہوئے ہسپتال کی عمارت میں داخل ہوئی۔

ریسپشن پر ایک سفید یونیفارم والی لڑکی اور خاکی یونیفارم والا لڑکا بیٹھا تھا۔

وہ ان کی جانب لپکی۔

"میجر ڈاکٹر نعمان کدھر ہیں؟"

لڑکا ناسمجھی کے عالم میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ لڑکی نے کہا۔

"ادھر رائٹ سائیڈ پر جائیں' کاریڈور کے آخر میں لیفٹ......" وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی مگر پریشے سنے بغیر دائیں جانب بھاگی' کاریڈور عبور کیا' آگے دو اطراف جاتی راہداریاں تھیں۔ پتہ نہیں لڑکی نے کیا بتایا تھا۔ وہ کس طرف جائے؟ پھر اندازے سے وہ ایک جانب کو مڑ گئی۔ جانے سی ایم ایچ میں اتنی بھول بھلیاں کیوں تھیں؟ کاریڈور کے اختتام پر اسے میجر نعمان کسی آفیسر سے بات کرتا دکھائی دیا۔ وہ دوڑ کر اس تک آئی۔

"میجر نعمان...... وہ..." پھولی ہوئی سانس کے ساتھ وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میجر نعمان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا' دوسرے آفیسر کو کچھ کہہ کر وہاں سے بھیج دیا اور پھر اس کی جانب مڑا۔

"ریلیکس ڈاکٹر صاحبہ! آرام سے بتائیں۔ خیریت ہے؟ مسز باجوہ نہیں ملیں آپ کو؟"

"بھاڑ میں جائیں مسز باجوہ۔" وہ کہتے کہتے رک گئی' پھر چند گہری سانسیں بھرتے ہوئے تنفس بحال کیا۔

"آج کوئی ہیلی مظفر آباد جا رہا ہے؟"

"ہیلی تو روز ہی جاتے ہیں۔ ابھی تو کتنے ریموٹ ایریاز ہیں جہاں سے ملبہ نہیں ہٹایا جا سکا۔ آپ کو کیا مظفر آباد جانا ہے؟"

"جی پلیز' مجھے ابھی جانا ہے۔"

"ابھی تو......" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "شاید ہمارے ایک کرنل صاحب مانسہرہ جا رہے تھے۔"

"تو مجھے راستے میں مظفر آباد چھوڑ دیں۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"مظفر آباد' مانسہرہ کے راستے میں نہیں پڑتا' ڈاکٹر صاحبہ آپ کو کوئی ایمرجنسی ہے کیا؟"

"ہاں وہ...... وہ میرا پتھر۔"

"تو کل وہ لوگ لے تو آئیں گے۔"

"مگر کل میں ابھی کافی دیر ہے۔ میرا پتھر بہت قیمتی تھا۔ مجھ سے اتنا انتظار نہیں ہو گا۔ مجھے ابھی ان سے بات کرنی ہے۔"

"بات کرنی ہے؟ تو وہ میں کرا دیتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟" پریشے کو حیرت ہوئی۔

"غالباً" کئی سو برس پہلے گراہم بیل نامی آدمی نے ایک چیز بنائی تھی جسے ہم فون بولتے ہیں۔"

"وہ تو مجھے پتا ہے مگر مواصلات کا نظام تو ڈسٹرب تھا۔ سگنل نہیں آ رہے تھے وہاں۔"

"اب کچھ کچھ آنے لگے ہیں' اور نہ بھی آئیں تو ڈونٹ یو وری آرمی کا رابطہ تو ہے۔ آپ مجھے بیس منٹ دیں۔ میں آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔"

وہ کہہ کر چلا گیا اور پریشے وہیں ٹائلز سے چمکتے کاریڈور میں دیوار سے ٹیک لگائے اضطراری کیفیت میں انگلیاں مروڑنے لگی۔

اس کے پر ہوتے تو وہ اڑ کر مظفر آباد جا پہنچتی۔ اسے ہر حال میں افق سے ملنا تھا' اسے دیکھنا تھا۔

"اف خدایا! میں کیوں چلی آئی وہاں سے؟"

وہ بے چینی سے وہیں کاریڈور میں ٹہلنے لگی۔ پتہ نہیں بیس منٹ کب گزریں گے اور وہ افق کی آواز سن سکے گی؟ اس کی روح پیاسی تھی' اس کی سماعتیں پیاسی تھیں۔

جانے اب دو ماہ بعد وہ کیسا ہو گا؟ ویسے ہی ہنستا ہو گا؟ ویسے ہی مسکراتے ہوئے اس کی شہد رنگ آنکھیں چھوٹی ہو جاتی ہوں گی؟

اس کا دل اتنی بے قراری سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔ جانے بیس منٹ پورے ہوئے بھی تھے یا نہیں' وہ مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے اور انتظار ہو ہی نہیں رہا تھا' سو وہ اسی کمرے کی طرف چلی گئی جہاں میجر نعمان گیا تھا۔

بے قراری اتنی زیادہ تھی کہ تہذیب کے قواعد کو بھلا کر بغیر دستک دیے اندر داخل ہو گئی۔

میجر نعمان ٹیبل پر رکھے فون کا ریسیور کان سے لگائے ٹیبل کے پیچھے کھڑا بات کر رہا تھا۔

جانے ڈیف کام تھا یا سیٹلائٹ فون یا عام فون!

"ہاں میں انہیں بلاتا ہوں' بلکہ وہ آ ہی گئی ہیں۔"

اس نے ہاتھ سے پریشے کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں چلتی ہوئی اس تک آئی تھی۔

"آپ نے کس انجینئر سے بات کرنی ہے؟" اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"افق...... افق ارسلان سے۔" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"ہاں افق ارسلان سے بات کراؤ۔" میجر نعمان نے ریسیور اس کی جانب بڑھا دیا اور ایک طرف سے نکل کر کمرے سے باہر چلا گیا اور اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔

کتنی ہی دیر وہ فون کا ریسیور ہاتھ میں لیے اسے دیکھتی رہی اسے افق سے کیا کہنا تھا' اسے معلوم نہیں تھا اور جانے وہ اس کا افق تھا بھی یا نہیں؟

اس نے ریسیور کان سے لگایا۔ وہ بولنا چاہتی تھی مگر سارے الفاظ لبوں پر دم توڑ گئے۔

دوسری جانب کوئی گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ پھر پریشے کی سماعتوں میں آواز گونجی۔

"پاری شے؟"

اور اس لمحے پوری کائنات رک گئی تھی۔

وہ اس آواز کو لاکھوں کے مجمع میں شناخت کر سکتی تھی۔ وہ آواز جو کسی نغمہ ساز کی دھن سے زیادہ مدھر اور خوب صورت تھی۔ وہ اسے پہچانتی تھی۔ وہ اس کا افق ارسلان ہی تھا۔ وہ پری کا کوہ پیما ہی تھا۔

اس کے پاؤں لڑکھڑانے کو تھے' اس نے بے اختیار

میز کا کونا مضبوطی سے تھام لیا۔

"پری؟ بولو نا پری۔ میں سن رہا ہوں۔"

اور وہ بے اختیار رو پڑی۔

"اف۔۔۔"

"کیسی ہو پری؟" وہ شاید اداسی سے مسکرایا تھا۔

"تم۔۔۔۔ تم کہاں ہو افق؟" وہ اسی طرح ریسیور کان سے لگائے' دوسرے ہاتھ سے میز کا کونا پکڑے کھڑی تھی۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر چہرے پر گرنے لگے تھے۔

"میں ہمالیہ کے آسمان کے نیچے ہوں۔"

تو ایک دفعہ پھر ہمالیہ کا آسمان دونوں کے بیچ آچکا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر ان پہاڑوں میں واپس آچکا تھا جہاں سے کھینچ کر وہ اسے واپس لائی تھی۔

"تم رو رہی ہو پری؟" وہ بے چین سا ہو گیا۔

اس نے جواب نہیں دیا' اسی طرح بے آواز روتی رہی۔

"پری مت روؤ۔ پلیز آنکھیں صاف کرو۔" وہ اس سے بہت دور تھا' مگر اس لمحے اسے خود سے بہت قریب محسوس ہوا تھا۔ اس نے میز کا کونا چھوڑ دیا اور اس ہاتھ کی پشت سے بھیگا چہرہ صاف کیا۔

"اب بتاؤ کیسی ہو؟" وہ جانے کیسے سمجھ چکا تھا کہ وہ آنکھیں صاف کر چکی ہے' سو نرمی سے پوچھنے لگا۔

"بہت تہی داماں ہوں میں افق! بہت ویران۔ اتنی ویرانیاں میرا مقدر کیوں بن گئی ہیں؟ میں کیوں خالی ہاتھ رہ گئی ہوں؟ میں نے تو وہ سب بھی کیا جو کسی لیلیٰ' کسی ہیر نے نہیں کیا ہو گا۔ سوہنی کا تو صرف گھڑا ٹوٹا تھا جبکہ میرا تو سب کچھ دومانی کی دھند میں ٹوٹ کر بکھر گیا' پھر بھی منزل نہیں ملی؟ میں نے تو۔۔۔۔ میں نے تو عشق میں برف کا صحرا پار کیا تھا' پھر بھی ساری ریاضتیں رائیگاں چلی گئیں؟" وہ پھر سے رونے لگی تھی۔ "تم۔۔۔۔ تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے افق؟"

"تم ہی نے تو کہا تھا۔" وہ بہت آہستہ سے بولا۔

"میں نے کہا تھا؟"

"ہاں' تم نے ہی تو عہد لیا تھا' بروکا گلیشئر' ہاراموش پر آتا ایوالانچ اور دومانی کی دھند اس عہد کی گواہ تھی۔ تمہیں یاد نہیں؟"

"میں نے عہد لیا تھا؟ میں نے کہا تھا؟ میں نے تو اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ میں نے تو۔۔۔۔ میں نے تو آبشار پر تمہیں جوتے اتارنے کو بھی کہا تھا' تم نے اتارے تھے؟ میں نے تو کیمپ ٹو سے واپس چلنے کو بھی کہا تھا' تم نے میری بات مانی تھی؟ صرف وہی بات ماننا کیوں یاد رہا تمہیں؟ تم کیوں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر؟ میں ہسپتال میں جاگی تو میں اکیلی تھی۔ آج پھر میں اکیلی ہوں۔ تم۔۔۔۔ تم نہیں رکے میرے لیے' تم نے میرے ہوش میں آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور چلے گئے؟"

کافی دیر خاموشی چھائی رہی' پھر وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

"میں نے اپنی خوشی سے وہ وعدہ نہیں نبھایا تھا۔"

"خوشی نہیں تھی تو نہ نبھاتے۔ ایک دفعہ تو کہتے کہ میں تمہارے لیے لڑوں گا' ایک دفعہ تو احتجاج کرتے' نہ مانتے میری بات! ایک دفعہ تو کہتے کہ تم غلط ہو!"

"تمہیں اب لگتا ہے کہ تم غلط تھیں؟ تم نے تو کہا تھا تم رہ لو گی۔"

"ہاں' کہا تھا۔"

"پھر؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"پھر؟ پھر نہیں رہ سکی۔" آنسو اس کی گردن پر پھسل رہے تھے۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ دونوں کے بیچ حائل ہو گیا۔

"پری!" چند لمحے سرکے تو افق نے اسے پکارا۔

وہ جواب میں لب سیے اسی طرح روتی رہی۔

"پری! میں رکنا چاہتا تھا' مگر تم نے مجھے جانے کے لیے صرف اور صرف اپنے پاپا کی وجہ سے کہا تھا۔ میں تمہارے لیے اپنے باپ سے بڑھ کر مقدم نہیں ہو سکتا تھا' نہ مجھے ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے میں چلا گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہسپتال میں جب تم جاگو اور مجھے دیکھو تو تمہارے سمجھوتے کی کچی ڈور ٹوٹ جائے۔"

"ہاں۔۔۔۔ تم کیوں رکتے؟ تم کیوں میرا انتظار کرتے؟ میں۔۔۔۔ میں تمہارے لیے ہمالیہ کے طوفان سے لڑی تھی مگر تم کیوں میرے لیے لڑتے؟ تم نے۔۔۔۔ تم نے افق! محبت کی ہوتی تو تم رکتے۔" وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ پچھلے دو مہینوں کا کرب آج باہر کو بہہ رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ جیسے زخمی دل کے ساتھ مسکرایا۔ "صحیح کہتی ہو' میں نے واقعی محبت نہیں کی تھی۔ میں محبت کر ہی نہیں سکا۔ حالانکہ کوشش بہت کی تھی کہ صرف محبت کروں مگر میں نے تم سے محبت نہیں کی تھی پری! میں نے تو تم سے عشق کیا تھا۔ محبت کی ہوتی تو شاید تمہیں اپنے باپ سے بغاوت کرنے پر مجبور کر دیتا۔ محبت کی ہوتی تو شاید رہ لیتا' محبت کی ہوتی تو شاید اب واپس نہ آتا' مگر میں نے محبت ہی تو نہیں کی تھی۔"

اس کے آنسو بہنا رک گئے تھے' فضا بالکل خاموش تھی۔ ساری کائنات ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کمرے کی ہر شے رک کر' ٹھہر کر بہت دھیان سے اسے سن رہی تھی جو کہہ رہا تھا کہ اس نے محبت نہیں کی تھی' اس نے عشق کیا تھا۔

"افق۔۔۔!" وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔ آنسو پھر سے ابل پڑے۔

"پری۔۔۔۔! تمہارے پاپا۔"

"وہ۔۔۔۔ وہ نہیں رہے۔ وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔" دل میں درد کی ٹیسیں پھر سے اٹھیں۔

"میں جانتا ہوں۔"

وہ چونکی۔ "تم کیسے جانتے ہو؟"

"وہ بہت مشہور آدمی تھے' تم نے ایک دفعہ ان کا پورا نام بتایا تھا' ان کے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھی تھی۔ ان دو ماہ میں نے کمرے میں بند رہ کر یہی اخبار پڑھنے والا کام ہی تو کیا ہے۔" پھر وہ ذرا دیر کو ٹھہر کر بولا۔ "میں تم سے ان کا افسوس بھی نہیں کر سکا' میرے پاس تمہارا کوئی نمبر نہیں تھا' نہ ہی کوئی تعلق رہا تھا۔"

"تعلق؟ تعلق تو تھا افق!"

اس نے گہری سانس اندر کو کھینچی۔ "ہاں وہ تعلق تو دنیا کے تخلیق ہونے سے بھی قبل بنا تھا' اب تو اس کے مٹنے کے بعد ہی ختم ہو گا۔"

وہ چپ چاپ آنسو صاف کرنے لگی۔ اس کے دل کا بوجھ پہلے سے بہت ہلکا ہو گیا تھا۔

"پری!" کچھ دیر بعد افق نے اسے پکارا۔ "میں آجاؤں؟"

"کیا تمہیں اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ اب کھل کر مسکرایا تھا۔ "پھر میں کل آرہا ہوں۔ مجھے ویسے بھی تمہارا پتھر دینا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میجر نعمان نے بتایا تھا کہ وہ پتھر' بلکہ جیم اسٹون تمہارے پاس ہے۔" وہ اب خود کو سنبھال چکی تھی۔ میز کا کونا اس نے چھوڑ دیا تھا۔

"جیم اسٹون؟" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "اتنے اچھے فوجی اگر دھوکہ کھا ہی گئے ہیں تو تم انہیں یہ مت بتانا کہ یہ پتھر ایک ڈھائی سو روپے کے کیچو پر لگا تھا اور قیمتی نہیں تھا۔"

"نہیں' میں کیوں بتاؤں گی؟ میرے لیے تو وہ ویسا ہی قیمتی ہے جیسے وہ تصویر تھی۔"

"میجر عاصم نے دے دی تھی وہ؟"

"ہاں' مجھے مل گئی تھی۔ مجھے وہ گیت بہت اچھا لگتا تھا جو تم نے تین ماہ پہلے مجھے وائیٹ پیلس کی بالکونی میں کھڑے ہو کر سنایا تھا۔" وہ سر جھکائے میز کا کونا کھرچ رہی تھی۔

"پھر میں کل آرہا ہوں اور اب رونا نہیں ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" اس نے پھر سے آنکھیں رگڑیں۔ "نہیں روؤں گی۔" میز کی چمکتی سطح پر اسے اپنا رویا رویا' متورم چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

"افق۔۔۔! تم نے آخری دفعہ ہسپتال میں میرے کان میں کیا کہا تھا؟" اچانک یاد آنے پر اس نے پوچھا۔

"وہی جو اس تصویر پر لکھا تھا۔"

"اچھا۔" وہ دھیرے سے ہنس دی۔ پھر کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی "سنو۔"

"ہوں۔۔۔۔ بولو۔"

"تم کل کدھر آؤ گے؟"
"ہمز اسلام آباد۔"
"نہیں وہاں مت آنا۔" وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔
"وہ کیوں؟" وہ حیران ہوا تھا۔
"افق! تمہیں یاد ہے وہ وقت، آج سے تین ماہ اور تین دن پہلے، جب مارگلہ کی پہاڑیوں پر بیچ سڑک پہ مجھے ایک شہزادہ ملا تھا۔"
"اور جب بیچ سڑک پر شہزادے کو ایک پری ملی تھی؟" وہ مسکرایا۔
"ہاں، تمہیں یاد ہے اس روز مارگلہ کی پہاڑیوں پر بادل اترے تھے اور میں سڑک کے کنارے اس سفید پتھر پر بیٹھی تھی جب تم گھوڑا دوڑاتے ہوئے سڑک کی اونچائی سے نیچے آئے تھے۔ تمہیں وہ بادل، سڑک کی وہ اونچائی اور وہ سفید پتھر یاد ہے؟"
"میں کچھ بھولا ہی کب ہوں؟"
"میں چاہتی ہوں کہ تم کل اسی وقت سہ پہر کے تین بجے مجھے وہیں ملو۔ میں اسی پتھر پر بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گی۔ تم اسی طرح گھوڑا دوڑاتے ہوئے میرے قریب آکر مجھے پکار کر کہنا کہ "کیا تم میری تصویر اتار سکتی ہو؟" پھر میں تمہارے کیمرے سے تمہاری تصویر لوں گی۔ تب تم کہنا کہ تم بیس سال بعد ایک سفرنامہ لکھو گے اور اس کے فرنٹ پیج پر یہی تصویر لگاؤ گے اور اس کا کیپشن ہو گا "اس کوہ پیما کی تصویر، جو اب کبھی پہاڑوں میں نہیں جائے گا۔" پھر..... پھر افق..... پھر ہم تصور کریں گے کہ ہم کائنات بننے کے بعد پہلی دفعہ ان پہاڑیوں پر مل رہے ہیں ہم تصور کریں گے کہ بیچ کے یہ تین ماہ ہماری زندگیوں میں جیسے کبھی آئے ہی نہیں تھے۔"
"تم کبھی نہیں بدلو گی پریشے جہانزیب! تم ہمیشہ عام چیزوں میں بھی خوب صورتی تلاشتی رہو گی۔" وہ اس کے خوب صورت تخیل پر ہنس دیا۔
"تم بھی تو یہی کرتے ہو، خیر، میں دعا کروں گی کہ کل بھی مارگلہ کی پہاڑیوں پر ایسے ہی بادل اتریں جیسے تین ماہ اور تین دن قبل اترے تھے۔"
"اور میں دعا کروں گا کہ مجھے میری پری اسی طرح سفید اور گلابی رنگوں میں ملے۔ تم کل وہی جوگرز اور وہی کپڑے پہننا جو اس روز پہنے تھے۔"
پریشے نے سر جھکا کر اپنے جوگرز کو دیکھا جو اب بدرنگے ہو چکے تھے۔ کیا وہ یہی پہن کر افق سے ملنے جائے گی؟ نہیں، وہ نئے خرید لے گی، افق کو کون سا ان کا ڈیزائن یاد رہنا ہے۔ مردوں کو ایسی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں بھلا؟
"ٹھیک ہے، اور تم بھی وہی جیکٹ پہننا۔" پھر دونوں ایک لمحے کو خاموش ہوئے، دونوں نے کچھ سوچا اور پھر اکٹھے ہی بولے۔
"اور تم وہی والا ....." مگر کچھ یاد آنے پر دونوں دوبارہ سے خاموش ہو گئے۔ چونکہ اکٹھے بولے تھے، سو دوسرے کی بات نہیں سن سکے تھے۔
"خیر اب تمہارے ماموں تمہارے گارڈین ہیں۔ پھر کل ان کے پاس چلیں گے، ٹھیک؟"
وہ پچھلی بات میں گم تھی، بے دھیانی سے بولی "وہ کیوں؟"
"تمہیں ٹام کروز نے پرپوز کیا تھا نا، سو اس کا پروپوزل پہنچانے آؤں گا میں۔"
وہ ہنس دی۔ "ہاں، اچھا آدمی ہے۔ میں کر لوں گی اس سے شادی۔"
"ہاں مگر مجھے قتل کر کے ہی اس سے ہی شادی کرنا۔" وہ جل کر بولا، اور پھر خود بھی ہنس دیا۔
"اچھا اب میں فوج کا مزید خرچا کرانے کے بجائے فون بند کر رہی ہوں۔ کل سہ پہر تین بجے یاد رکھنا۔"

"مجھے یاد ہے۔ میں ارتھ کوئیک ریلیف ایکٹیویٹیز کے لیے آیا تھا، مگر کل کے لیے وقت نکال لوں گا۔ میرے لیے سب سے اہم کام تم ہو۔ مجھے یاد ہے۔ راکاپوشی کی برف میں تمہارے آنسو گرے تھے، مجھے وہ آنسو تمہیں لوٹانے ہیں۔ میں ضرور آؤں گا۔"
اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

آج کتنے دنوں بعد وہ پرسکون تھی۔
اس نے آنکھیں میچ کر ایک طمانیت بھری سانس لی اور پھر آنکھیں کھول دیں۔
وہ کمرہ کتنی خوب صورتی سے آراستہ تھا، کھڑکی سے باہر نظر آتا پودا کتنا سرسبز تھا، اور فضا کتنی خوشبودار تھی۔
وہ باہر نکل آئی۔
میجر نعمان اسے تھوڑی دیر بعد مل گیا تھا۔
"ہو گئی بات؟ اب خوش ہیں؟"
پریشے نے بچوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔
"چلیں، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" وہ سمجھ چکا تھا کہ معاملہ محض پتھر کا نہیں تھا۔
وہ اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چلی آئی۔
آج اسے بہت سارے کام کرنے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ پورا گھنٹہ مظفر آباد کی مسمار دکانوں کے قریب متلاشی نگاہوں سے کچھ کھوجتا رہا تھا، مگر اس کی مطلوبہ شے اسے مل کے ہی نہیں دے رہی تھی۔
جانے کب وہ مایوس سا چلتا چلتا ہائی کورٹ لانز تک آگیا۔
ہائی کورٹ لانز میں بھی خیمہ بستی نصب تھی۔ وہاں ایک جگہ گھاس پر بے تحاشا گرم کپڑوں، سوئیٹروں، ٹوپیوں اور موزوں وغیرہ کا ڈھیر لگا تھا۔ ارد گرد چند لوگ پھر رہے تھے مگر امداد کے کپڑوں کے ڈھیر سے کوئی کچھ نہیں اٹھا رہا تھا، پھر بھی اس نے متلاشی نگاہوں سے اس ڈھیر کو دیکھا لیکن اس کی مطلوبہ چیز وہاں بھی نہیں تھی۔
وہ مایوسی سے پلٹنے ہی لگا تھا جب اسے دور ایک درخت کے تنے کے ساتھ ایک کم عمر لڑکی سر جھکائے بیٹھی دکھائی دی جس کے سر پر ہاتھ سے بنا ہیٹ تھا۔
اس کی مراد بر آئی تھی۔
وہ اسی طرح جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس تک آیا۔
"بات سنو۔" اس کے بالکل سامنے جا کر افق نے اسے مخاطب کیا۔
لڑکی نے گردن اوپر اٹھائی۔ اس کے بال بھورے اور رخسار سیبوں کی طرح سرخ تھے۔ اس کا رف سا حلیہ دیکھ کر افق کو قدرے تذبذب ہوا۔
"تم انگریزی سمجھتی ہو؟"
"ہاں، میں یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ ہوں بلکہ تھی۔" دھوپ سے سرخ ہوتے چہرے پر سوگواریت بکھر گئی۔ "اب کہاں کی یونیورسٹی اور کہاں کی انگریزی۔ سب کچھ تو راکھ ہو گیا۔ خیر تم بتاؤ، تمہیں کچھ چاہیے؟"

"ہاں، مجھے تمہارا ہیٹ چاہیے۔" وہ اسی طرح اس کے سامنے کھڑا گردن جھکائے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور لڑکی ویسے ہی درخت سے ٹیک لگائے سر اٹھائے اسے تک رہی تھی۔
"میرا ہیٹ؟" اس نے اپنی سبز آنکھیں حیرت سے سکیڑیں۔ "اس بدرنگ، پرانے ہیٹ کا کیا کرو گے؟"

"مجھے کسی کو گفٹ کرنے کے لیے ہیٹ چاہیے، مگر مظفر آباد میں مجھے تمہارے ہیٹ کے سوا کوئی دوسرا ہیٹ نہیں دکھائی دیا۔"
"یہ تو بہت پرانا ہیٹ ہے، شاید تین سال قبل میں نے بنایا تھا۔" لڑکی ہیٹ سر سے اتار کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔
"اوہ یعنی تم ہیٹ بنا سکتی ہو؟ بلاشبہ یہ ایک مشکل کام ہے۔"
"ہے تو، مگر میری پھپھی نے مجھے یہ سکھایا تھا۔ خیر تمہیں ہیٹ چاہیے؟ میرے گھر میں شاید کوئی رکھا ہو۔" اس نے اسے دوبارہ سر پر پہن لیا۔
"ہاں، سادہ سا ہو، اور اوپر ایک ادھ کھلا سرخ گلاب ضرور لگانا جس کی پتیاں کنارے سے سیاہ ہو کر مرجھا گئی ہوں۔"

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ "باسی گلاب کا کیا فائدہ؟"

"میں تمہیں یہ بات نہیں سمجھا سکتا، مگر جسے دینا ہے، اسے باسی گلاب اچھا لگے گا۔"

وہ فون پر اسے یہی ہیٹ پہن کر آنے کو کہنا چاہتا تھا، مگر تب اسے یاد آیا تھا کہ وہ ہیٹ تو ماہوڈھنڈ کے پانی پر تیرتا بہت دن پہلے اشو میں گر چکا تھا۔ ان دونوں نے عشق میں بہت کچھ کھویا تھا، اب اسے پریشے کے حصے کی چیز اسے لوٹانی تھی۔

"تو تم نے اسے وہ ہیٹ کب دینا ہے؟" لڑکی نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ جینز، سوئیٹر، سر پر پی کیپ پہنے، جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اونچا لمبا سادہ وجیہہ غیر ملکی اسے خاصا دلچسپ لگا تھا۔

"کل سہ پہر۔"

"تو پھر میں صبح تازہ گلاب ہی لگادوں گی، سہ پہر تک تو وہ مرجھا جائے گا۔ میں صبح روشنی ہونے کے بعد گلاب توڑوں گی، ایسے وہ جلدی مرجھاتے ہیں، منہ اندھیرے توڑو تو دیر تک فریش رہتے ہیں۔"

"واہ! تم تو بہت عقل مند لڑکی ہو۔" شہد رنگ آنکھوں میں ستائش اتر آئی۔ "خیر مجھے کل صبح سویرے وہ ہیٹ نیلم اسٹیڈیم میں لادینا، وہاں جو آرمی کیمپ کا آخری کونے والا سبز خیمہ ہے نا، وہ میرا ہے۔ وہاں آجانا، ویسے کتنے پیسے لوگی ہیٹ کے؟"

لڑکی بہت دکھ سے مسکرائی۔ "تم کہاں سے آئے ہو؟"

"ترکی سے۔"

"کیا ڈاکٹر ہو؟"

"نہیں، انجینئر ہوں۔"

"پھر تم صرف میرے پہاڑوں میں بسنے والے لوگوں کی مدد کرو، وہ ہیٹ میری طرف سے میرے پاکستان آنے والے ترک انجینئر کے لیے ایک تحفہ ہو گا۔ تمہیں شام میں ہی لادوں گی۔"

"نہیں، ابھی تو ہم کچھ لوگ دور ریموٹ ایریاز امداد لے کر جارہے ہیں، شام تک تو شاید واپس آئیں۔ تم صبح آجانا اور تحفے کا شکریہ۔" وہ کہہ کر پلٹنے لگا۔

"سنو، تم نے وہ ہیٹ دینا کسے ہے؟" لڑکی کی آواز میں تجسس تھا۔

افق نے ایک لمحے کو مڑ کر دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے شانے جھٹکے۔ "تمہیں کیوں بتاؤں؟"

کتنے مہینوں بعد آج وہ کھل کر مسکرایا تھا۔ پھر مزید کچھ کہے بنا وہ وہاں سے چلا آیا۔

اس کے دوست اس کا انتظار کر رہے ہوں گے، ان سب نے ابھی آگے پہاڑوں میں جانا تھا، یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنے قدم تیز کردیے۔

☼ ☼ ☼

"آپ کے باس اندر ہیں؟" وہ سی ایم ایچ سے سیدھی ماموں کے آفس گئی تھی اور اب ان کے کمرے کے باہر ایک لمحے کو رک کر ان کی سیکریٹری سے استفسار کر رہی تھی۔

"جی مگر ابھی وہ دبئی کے لیے نکلنے ہی والے ہیں، آپ کچھ دن....."

وہ اَن سنی کرتی دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ دروازے کی سیدھ میں کافی دور آبنوسی میز کے پیچھے ماموں اپنی ایگزیکٹو چیئر پر بیٹھے، ٹیبل ٹاپ پر رکھی فائل پہ جھکے کچھ لکھ رہے تھے، آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا، پھر مشفقانہ انداز میں مسکرائے۔

"آؤ بیٹا!" انہوں نے فائل ایک طرف ڈال دی۔

"آج آفس میں؟ خیریت؟"

"جی بس، ایک بات کرنی تھی۔" وہ طویل کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں کہو، ویسے اچھے ٹائم پہ آئی ہو، میں ابھی فلائٹ کے لیے نکل ہی رہا تھا۔ خیر کیا پیو گی؟ چائے؟ کافی؟"

"نہیں رہنے دیں۔ مجھے بس بات کرنی تھی۔"

"چلو بتاؤ، کون سی اتنی ضروری بات تھی۔" وہ اپنا سارا کام چھوڑ کر بہت دھیان سے اس کی طرف متوجہ تھے۔

پریشے نے بمشکل تھوک نگلا۔ ہمت کر کے آتو گئی تھی، مگر اب بات کیسے کرے؟ شاید اسے مامی سے پہلے بات کرنی چاہیے تھی، یوں براہ راست ماموں سے بات کرنا مناسب نہ تھا، لیکن انہیں آج چلے جانا تھا اور پھر ہفتے بعد ان کی واپسی تھی۔ وہ اب اور انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

"وہ..... ماموں....! میں دراصل۔" وہ رکی، قدرے ہچکچائی اور پھر انگلی سے انگوٹھی نکال کر سامنے میز کی چمکتی سطح پر رکھ دی۔

"آپ یہ پھپھو کو واپس کردیں۔"

نظریں گود میں دھرے ہاتھوں پر جمائے وہ آہستہ سے بولی۔ اس میں اس وقت نگاہ اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ اور افق بعض معاملات میں بہت بہادر اور بعض میں بہت بزدل تھے۔

کچھ دیر تک ماموں کچھ نہ بولے تو اس نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا۔

وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

"آپ کو مجھ پر غصہ نہیں آیا کہ میں نے پاپا کی خواہش کیوں پوری نہیں کی؟"

"خواہشات زندگی تک ہوتی ہیں۔ جو چلے جاتے ہیں، ان کو خواہشات کے پورا ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ عموماً" ہم لوگ دوسروں کی زندگیوں میں ان کو دکھ دیتے ہیں اور ان کی موت کے بعد ان کے لیے تسبیحات پڑھتے ہیں۔ تم نے پری! اپنے پاپا کی زندگی میں کبھی ان کی نافرمانی نہیں کی۔ ان کی ہر بات پر سر جھکایا، ہر حکم کی تعمیل کی۔ تمہارے پاپا تم سے راضی اس دنیا سے گئے ہیں۔ تمہاری شادی جس سے بھی ہو، اب ان کو فرق نہیں پڑے گا۔ انہیں صرف اس بات سے فرق پڑے گا کہ تم خوش ہو یا نہیں؟"

"آپ لوگ بھی اس رشتے سے ناخوش تھے نا؟"

ماموں کی باتوں سے اس کا ازلی اعتماد لوٹنے لگا۔

"ہم قطعاً" خوش نہیں تھے، مگر اس میں جہانزیب کا قصور نہیں تھا۔ بھانجے بھتیجے سب ہی کو پیارے ہوتے ہیں۔ نشاء کی منگنی بھی تو میں نے تمہارے مامی کے بھتیجے سے کی ہوئی ہے۔ اپنے خون کے باعث انسان جانتے بوجھتے ہوئے بہت کچھ نظر انداز کردیتا ہے۔"

"پھر بھی آپ نے پاپا کی ڈیتھ کے بعد یہ رشتہ ختم کرنے کا نہیں سوچا؟"

"میں کئی دنوں سے تمہارے منہ سے یہ سب سننے کا منتظر تھا۔ آج میرا انتظار ختم ہو گیا ہے۔" وہ بزرگانہ شفقت سے مسکرائے۔

"آپ یہ پھوپھو کو..... میرا مطلب ہے کس بنیاد پر...."

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"وہ میرا مسئلہ ہے۔"

"لیکن پھر بھی، وہ بہت شور مچائیں گی۔" وہ واقعتاً" پریشان تھی۔

"بیٹا! میری بھی تو کوئی بات ہوتی ہے نا؟ اگر اتنا حوصلہ کر کے، مجھ پر اعتماد کر کے یہ سب کہا ہے تو جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں سنبھال لوں گا تو تمہیں اس بارے میں سوچ کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے تشکر سے مسکراتے ہوئے سر ہلادیا۔

"تھینک یو ماموں! میں چلتی ہوں۔" پھر وہ گھڑی دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی، پھر جاتے جاتے پلٹی۔ "آپ پھپھو سے کب بات کریں گے؟"

"دبئی سے واپسی پر۔"

"اچھا۔" وہ جانے کے لیے مڑی۔

"پری بیٹا!"

وہ دروازے کے قریب تھی جب انہوں نے اسے پکارا۔ وہ دروازے کی ناب پر ہاتھ دھرے واپس مڑی۔

"جی ماموں؟"

"بیٹا! اپنے پاپا کے بارے میں کبھی بدگمان نہ ہونا۔ اپنے بھانجوں سے ہر بیٹی کے باپ کو بہت امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اگر تمہیں لگتا ہے کہ راکاپوشی جانے کی اجازت نہ ملنے پر تمہاری ناخوشی محسوس کر

کے تمہارے لیے لاکھوں روپیہ خرچ کردینے والا باپ، زندگی کے سب سے اہم معاملے پر سنگدل بن جاتا ہے تو تم غلط ہو۔ اسے اندازہ تھا کہ تم ناخوش ہو مگر اسے اپنا بھانجا اتنا پیارا تھا کہ اس کے خیال میں سیف سے شادی کرا کے وہ تمہیں زندگی کی تمام خوشیاں دے رہا تھا۔ تمہارے پاپا کی سوچ ہر مشرقی باپ کی طرح یہی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کا برا بھلا زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہے۔ وہ ایک بہترین باپ تھا، اس نے ہر حال میں تمہارے لیے بہترین ہی سوچا تھا۔"

وہ اداسی سے مسکرادی۔

"آئی نو ماموں! میں پاپا سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ شاید میں سیف سے شادی کر بھی لیتی مگر...... بس دل نہیں مانتا۔" وہ اس سے آگے کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھی مگر رک گئی۔ یہ بات اسے ماموں کی واپسی پر کرنی تھی۔

"خدا حافظ ماموں!"

وہ وہاں سے چلی آئی۔ اب اس کا رخ مارکیٹ کی طرف تھا۔

جناح سپر میں ایک ایسی شاپ تھی جہاں سے اکثر وہ غیر ملکی نوادرات خریدتی رہتی تھی۔

"مجھے ترکی کا جھنڈا چاہیے۔"

اس شاپ میں آکر اس نے سیلز مین سے کہا۔

افق کو فون پر وہ وہی مفلر پہن کر آنے کی تاکید کرنے لگی تھی مگر تب اسے یاد آیا تھا کہ وہ مفلر تو بہت اوپر دا کا پوشی کی برف میں آنے والی کئی صدیوں کے لیے دفن ہو چکا تھا۔

اب اسے ویسا ہی ایک مفلر، افق ارسلان کو گفٹ کرنا تھا۔

"ترکی کا جھنڈا تو نہیں ہے۔" سیلز مین نے چند منٹ بعد بتایا۔

"اچھا۔" اسے مایوسی ہوئی۔ "لیکن آپ منگوا کر تو دے سکتے ہیں نا؟ مجھے کل صبح تک چاہیے۔"

"کل تک؟" سیلز مین سوچ میں پڑ گیا۔

"میں دس گنا اوپر قیمت دے دوں گی مگر مجھے ہر حال میں ترکی کا جھنڈا کل تک چاہیے۔" اس کا انداز دو ٹوک تھا۔

"جی جی...... شیور کل صبح آپ اٹھا لیجیے گا۔"

وہاں سے وہ جوتوں کی دکان تک آئی۔ اپنے پرانے جوگرز سے ملتے جلتے سفید اور گلابی رنگوں والے جوگرز خریدے۔ اب اسے اسپتال جا کر استعفیٰ دینا تھا۔ کل سے وہ ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہی تھی۔ نئی زندگی، جس سے اس کو گزرے ہوئے تین ماہ اور پہاڑوں کو مائنس کرنا تھا۔

سامان گاڑی میں رکھ کر اس نے اوپر آسمان کو دیکھا۔ اب نیلی چادر میں جگہ جگہ سفیدی جھانک رہی تھی۔ سیاہ بادلوں کا جھنڈ ابھی اسلام آباد سے کافی دور تھا۔ کاش وہ بادل کل اسی جگہ اور اسی وقت مارگلہ کی پہاڑیوں پر اتریں جب وہ افق سے ملنے جائے!

ٹھنڈی ہوا اس کے مخالف سمت سے چلی اس کے بال بار بار چہرے پر بکھر رہی تھی۔ اس نے گاڑی میں بیٹھنے سے قبل، چند لمحوں کے لیے، آنکھیں موند کر ہوا کی خوشبو سونگھی، اور درختوں پر پھدکتی چڑیوں کی سرگوشیاں اور قدموں تلے بولتے پتھروں کی باتیں سنیں، اور پھر، آنے والے دن کی خوشیوں کا تصور کرتے ہوئے وہ آنکھیں کھول کر گاڑی میں بیٹھنے ہی لگی تھی کہ دور کہیں سے اڑ کر آتے دو کوؤں نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر اپنی چونچیں ماریں۔ اس کے لبوں سے کراہ نکلی۔ دوسرے ہی پل وہ آسمان پر اڑتے چلے گئے۔

"وہ سر کا پچھلا حصہ سہلاتے ہوئے خوفزدہ نگاہوں سے افق پر غائب ہوتے ان کوؤں کا تعاقب کرتی رہی۔

کیا پھر کوئی بری خبر اس کی منتظر تھی یا وہ ضرورت سے زیادہ توہم پرست ہو چکی تھی؟

وہ سر جھٹک کر کار میں بیٹھ تو گئی مگر اب ان دونوں کوؤں کو ذہن سے جھٹکنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب اتنی اچانک کیسے ہو گیا؟" خیمے میں رکھی چوتھی کرسی کھینچتے ہوئے جینک نے بے حد حیرت سے پوچھا۔

باقی تین کرسیوں پر افق، کینن اور احمت بیٹھے تھے۔

"میں نے اسے کانٹیکٹ کیا اور کل میں اسے ملنے جا رہا ہوں، دیٹس اٹ۔" وہ بظاہر لاپروائی سے بولا مگر لبوں پر بکھری آسودہ مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔

"تم خوش قسمت ہو۔ ایک مجھے دیکھو۔ منگنی سے دو دن پہلے کال آگئی کہ کشمیر جانا ہے۔" جینک نے مصنوعی تاسف سے سر جھٹکا۔ اس کی منگنی ملتوی ہو چکی تھی اور اس نے خود ہی کی تھی۔ یہ وہی تھا جو ان سب کو وہاں لایا تھا۔

"پھر تم ہمارے ساتھ ان ریموٹ ایریاز میں نہ ہی جاؤ تو بہتر ہے۔" احمت نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سنجیدگی سے کہا۔ "دیکھو، وہاں ہمیں ملبے تلے دبے لوگ نکالنے ہیں۔ تمام عمارتیں آدھی کھڑی ہوں گی اور اگر ریسکیو ورک کے دوران کسی آفٹر شاک سے پوری کی پوری عمارت تمہارے اوپر گر گئی تو ہم ڈاکٹر پریشے کو کیا جواب دیں گے؟"

"احمت! بندے کی شکل اچھی نہ ہو تو بات تو اچھی کر لینی چاہیے۔" افق نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"میری شکل بہت اچھی ہے۔ آنے کہتی ہے، مجھ سے زیادہ خوب صورت بچہ اس نے ترکی میں نہیں دیکھا تھا۔"

"ہر ماں یہی کہتی ہے۔ میری ماں بھی یہی کہتی تھی، اصل اوقات تو یونیورسٹی کی لڑکیوں نے بتائی تھی۔" کینن ہنس کر بولا۔

"چلو، ہم جا رہے ہیں۔ تم نے چلنا ہے؟" جینک سامان بیگ میں بند کر رہا تھا۔

"آف کورس۔ تمہیں کیا بھول گیا ہے کہ میں اور تم ہمیشہ ہر جگہ اکٹھے جاتے ہیں۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں، لیکن تمہیں کل اسلام آباد جانا ہے۔ وہ علاقہ دور ہے، شاید تمہاری صبح تک واپسی نہ ہو سکے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر دیر ہو گئی تو...... تو میں کل کے بجائے پرسوں چلا جاؤں گا، لیکن ہمیں ساتھ ہی جانا ہے۔ یاد ہے، ہمارا موٹو تھا کہ افق اور جینک جنت میں بھی اکٹھے ہی جائیں گے۔" وہ ہنس کر کہتے ہوئے اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

بات صرف جینک کے ساتھ جانے کی نہیں تھی، اس کا دل اندر ہی اندر ان لوگوں کا سوچ کر تڑپ رہا تھا جو اتنے دن گزرنے کے بعد بھی ملبے تلے دبے تھے۔ آج انہوں نے مظفر آباد سے چند لوگوں کو زندہ نکال لیا تھا، سو اسے امید تھی کہ وہاں کچھ جانیں تو ہوں گی جنہیں وہ ظالم پتھروں سے نکال سکیں گے۔

ان کے گروپ میں کراچی یونیورسٹی کے کچھ اسٹوڈنٹس، چند جوان، اور وہ چاروں ترک تھے۔ ہیلی کاپٹر نے انہیں دو پہاڑ دور ایک جگہ اتارا تھا جہاں سے چھ گھنٹے پیدل سفر کر کے وہ اس بستی میں پہنچے تھے جہاں 8 اکتوبر کے بعد کوئی نہیں آیا تھا۔

وہ چھوٹا سا گاؤں نما قصبہ تھا، جس تک پہنچنے کے زمینی راستے لینڈ سلائیڈنگ کے باعث مسدود ہو چکے تھے۔ ہر سو عمارتوں کا ملبہ بکھرا تھا۔ کیا گھر اور کیا اسکول، سب منہدم ہو چکا تھا۔

وہ ایک بڑی عمارت تھی جو آدھی منہدم ہو چکی تھی اور باقی آدھی سلامت کھڑی تھی۔ 8 اکتوبر کے بعد شاید کوئی شخص اس کے قریب نہیں پھٹکا تھا، وجہ اس کا آدھا کھڑا حصہ تھا جو اتنا کمزور تھا کہ محض ایک آفٹر شاک ہی اسے زمین بوس کرنے کو کافی تھا۔

"یہ اتنی بڑی عمارت ہے۔ غالباً گورنمنٹ کا کوئی ادارہ ہے۔ یقیناً اندر بہت سے لوگ ہوں گے اور ہو سکتا ہے کچھ زندہ بھی ہوں۔"

افق کے پیچھے جب کوئی بھی اس عمارت میں داخل

نہ ہوا تو وہ باہر نکل کر ان تمام لوگوں سے کہنے لگا۔

"اتنے دن بعد تو شاید ہی کوئی زندہ ہو۔" ایک لمبے لڑکے نے مایوسی سے کہا۔

"مگر آج انہوں نے مظفر آباد سے کچھ لوگ نکالے ہیں۔ اس لیے میں اندر جا رہا ہوں' کسی نے آنا ہے تو آئے' اور جو آفٹر شاک کے ڈر سے باہر رکنا چاہتا ہے' وہ رک جائے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ دو ٹوک انداز میں کہہ کر اپنے آلات لیے اندر داخل ہوا۔ فوجیوں اور ترکوں نے اس کی تقلید کی۔

وہاں ہر طرف ملبہ بکھرا تھا۔ شاید کوئی اسکول تھا جس کے آدھے سے زیادہ کمرے منہدم ہو چکے تھے' کچھ کی چھتیں بھی آدھی گر چکی تھیں۔

جس کمرے میں وہ داخل ہوا' اس کی چھت آدھی سے زیادہ زمین بوس ہو چکی تھی۔ وہ اور ایک جوان زمین پر بکھرے پتھر اٹھانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اسے بڑے بڑے پتھروں اور سریے کے ٹکڑوں کے درمیان چند کاغذ دکھائی دیے۔ اس نے جھک کر وہ کاغذ اٹھائے اور انہیں آنکھوں کے قریب لایا۔ ان پر اردو میں کچھ لکھا تھا۔

"یہ دیکھو' کیا لکھا ہے؟" افق نے سامنے موجود جوان کی جانب وہ کاغذ بڑھایا جس نے ٹارچ اس پر کرتے ہوئے پڑھنا شروع کیا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یہاں بہت اندھیرا ہے۔ کلاس کے سارے بچے بہت چیخ رہے ہیں۔ مجھے بھی رونا آ رہا ہے مگر میں روؤں گی نہیں۔ مجھے پتہ ہے' ابھی کوئی مجھے بچانے آ جائے گا۔ ابھی ابو آ جائیں گے۔ وہ یہ ڈیسک ہٹا دیں گے جو میرے اوپر گرا پڑا ہے۔"

کچھ سطور چھوڑ کر لکھا تھا۔

"میری ٹانگ میں بہت درد ہو رہا ہے۔ کچھ نظر بھی نہیں آ رہا۔ یہاں بہت ڈراؤنا سا اندھیرا ہے۔ شاید رات ہو رہی ہے۔ ابو ابھی تک نہیں آئے پلیز اللہ میاں! ابو کو بھیج دیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ سارے بچے رو رہے ہیں۔ کسی کے ابو نہیں آ رہے۔ پلیز کوئی مجھے یہاں سے نکالے۔ مجھے بھوک لگی ہے' مجھے کھانا کھانا ہے۔"

"اب بچے نہیں چیخ رہے۔ میں نے مریم کو آواز دی ہے' مگر وہ بولتی نہیں ہے۔ کشمالہ کہہ رہی ہے مریم مر گئی ہے اور اب وہ کبھی نہیں بولے گی۔ کشمالہ زور زور سے رو رہی ہے۔ مجھے بھی رونا آ رہا ہے۔ لکھا بھی نہیں جا رہا۔ اللہ میاں! پلیز ہمیں یہاں اکیلا مت چھوڑیں۔ ہمیں نکال لیں۔ یہاں بہت اندھیرا ہے۔" پڑھتے پڑھتے اس جوان کا گلا رندھ گیا۔

"احمت..... احمت.....!" افق باقیوں کو آوازیں دینے لگا' احمت اور جہنک بھاگتے ہوئے ادھر آئے۔

"آؤ جلدی کرو' یہ ملبہ ہٹاؤ۔ شاید مریم اور اس کی بہن زندہ ہوں۔"

وہ جانے کس امید پر پتھر ہٹانے لگا۔ شاید وہ لڑکی زندہ ہو' شاید وہ نہ مری ہو۔ اس نے یہ کاغذ یقیناً پتھروں کے درمیان سوراخوں سے اوپر پھینکا ہو گا اور وہ پتھروں میں پھنس گیا ہو گا۔

وہ تیزی سے ملبہ صاف کر رہے تھے۔ افق کے کپڑے مٹی اور گرد سے اٹ چکے تھے' سخت سردی کے باوجود پسینے آ رہے تھے۔ لاشوں کی تعفن زدہ بو ہر جگہ پھیلی تھی۔

تھوڑا نیچے ہی ملبہ ہٹانے پر انہیں ایک گوری چٹی' خوب صورت بچی کی لاش ملبے میں پھنسی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پنسل جکڑی تھی۔

افق کا دل خراب ہونے لگا۔ بمشکل خود پر قابو رکھے وہ جہنک اور احمت کے ساتھ اس بچی کی لاش نکالنے لگا اس کی کچلی ہوئی ٹانگ پر ایک بھاری پتھر تھا۔ وہ تینوں جھک کر وزنی پتھر اٹھانے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ اس پل زمین نے ایک زوردار جھٹکا کھایا۔

اس سے قبل کہ ان میں سے کوئی سیدھا ہوتا' کمرے کی آدھی کھڑی چھت زور سے ان پر آن گری۔

☆ ☆ ☆

"سر! میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے' مجھے اس پر پچھتاوا نہیں ہو گا۔" اپنے استعفیٰ پر ڈاکٹر واسطی کے تحفظات سن کر وہ اطمینان سے مسکرا کر بولی۔

"اس کے باوجود اگر آپ کبھی واپس آنا چاہیں تو ہمارے ہاسپٹل کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔"

"شیور' مگر پتہ نہیں اب واپسی کب ہو۔ شاید میں ابروڈ چلی جاؤں۔ اینی ویز' آپ کا شکریہ سر!"

وہ اپنا استعفیٰ دے کر وہاں سے چلی آئی۔ آج اس کا پمز میں آخری دن تھا اسے کل سے وہاں نہیں آنا تھا۔ ان آخری چند گھنٹوں میں وہ تمام مریضوں کو مکمل توجہ دے رہی تھی۔

رات میں وہ ڈاکٹر کامران کے ہمراہ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہونے والے اس شخص کی مرہم پٹی کر رہی تھی' جس کو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے نرس سے خون چڑھانے کو کہا تھا۔

"بلڈ لگا دیا ہے؟"

پریشے نے قریب آتی نرس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"جی' او پازیٹو لگایا ہے۔"

"او نیگٹو نہیں تھا؟" وہ جاتے جاتے کچھ سوچ کر پلٹی۔

"نہیں' او نگیٹو اور اے بی نیگٹو دونوں بلڈ بینک سے ختم ہو چکے ہیں۔"

وہ ڈاکٹر کامران کی طرف متوجہ ہوئی نرس سر جھکائے وہاں سے چلی گئی۔

"سسٹر! یہ انجیکشن لے آئیں اور اس نمبر پر فون کر کے اس آدمی کے گھر والوں کو اطلاع دیں۔" ڈاکٹر کامران نے کاغذ پر کچھ لکھ کر سر اٹھایا۔ نرس جا چکی تھی۔ پریشے وہاں کھڑی تھی' اس نے ان کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا۔

"سر! مجھے دے دیں' میں لے آتی ہوں۔" حالانکہ اس کے ڈیوٹی آورز ختم ہو چکے تھے' پھر بھی وہ نسخہ ان سے لے کر وہاں سے چلی آئی۔ انجکشن فارمیسی سے لے کر اس نے شاپر میں ڈالے اور پھر ریسپشن ڈیسک کی طرف آئی۔

"اس نمبر پر کال کرنی ہے۔" وہاں بیٹھی سسٹر شمائلہ کو وہ کاغذ پر لکھا نمبر دکھا کر سمجھانے لگی۔ اسی اثنا میں کسی نے اس کی پشت پر ہسپتال کا گلاس ڈور دھکیل کر کھولا۔ نرس سے بات کرتے کرتے اس نے ایک سیکنڈ کو پلٹ کر دیکھا۔ کیمو فلاج وردی والے فوجی تیزی سے اسٹریچرز اندر لا رہے تھے۔

"چچ..... پچ جانے اب کس کو ملبے سے نکالا ہے۔" وہ تاسف سے ان تینوں اسٹریچرز کو دیکھنے لگی جن پر خون میں لت پت نفوس پر سفید چادر ڈالی گئی تھی۔ سفید چادریں خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔

آگے والے اسٹریچر کو ایک فوجی دھکیل رہا تھا جسے اس نے شاید مظفر آباد میں بھی دیکھ رکھا تھا۔

"سنیں صاحب! کیا ہوا ہے؟ کون لوگ ہیں یہ؟" وہ یونہی کھڑے کھڑے پوچھنے لگی۔

"یہ ریسکیو ورک کر رہے تھے' ملبے سے لوگوں کو نکال ہی رہے تھے کہ آفٹر شاک آیا اور ان پر چھت گر گئی۔ ہمارا ایک جوان تو وہیں شہید ہو گیا تھا' ان تینوں کو ادھر لے کر آئے تھے مگر دو نے راستے میں دم توڑ دیا' تیسرا شدید زخمی ہے۔"

زخمی کا اسٹریچر وہی فوجی دھکیل رہا تھا۔ اس کے اپنے کپڑوں پر بھی خون لگا تھا اور وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

"چچ..... چچ یہ تو بہت برا ہوا۔ خیر اس زخمی کو اس طرف آگے راہداری میں لے جاؤ' وہاں ایمرجنسی ہے' اور یہ دو جو بے چارے مر گئے ہیں' ان کو..... سسٹر!" اس نے قریب کھڑی نرسوں کو اشارہ کیا جو مستعدی سے باقی دونوں اسٹریچرز کی جانب لپکیں اور انہیں دوسری جانب لے جانے لگیں۔ زخمی کا اسٹریچر باقی فوجی تیزی سے آگے راہداری میں دھکیلنے لگے۔

وہ واپس ریسپشن ڈیسک کی جانب پلٹی۔

"اس نمبر پر فون کر کے....." وہ نرس کو سمجھانے لگی، پھر تمام ہدایات مکمل کر کے، دوائیوں والا لفافہ ہاتھ میں پکڑے اس نے اپنے قدم وارڈ کی طرف بڑھا دیے جہاں ڈاکٹر کامران نے انجیکشن منگوائے تھے۔ دونوں نرسیں ڈیڈ باڈیز والے اسٹریچرز لے کر ابھی اسی طرف جا رہی تھیں۔

نرس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ایک نظر مر جانے والے ریسکیو ورکر پر ڈالی، جس کا چہرہ سفید چادر سے ڈھکا تھا، اور اس کے سینے کے مقام پر چادر کے اندر کوئی ابھری ہوئی شے رکھی تھی۔

اسے بہت سے کام کرنے تھے مگر یکدم جیسے اسے کوئی احساس ہوا تھا اس نے نرس کو روکا اور چادر ہٹائی۔

مرنے والے کا چہرہ اور جسم خون میں لت پت تھا۔

اس کے سینے پر رکھی چیز اس کی پی کیپ تھی۔

پریشے نے کیپ اٹھائی۔ نیلی پی کیپ خون سے سرخ ہو چکی تھی۔

"بے چارہ۔" افسوس سے سر جھٹک کر وہ کیپ کو واپس رکھنے ہی والی تھی کہ ایک دم کسی چیز نے اسے ٹھٹکنے پر مجبور کیا۔

اس نے کیپ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پچھلے حصے پر سفید رنگ سے، جو خون کے باعث گلابی ہو چکا تھا، ہاتھ سے لکھا تھا۔

"Hail to tayyip Erdogan"

زمین اور آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔

وہ بے اختیار لڑکھڑائی۔ کیپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔

"ہیل ٹو طیب اردگان؟" اس نے بے یقینی سے دُہرایا، پھر تیزی سے مرنے والے کا چہرہ اپنی جانب گھمایا۔

چوڑا جبڑا، گھنگھریالے سنہری بال۔

وہ افق نہیں تھا، حالانکہ وہ کیپ افق پہنتا تھا، مگر وہ کیپ افق کی نہیں تھی۔ وہ اس کے دوست جہنک یقین کی تھی۔

"جہنک، افق کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔" احمت کا فقرہ اس کے دماغ میں گونجا۔

مرنے والا یقیناً جہنک تھا، اور جہنک واقعی افق کے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا۔ اگر جہنک ادھر تھا تو افق کہاں تھا؟ اس نے سر اٹھا کر سامنے دوسری نرس کو دیکھا جو دوسری ڈیڈ باڈی والا اسٹریچر دھکیل رہی تھی۔

وہ تیزی سے اس اسٹریچر کی جانب لپکی اور پھر کانپتے ہاتھوں سے سفید چادر کا کونا پکڑا اس میں چادر ہٹانے کی ہمت نہیں تھی، وہ افق کو خون میں لت پت، لاش بنا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے چادر ہٹانی چاہی، مگر اس کی لرزتی انگلیوں نے حرکت نہیں کی۔ ان میں چادر ہٹانے کی ہمت ہی نہیں تھی۔

نرس نے جیسے کچھ سمجھ کر سفید کپڑا مرنے والے کے چہرے سے اتار دیا۔

اس کا سانس رک گیا۔ وہ افق نہیں تھا۔

وہ احمت دوران تھا، معصوم، کیوٹ سا احمت دوران جو بہت ہنسا کرتا تھا۔

"احمت..... اوہ گاڈ!"

اس نے بے اختیار اس کا خون میں لت پت چہرہ تھپتھپایا۔ وہ بے جان تھا۔ احمت مر چکا تھا۔

اس کی گردن ایک طرف کندھے پر ڈھلک گئی تھی۔

"نہیں..... احمت نہیں۔" وہ چیخ روکنے کو منہ پر ہاتھ رکھے دو قدم پیچھے ہٹی۔

دور کاریڈور کے دوسرے کنارے پر وہ فوجی اور وارڈ بوائے تیسرا اسٹریچر دھکیل کر لے جا رہے تھے۔

اسے یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ تیسرا کون تھا۔

وہ بے اختیار ان کی جانب بھاگی۔ دوائی کے لفافے کا ایک سرا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لفافہ ترچھا ہوا، چھوٹی چھوٹی شیشیاں ایک ایک کر کے اس

کے دوڑتے بدحواس قدموں کے ساتھ چمکتی ٹائلز پر گرنے لگیں۔ شیشیاں ٹوٹنے کی چھناکے دار آواز پر اردگرد کتنے ہی لوگوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا جو دوڑتے ہوئے کاریڈور کے دوسرے سرے تک آئی تھی۔

"رکو..... رکو....." اس کی ہراساں آواز پر جوان رکا۔ وہ لپک کر اسٹریچر تک آئی اور زخمی انجینئر کا چہرہ اپنی جانب کیا۔

وہ بند آنکھوں سے رک رک کر سانس لیتا افق ارسلان ہی تھا۔

"افق..... میرے اللہ! یہ تو بہت زخمی ہے۔ اسے فوراً ادھر لاؤ۔" وہ بدحواسی کے عالم میں ان کے ساتھ کانپتے ہاتھوں سے اسٹریچر گھسیٹتی، دھکیلتی ایمرجنسی تک لائی۔

"ڈاکٹر واسطی! سر پلیز اسے دیکھیں، جلدی کریں ورنہ یہ مر جائے گا۔" کسی اور طرف متوجہ ڈاکٹر واسطی کا بازو کھینچ کر وہ انہیں اس تک لائی تھی۔

"سر پلیز! جلدی کریں، اس کا خون بہے جا رہا ہے۔"

اس کا پورا وجود کسی سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

اسے ابتدائی طبی امداد دینے کے تھوڑی دیر بعد، ڈاکٹر واسطی ساتھ کھڑی نرس سے کہنے لگے "اس کا بلڈ بہت بہہ گیا ہے، اس کا گروپ چیک کریں اور بلڈ کا بندوبست کریں۔"

"بلڈ گروپ؟" پریشے نے چونک کر سر اٹھایا۔ مجھے پتہ ہے۔ اس کا گروپ او نیگیٹو ہے۔" کہہ کر وہ رکی نہیں بلکہ بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ تب اسے یاد آیا کہ بلڈ بینک میں او نیگیٹو تو ختم ہو چکا تھا۔ اوہ خدایا! اب وہ خون کہاں سے لائے؟ افق کو خون کی شدید ضرورت تھی مگر وہ کہاں سے لائے؟

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس کے کس عزیز رشتے دار کا گروپ او نیگیٹو ہے اور تب ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا۔

"سیف ہاں سیف کا گروپ او نیگیٹو ہے۔"

وہ دوڑتے ہوئے ریسپشن تک آئی۔ نرس کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اس نے تیزی سے ریسیور جھپٹا، کال ڈسکنکٹ کی اور لرزتی انگلیوں سے سیف کا نمبر ملانے لگی۔ وہ اس بری طرح ہراساں اور پریشان تھی، کہ اسے بھول گیا کہ اس کے اوور آل کی پاکٹ میں موبائل بھی رکھا ہے۔ اس سے تو سیف کا نمبر بھی نہیں ڈائل ہو رہا تھا۔

دماغ بری طرح ماؤف تھا۔

بمشکل نمبر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی پر سیف نے "ہیلو؟" کہا۔

"سیف..... سیف، تم پلیز ادھر پمز آ جاؤ۔ ایمرجنسی ہے۔ بلڈ چاہیے۔"

"کون پری؟ کیا ہوا؟ امی تو ٹھیک ہیں؟" سیف کا ذہن فوراً ماں کی جانب گیا تھا جو ہائی بی پی کی مریضہ تھیں۔

"ہاں وہ ٹھیک ہیں، مگر ایک پیشنٹ زخمی ہے۔ اس کا گروپ او نیگیٹو ہے۔"

"اوہ تو پیشنٹ ہے۔" وہ ریلیکس ہو گیا۔

"ہاں اور اس کو فوری بلڈ چاہیے۔"

"تو ہاسپٹل کے بلڈ بینک سے لے لو۔ زلزلے پر اتنے تو لوگوں نے خون دیا ہو گا۔"

"جو تھا، وہ لگا دیا گیا ہے۔ اگر ہوتا تو میں تم سے مانگتی؟" وہ جھنجلا گئی تھی۔ "تم..... تم بس فوراً ادھر آ جاؤ۔"

"پریشے! میں بزی ہوں۔ ہم ٹینڈر لینے کے لیے نگر زدے رہے ہیں۔ میں نہیں آ سکتا۔"

"سیف! خدا کے لیے، وہ مر جائے گا۔ اس کو فوری بلڈ چاہیے۔ تم پلیز آ جاؤ۔ پمز تمہارے آفس کے قریب ہی تو ہے۔" صرف افق کی زندگی کے لیے اس نے ایک دفعہ پھر اس کی منت کی۔

"میں نے کہا نا، نہیں آ سکتا۔ سارے شہر میں خون ختم تو نہیں ہو گیا ہو گا۔ کسی دوسرے ہسپتال سے پتہ کرو۔" وہ بے زار سا بولا۔

"مگر ہمیں فوری چاہیے۔"

"یار! کیا مسئلہ ہے؟ میں میٹنگ میں ہوں۔ اچھا گھنٹے تک آنے کی کوشش کروں گا۔"

"گھنٹے تک؟ اس کے پاس گھنٹہ نہیں ہو گا سیف! وہ مر جائے گا۔ خدا کے لیے سیف! وہ مر جائے گا۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ پلیز تم آجاؤ۔"

"تو میں نے تو نہیں زخمی کیا اسے؟ دیکھو مجھے اس سے ہمدردی ہے' وہ جو کوئی بھی ہے اور میں آبھی جاتا مگر اس وقت میں واقعی سخت بزی ہوں۔ مجھے دو کروڑ کا منافع مل رہا ہے اس ٹینڈر سے' میں یہ لوز نہیں کرنا چاہتا۔ پلیز اب مجھے تنگ مت کرو۔ بائے۔"

وہ ریسیور پکڑے ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

"نہیں' سیف کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ابھی میں اسے دوبارہ ایکسپلین کروں گی تو وہ فوراً آجائے گا۔" اس نے پھر سیف کا نمبر ڈائل کیا' اس نے کال کاٹ دی۔ اس نے پھر نمبر ملایا' اب کہ سیف نے موبائل آف کر دیا۔

پریشے کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

دو کروڑ' صرف دو کروڑ کے نفع کے پیچھے سیف کسی کی جان بچانے نہیں آسکتا تھا؟ وہ اپنے سیروں خون میں سے دو بوتلیں ایک زخمی کو نہیں دے سکتا تھا۔

دو بوتلیں۔

دو کروڑ۔

افق ارسلان دو کروڑ پاکستانی روپے سے بھی ارزاں تھا؟

سیف کے پاس چند لمحے بھی اس شخص کی زندگی بچانے کو نہیں تھے جو پریشے کی پوری زندگی تھا؟ وہ آپریشن تھیٹر میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیتا شخص اتنا بے وقعت تھا؟

"یا خدا! اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو وہ یوں زخمی ہو گیا؟ وہ اتنا اچھا انسان اندر مر رہا ہے اور تمہارے بنائے گئے دوسرے انسان اپنے نوٹ گننے میں لگے ہیں؟ کچھ کرو میرے اللہ! افق کو بچالو۔" دل ہی دل میں دعا کرتی وہ ریسپشن سے ہٹی اور واپس افق کے پاس آئی۔

وہ بیڈ پر چت لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ خون آلود خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کو آکسیجن ماسک لگا دیا گیا تھا۔ چند ڈاکٹرز اس کے زخمی جسم پر جھکے تھے۔

"بلڈ ملا؟" ڈاکٹر واسطی نے اسے آتا دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں سر!" اس نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلائی۔

اس کے زخم بہت شدید ہیں۔ اسے بلڈ مل گیا' تب بھی یہ شاید ہی بچے۔" وہ دوبارہ اس پر جھک گئے۔

"سر! آپ میرا سارا خون لے لیں' مگر...... مگر اسے بچالیں۔" وہ رو دینے کے قریب تھی۔

"آپ کا گروپ کیا ہے؟"

"او پازیٹو۔"

"مگر سسٹر کہہ رہی تھی پیشنٹ کا او نیگیٹو ہے۔ آپ کا بلڈ اسے نہیں لگ سکتا۔ ڈاکٹر پریشے! آپ کے ڈیوٹی آورز ختم ہو گئے ہیں' آپ جا کر گھر پہ آرام کریں۔"

اس نے ٹھیک سے ان کی بات سنی بھی نہیں اور باہر نکل آئی۔ کاریڈور میں زخمی کیپٹن جینک کھڑا تھا۔

"تمہارا بلڈ گروپ کیا ہے؟" ایک دم رک کر اس نے کیپٹن سے پوچھا۔

"بی پازیٹو۔"

پریشے کی آخری امید بھی دم توڑ گئی۔ وہ سبک رفتاری سے وہاں سے آگے چلی آئی۔ اسے دوسرے ہسپتالوں سے بلڈ منگوانا تھا' گو کہ یہ مشکل ہی تھا کہ بلڈ مل جاتا' مگر افق کے لیے اسے ہر کوشش کرنا تھی۔

بیچ کاریڈور میں اسے کسی نے روک لیا۔

"ڈاکٹر پریشے!" وہ سترہ اٹھارہ برس کا لڑکا تھا۔ جانی پہچانی شکل تھی۔

"آپ کو او نیگیٹو چاہیے؟" آپ ابھی فون پر کسی سے کہہ رہی تھیں۔ میرا۔ گروپ او نگیٹو ہے۔"

کسی نے اس کے مردہ وجود میں نئی روح پھونک دی تھی۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ لڑکے کا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی اسے آپریشن تھیٹر تک لائی۔

"سر! بلڈ مل گیا ہے۔ اس کا او نیگیٹو ہے۔"

آناً "فاناً" لڑکے کو ساتھ والے بیڈ پر لٹایا گیا۔ اس کی آستین اوپر کی' نالیاں جوڑیں۔

وہ ایک ایک قطرہ خون افق کی جلد میں پیوست سوئی کے ذریعے اس کے جسم میں داخل ہوتے دیکھ رہی تھی۔ وہ پلکیں نہیں جھپک پا رہی تھی۔ اسے لگا اگر وہ پلکیں جھپک گئی تو خون کی وہ بوتل غائب ہو جائے گی' منظر بدل جائے گا اور اسے بدل جانے والے منظر سے خوف آتا تھا۔

"پریشے! ریلیکس کریں۔ گھر جا کر سو جائیں۔ آپ پچھلے 48 گھنٹے سے ڈیوٹی کر رہی ہیں' خوامخواہ اس فارنر کے لیے ٹینس نہ ہوں۔" اس کی ہیجانی کیفیت اور اضطراب دیکھ کر ڈاکٹر واسطی نے گرین ماسک کے پیچھے سے کہا۔ وہ انہیں کیسے بتاتی کہ وہ اپنی زندگی کو یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ ایک وقت تھا جب اس شخص کی صرف ٹانگ زخمی تھی' اور وہ اس کے لیے چار راتیں ٹھیک سے لیٹ کر نہیں سو سکی تھی' اب بھلا کیسے جا سکتی تھی؟

خون بوند بوند افق کے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔ ای سی جی مشین پر اس کے دل کی دھڑکن آڑی ترچھی لکیروں سے ظاہر تھی' مگر پریشے کا دل اندر ہی اندر ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

اس سے مزید نہیں دیکھا گیا' وہ باہر چلی آئی۔

باہر کاریڈور میں وہ فوجی جوان اب نہیں کھڑے تھے' جانے وہ کہاں چلے گئے تھے۔ اس کا دوپٹہ فرش پر گرا پڑا تھا' اس نے وہ اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔

پھر کتنی ہی دیر وہ چمکتی ٹائلز والے کاریڈور میں ادھر ادھر ٹہلتی رہی۔ اس کا رواں' رواں کانپ رہا تھا۔ اگر افق کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گی؟ وہ کہاں جائے گی؟

"میرے اللہ...! اسے بچالو۔" دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو الفاظ لبوں پر ہی دم توڑ گئے' آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

اتنی اچانک یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ تو بہت خوش کن خیالوں میں گھری گھر جا رہی تھی' اسے تو ابھی کل سہ پہر کی تیاری کرنی تھی' اسے تو کل افق سے مارگلہ کی پہاڑیوں پر ملنا تھا' یوں ہسپتال میں تو نہیں۔ اس نے منع کیا تھا اسے کہ وہ اس سے ملنے ہمز نہ آئے' پھر وہ اس طرح ہمز کیوں آگیا تھا؟

اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ کب وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

زندگی ہمیشہ اس کے ساتھ ایسے کیوں کرتی تھی؟ اسے خوشیاں کیوں راس نہیں آتی تھیں؟ پچھلے تین برسوں میں افق ارسلان نام کی جو واحد خوشی اسے ملی تھی' وہ خوشی جو کل اس کی ہونے جا رہی تھی' وہ اتنی جلد کیوں اللہ اس سے چھین رہا تھا؟ اتنا قریب آکر وہ شخص کیوں پھر سے دور جا رہا تھا؟

وہ بہت دیر فرش پر بیٹھی بلک بلک کر روتی رہی تھی۔

"میں ضرور آؤں گا۔ تمہیں یاد ہے' راکاپوشی کی برف میں تمہارے آنسو گرے تھے' مجھے تمہیں وہ آنسو لوٹانے ہیں۔"

وہ ٹھیک کہتا تھا' وہ اسے آنسو لوٹانے صبح سے پہلے ہی واپس آگیا تھا۔

"اب رونا نہیں ہے' پری! آنکھیں صاف کرو۔"

صبح اس کا کہا گیا فقرہ اس کے ذہن میں گونجا۔ وہ کھڑی ہو گئی اور آنکھیں صاف کرتی اندر آگئی۔

لڑکا خون دے کر اٹھ چکا تھا۔ اپنی آستین نیچے کرتے ہوئے اس نے پری کو دیکھا تو رک گیا' پھر چند قدم چل کر اس کے قریب آیا۔ وہ اسے پہچان گئی تھی۔ وہ حسیب کا دوست تھا جس سے وہ اس روز بھی ہسپتال میں ملی تھی۔

"روئیں مت' وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کے قریب آ کر بہت آہستگی سے اس نے کہا۔ پری نے چونک کر بھیگا چہرہ صاف کیا۔

"اتنے عرصے بعد وہ آپ کو کھو جانے کے لیے نہیں ملا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے پہچان لیا ہے۔ یہ افق ارسلان ہے۔" وہ اتنی مدھم سرگوشی میں کہہ رہا تھا کہ پریشے کے علاوہ کوئی دوسرا اس کمرے میں اس کی بات نہیں سن سکتا تھا۔

"کیا واقعی وہ ٹھیک ہو جائے گا؟"

"جی اور اب میں آپ کو آپی بول سکتا ہوں؟" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

وہ نم آنکھوں سے ایک پل کو مسکرائی۔ اس کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔ بعض دفعہ بعض لوگوں کو ہم کتنا غلط سمجھتے ہیں۔

وہ اس کے قریب سے ہو کر نکل گیا۔ پریشے نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "سنو۔"

"وہ جاتے جاتے مڑا۔ "جی؟"

"تمہارا نام کیا ہے؟" وہ پھر بھول گئی تھی۔

وہ ہولے سے مسکرایا۔ "مصعب..... مصعب عمر۔" کہہ کر وہ رکا نہیں۔

وہ افق کے قریب چلی آئی۔ آس پاس کتنے لوگ موجود تھے' وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں افق کے چہرے اور بند آنکھوں پر جمی تھیں۔

وہ اس کے سرہانے کھڑی ہو گئی اور اس کا بایاں ہاتھ' جو زخموں سے کسی حد تک محفوظ رہا تھا' اپنے ہاتھ میں تھام لیا اس کی کلائی میں وہی گھڑی تھی۔ چوکور سیاہ ڈائل کے درمیان چمکتا ہیروں کا اہرام۔ ڈائل کا شیشہ البتہ چکنا چور ہو چکا تھا۔

اس نے بھیگی آنکھوں سے افق کا چہرہ دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ وہ آنکھیں کھولتا کیوں نہیں تھا؟ وہ کچھ کہتا کیوں نہیں تھا؟

"افق!" وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ "افق! اٹھو..... سونا نہیں ہے۔ سو گئے تو پھر نہیں جاگو گے۔ میں نے منع کیا تھا نا کہ سونا نہیں ہے' پھر کیوں سو رہے ہو؟ اٹھ جاؤ افق..... صرف ایک دفعہ اپنی پری کے لیے۔ دیکھو' پری تمہارے قریب ہے۔ وہ تمہیں پکار رہی ہے۔ پری کا نجات دہندہ کہاں ہے؟ وہ سو کیوں رہا ہے؟ اٹھو افق..... ! پلیز آنکھیں کھولو۔

اور تمہیں وائٹ پیلس کی وہ اونچی سیڑھیاں یاد ہیں' اور وہ موروں کا پنجرہ' جس میں مور ناچا کرتا تھا' اور کونے میں مورنی دبکی بیٹھی ہوتی تھی اور نیچے جھرنے پر وہ اداس گیت گاتی چڑیا' جھرنے کا پانی اور پتھروں پر ثبت ہمارے قدموں کے نشان' وہ سب تمہیں پکار رہے ہیں۔

تم نے کہا تھا' ہم پھر کبھی وائٹ پیلس گئے تو نیلی ٹائلوں والے اس فوارے کے پیچھے چھپایا گیا وہ ادھ کھایا بو گوشہ تلاش کریں گے۔ افق! اس سبز بو گوشے کو توتوں اور پرندوں نے نہیں کھایا۔ وہ سب تمہارے دوبارہ آنے کا انتظار کر رہے ہیں..... اٹھو افق! پری کے لیے ماہو ڈھنڈ کے نیلے پانیوں' اور چھو مولنگما کی چوٹی پر سنہری رتھ سے اترتی سورج کی پریوں کے لیے اٹھو..... شاید تمہیں وہ سب بھول گیا ہو' مگر وہ پریاں نہیں بھولیں۔ وہ آج بھی تمہیں یاد کرتی ہیں۔ ہمیں ایک دفعہ پھر ان کے پاس جانا ہے۔ ہمیں ایک دفعہ پھر ان پریوں کا رقص دیکھنا ہے۔ مجھے ایک دفعہ پھر وائٹ پیلس کی تیسری منزل کی بالکونی میں کھڑے ہو کر افق ارسلان کا گیت سننا ہے وہ گیت جس میں جامنی پہاڑوں پر جمی برف اور اناطولیہ کی گلیوں کا ذکر تھا۔ وہ گیت جس میں بچھڑنے اور وعدہ نبھانے کا ذکر تھا۔ مجھے وہ گیت پھر سناؤ نا افق..... ! پلیز اٹھو..... میں اب تم سے کوئی وعدہ' کوئی عہد نہیں لوں گی..... اب میں تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔ تمہیں اپنے اس عشق کا واسطہ جس کا اظہار تم نے کبھی نہیں کیا۔ اٹھ جاؤ۔"

اس کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر چہرے پر پھسلنے لگے تھے۔ وہ آکسیجن ماسک سے سانس لے رہا تھا' اس کے تنفس کی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ سامنے رکھی ای سی جی مشین پر لکیریں اشو کے پانی کی طرح مچلتی' اچھلتی' ڈوبتی اور پھر ابھرتی دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ ان لکیروں کو دیکھتی رہی۔ وہ اب اسے پہاڑوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ ان ظالم پہاڑوں کی طرح جو افق کی ماں کے بیٹے واپس نہیں لوٹاتے تھے۔ قراقرم اور ہمالیہ کے پہاڑ..... کوئی چھوٹے تھے' اور کوئی بڑے تھے کوئی وحشی اور کوئی قاتل' کوئی خونی اور کوئی ملکہ۔ وہ سب ایک جیسے تھے۔ ظالم اور خوب صورت۔ بہت ظالم اور بہت خوب صورت۔

"کیا بگاڑا تھا اس نے تمہارا؟ تم بہت ظالم ہو۔ تم سب بہت ظالم ہو انسانی خون کا خراج لیتے ہو۔ بہادر خون کا خراج۔"

اس کے اردگرد برف گر رہی تھی اور وہ دور تک پھیلے پہاڑی سلسلے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ افق اس کے سامنے لیٹا تھا اور وہ اسے کہہ رہی تھی۔ "افق! سونا نہیں ہے۔ خدا کے لیے سونا نہیں ہے ورنہ کبھی نہیں جاگو گے اٹھو' بس ایک دفعہ اپنی پری کو دیکھ لو۔ وہ آتے ہی ہوں گے..... بس وہ ابھی آجائیں گے۔ ہمیں ایک اور سفید رات نہیں گزارنی پڑے گی۔"

ماضی' حال سب آپس میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ قراقرم کے پہاڑ' اونچے نیچے سفید لکیروں کے پہاڑ اس پر ہنس رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ہر گزرتے پل وہ چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔ زمین میں دفن ہو رہے تھے اور آخر میں وہ یوں ہو گئے جیسے شاہراہ قراقرم برابر..... سب برابر تھا۔

"افق اٹھو..... ! خدا کے لیے اٹھو..... یہ اٹھتا کیوں نہیں ہے؟ یہ بولتا کیوں نہیں ہے؟ اسے اٹھاؤ۔ خدارا! کوئی اسے اٹھائے۔ میں نے راتوں کو جاگ کر خدا سے اس کی خیریت مانگی ہے۔ اور..... اور یہ بولتا نہیں ہے؟ آنکھیں نہیں کھولتا۔ کیوں نہیں کھولتا؟ وہ اس کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی' اسے اٹھانے جگانے کی کوشش کرنے لگی۔ کسی نے پیچھے سے اس کا بازو پکڑ کر روکنا چاہا۔

"ایسے مت کرو پریشے!"

"اسے اٹھائیں ڈاکٹر! واسطی! یہ اٹھ کیوں نہیں رہا؟ اسے کہیں' سونا نہیں ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ میں نے ہیلی کاپٹر دیکھا ہے۔ مجھے آواز آ رہی ہے۔ اسٹورم (طوفان) ختم ہو چکا ہے۔ آج آسمان صاف ہے یہ اٹھ کیوں نہیں رہا؟ اسے اٹھائیں' ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔" وہ رونے لگی تھی' ساتھ ساتھ اسے جھنجھوڑ بھی رہی تھی۔

"مت کرو پریشے! اسے مت ہلاؤ۔ وہ مر جائے گا۔" کوئی اسے کہہ رہا تھا۔

"وہ نہیں مرے گا۔ وہ نہیں مر سکتا۔ میں نے اپنے حصے کا گرم پانی اسے دیا تھا۔ میں نے اس کو دیکھنے کے لیے کئی دن برف میں پیدل سفر کیا تھا۔ سرد راتیں کاٹی تھیں مگر اسے گرم میں سلایا تھا۔ بارہ گھنٹے برفانی طوفان میں اس مرتے ہوئے آدمی کو اپنی کمر پر اٹھا کر نیچے لائی تھی' پھر بھی آپ کہتے ہیں وہ مر جائے گا؟ اللہ اتنا ظالم نہیں ہے۔ وہ اسے کیوں مارے گا؟ اس نے کیا بگاڑا تھا کسی کا؟ وہ نہیں مر سکتا۔ افق نہیں مر سکتا اسے اٹھاؤ' خدارا! کوئی اسے اٹھائے اور کہے کہ میری بات کا جواب دے..... وہ نہیں مر سکتا..... میں نے خون لا کر دے دیا تھا اسے..... پھر..... پھر کیوں مرے گا وہ؟"

وہ زمین پر گھٹنوں کے بل گر کر' اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

وہ ایک دفعہ پہلے ہسپتال کے کمرے میں جاگی تھی تو اکیلی تھی۔

آج پھر زندگی اسی موڑ پر آ گئی تھی۔ وہ پھر سے ہسپتال کے کمرے میں تھی' وہ پھر سے اکیلی ہونے جا رہی تھی۔ وہ اس کو چھوڑ کر جا رہا تھا' بستر پر لیٹا شخص مر رہا تھا' اور وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

روتے روتے اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بہت سے لوگ افق پر جھکے ہوئے تھے۔ کوئی اسے کمرے سے

جانے کو کہہ رہا تھا مگر وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی۔

"افق... ! تمہیں کچھ نہیں ہوگا.... پلیز آنکھیں کھولو.... مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ میں مرجاؤں گی۔"

وہ پھر سے اس کے سرہانے کھڑی ہوگئی۔ وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

"ڈاکٹر واسطی.... سر! یہ بچ جائے گا نا؟ اسے کچھ نہیں ہوگا نا؟" آنسوؤں سے اس کا پورا چہرہ بھیگ چکا تھا' وہ بکھری بکھری سی' روتے ہوئے ڈاکٹر واسطی سے پوچھ رہی تھی۔

"شاید۔" کسی ڈاکٹر نے کہا۔ وہ شیور نہیں تھے۔ وہ پرامید بھی نہیں تھے۔

"افق !" وہ اس کے چہرے پر جھکی۔ "افق! آنکھیں کھولو پلیز افق !" وہ اسے پکار رہی تھی' مگر وہ آنکھیں نہیں کھول رہا تھا۔ ای سی جی مشین پر ابھی سیدھی لکیر نہیں آئی تھی۔

"افق.... ! تمہیں تمہارے عشق کا واسطہ ہے' آنکھیں کھول دو...." وہ آہستہ سے' شاید دل میں ہی کہہ رہی تھی' مگر اسے لگا' اب افق نے سن لیا ہے۔

بہت آہستہ سے اس نے ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں۔ وہ نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں کوئی جذبہ' کوئی تاثر' کچھ نہ تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

"یہ پھر سے کیوں بے ہوش ہوگیا ہے؟" اس نے بے اختیار اس کا چہرہ تھپتھپایا' مگر اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ "یہ.... یہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا؟"

"ریلیکس پریشے... ! اب وہ خطرے سے باہر ہے۔" پتہ نہیں کس نے کہا تھا' وہ تو بس اس کی بند آنکھوں کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"اسے اٹھائیں.... اسے کہیں' یہ آنکھیں کھولے۔"

"پریشے ! اب وہ ٹھیک ہے۔ وہ سو رہا ہے۔" ڈاکٹر واسطی نے اسے شانوں سے پکڑ کر افق کے قریب سے ہٹانا چاہا۔

"وہ سو رہا ہے؟" اس نے بے یقینی سے دہرایا۔ "وہ.... وہ بچ جائے گا نا؟"

"ہاں' وہ بچ جائے گا۔ تم باہر جاکر بیٹھو۔"

مگر وہ پھر بھی اس کے سرہانے کھڑی رہی۔ اس نے ابھی تک افق کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی۔ بس وہ خوف زدہ نگاہوں سے ای سی جی مشین پر ابھرتے' ڈوبتے پہاڑوں کو دیکھتی رہی۔' وہ اب ٹھیک سے چل رہے تھے۔ اب انہیں سیدھی لکیر نہیں بننا تھا۔

ایک سکون سا اس کے رگ و پے میں اترنے لگا۔

اس کا افق زندہ تھا' وہ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں گیا تھا' وہ اس کے قریب ہی تھا۔ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر نڈھال سی وہیں فرش پر گھٹنوں کے بل گر گئی۔ وہ کتنی دیر افق کے سرہانے روتی رہی تھی؟ اسے وقت گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلا تھا۔

اور تب اس نے ڈاکٹرز کو دیکھا' وہ افق کا بایاں پاؤں کاٹ رہے تھے۔

"یہ.... کیا....؟" وہ سانس نہیں لے سکی۔

اس کا بایاں پاؤں بری طرح کچلا گیا تھا' اور وہ سب اسے بہت آرام سے کاٹ رہے تھے۔ وہ ان کے ہاتھ روکنا چاہتی تھی' ان کی منت کرنا چاہتی تھی کہ خدارا' وہ افق کا پاؤں نہ کاٹیں' اگر اس کا پاؤں کٹ گیا تو وہ گھوڑا کیسے دوڑائے گا؟ پہاڑوں پر کیسے چڑھے گا؟ کوہ پیماؤں کو اپنے انہی قدموں پر ہی تو ناز ہوتا ہے' اور وہ سفاک ڈاکٹرز افق ارسلان سے اس کے قدم چھین رہے تھے۔

"نہیں' خدا کے لیے ایسا نہیں کرو' وہ اپنا ادھورا وجود دیکھ کر مرجائے گا۔" وہ انہیں روکنا چاہتی تھی مگر روک نہیں سکی۔

باہر صبح طلوع ہو رہی تھی' چڑیوں نے مدھر نغمے گانا شروع کردیے تھے۔ وہ طویل سیاہ خوفناک رات اب ختم ہوچکی تھی۔ ایک لمبی مسافت اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

ڈاکٹرز کافی دیر ہوئی وہاں سے جاچکے تھے۔ افق اب ٹھیک تھا۔ اس کو آکسیجن ابھی تک لگی ہوئی تھی' لیکن اب خطرے والی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ اٹھ کر اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔

وہ پرسکون سا سو رہا تھا' اس بات سے بے خبر کہ اس کا پاؤں کٹ چکا تھا۔

پریشے نے تھکی تھکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا اور پھر بے اختیار اس کے ماتھے' اس کے بالوں کو چھوا۔ وہ اس کی موجودگی کا یقین کرنا چاہتی تھی اور اب اسے یقین آچکا تھا۔

"میں اب تمہیں کبھی ہمالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں میں نہیں جانے دوں گی۔ میں دنیا کے بہترین ہسپتالوں میں تمہارا علاج کراؤں گی' ایک دن تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ پھر ہم ترکی چلے جائیں گے۔ اور ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ ہمیں اب زندگی بھر ان ظالم پہاڑوں کی شکل نہیں دیکھنی۔ ان پہاڑوں نے احمت کو' ارسہ کو اور جینک کو ہم سے چھین لیا ہے' اب ہم ان میں کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ مجھے ہمالیہ کی عظیم چوٹیوں کی قسم ہے' میں تمہیں پھر کبھی ادھر واپس نہیں آنے دوں گی۔"

اس نے افق کی ایک طرف رکھی جیکٹ کی جیب سے وہ نیلا اور سبز' دو رنگا پتھر نکالا جس پر درمیان میں لکیر پڑی تھی۔ وہ اس پتھر کو دیکھ کر ادا سی سے مسکرادی۔ اسے بہت کچھ یاد آگیا تھا۔

وہ جانتی تھی' وہ اب کبھی گھوڑا نہیں دوڑا سکے گا' وہ اب کبھی پہاڑوں کا سفر نہیں کرسکے گا' لیکن پھر بھی' وہ خوش تھی' وہ پرسکون تھی۔

اس کی زندگی کا سیاہ باب ختم ہوچکا تھا۔ اب اسے ایک نئی زندگی کی شروعات کرنی تھیں۔

اس نے نرمی سے افق کے ماتھے پر آئے بھورے بال ہٹائے۔

قراقرم کی پری کو بالآخر اس کا کوہ پیما مل ہی گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

30 جون 2006ء

خوب صورتی سے آراستہ کمرہ مہمانوں سے بھرا تھا۔ یہ ہال نما کمرہ ایوان صدر میں اسی نوعیت کی تقاریب کے انعقاد کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہاں آٹھ اکتوبر کے زلزلے میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کے لیے تقسیم اعزازات کی ایک صدارتی تقریب منعقد تھی۔

تمام کرسیاں سیمی سرکل کی شکل میں بچھائی گئی تھیں۔ سامنے ایک پلیٹ فارم سا بنا تھا جس پر صدر صاحب کھڑے تھے۔ ایک طرف ڈائس رکھا تھا جس کے پیچھے موجود کمپیئر باری باری مائیک پر اعزازات وصول کرنے والوں کے نام پکار رہا تھا۔

سیمی سرکل میں کرسیوں کے دو اسٹینڈ تھے۔ دائیں طرف والا اسٹینڈ مقامی سول و فوجی افسران اور لوگوں سے بھرا تھا' جبکہ بائیں طرف تمام غیر ملکی بیٹھے تھے۔ ان میں اقوام متحدہ' امریکہ یورپ' چین' اور اسلامی ممالک سے تعلق رکھنے والے وہ تمام رضا کار شامل تھے جنہوں نے کشمیر کے زلزلہ زدگان کے لیے دن رات کام کیا تھا۔

بائیں طرف کی کرسیوں کی دوسری قطار میں بیٹھے تمام افراد سوائے ایک کے' خوب صورت نقوش والے ترک تھے جو آج بطورِ خاص حکومتِ پاکستان کی دعوت پر اسلام آباد آئے تھے۔

ان میں عروہ بلیم بھی تھی۔ گلابی رخسار اور شہد رنگ بالوں والی بہت پیاری سی سات سالہ بچی' جو اپنے والدین اور چھوٹی بہن کے درمیان پرجوش و آسودہ سی بیٹھی تھی۔ اس کے اور اس کی چھوٹی بہن کے ہاتھوں میں ایک ایک جھنڈی تھی جس کے ایک طرف پاکستان کا سبز اور دوسری جانب ترکی کا سرخ پرچم بنا تھا۔ سر پر اسکارف اوڑھے عروہ کی ماں کے ہاتھ میں تین سو ڈالر کا وہ چیک تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے صدر پاکستان نے اسٹیج پر عروہ کو بلا کر "جیوے پاکستان" سننے کے بعد اسے ذاتی طور پر تحفے میں دیا تھا۔

دوسری قطار میں بیٹھے افراد میں اور ہن یقین اور ان کی اہلیہ بھی تھیں۔ مسز یقین کی گود میں دھرے خوب صورت کیس میں جہنیک یقین کے لیے حکومت پاکستان کی طرف سے "ستارۂ ایثار" موجود تھا۔ وہ بار بار آنکھوں میں اُمڈ کر آتے آنسو پونچھتی تھیں۔

مسز یقین کے بائیں جانب' سیاہ بالوں کا فرنچ ناٹ بنائے' سنہری رنگت اور دراز قد کی حامل سلمٰی دوران تھی' جو مسلسل ضبط سے لب کاٹتی' پلک جھپکائے بغیر سامنے صدر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی جسے بار بار وہ اپنے اندر اتار لیتی تھی۔

سلمٰی کے پہلو میں' سیاہ ڈنر جیکٹ' سفید شرٹ اور سیاہ پینٹ میں ملبوس' بے تاثر نگاہوں سے سامنے دیکھتا افق ارسلان بیٹھا تھا' اس کے ساتھ پریشے تھی جو اس قطار میں واحد نان ترک تھی۔

آفٹر شاک کے اس حادثے میں افق کا بایاں پاؤں بری طرح کچلا گیا تھا جو پھر مجبوراً ڈاکٹرز کو کاٹنا پڑا تھا۔ وہ دو مہینے اسلام آباد میں ہسپتال میں داخل رہا تھا۔ پھر پریشے اسے علاج کے لیے امریکہ لے گئی تھی۔ مسئلہ صرف مصنوعی پاؤں لگانے کا نہیں تھا' مسئلہ افق کی ذہنی حالت کا تھا جو احمت اور جہنیک کو کھو دینے کے بعد بہت بگڑ گئی تھی۔ جب وہ ہسپتال میں جاگا اور اسے احمت اور جہنیک کی ڈیتھ کا علم ہوا تو پہلی بار پریشے نے اس اونچے لمبے مرد کو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تھا۔

اس کی ذہنی حالت کی بحالی کے لیے پریشے کو بہت محنت کرنا پڑی تھی۔ وہ دن رات اس کے ساتھ رہ کر' اسے زندگی کی طرف واپس لائی تھی۔ پھر انہوں نے افق کو جدید طرز کا پروستھیٹک فٹ لگا دیا تھا۔ شروع میں اسے چلنے میں دقت ہوتی تھی' مگر ان گزرے چھ ماہ میں وہ اس کا بہت عادی ہو چکا تھا۔ معمولی سی لنگڑاہٹ اس کی ٹانگ میں ابھی تک موجود تھی مگر وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جا رہی تھی۔ آج نہیں تو آج سے ایک سال بعد ہی سہی' اسے یقین تھا کہ وہ ویسے ہی چلنے لگے گا جیسے پہلے چلتا تھا۔ ہاں وہ جانتی تھی کہ وہ دونوں اب کبھی قراقرم میں نہیں جائیں گے۔

پانچ ماہ پہلے جب وہ اس کے ساتھ شادی کر کے اسے اپنے ہمراہ ترکی لے گیا تھا' تب دونوں نے ایک وعدہ کیا تھا' اور یہ وعدہ لینے والا افق خود تھا۔

"پری! ہم آج ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں۔ آج کے بعد ہم کبھی قراقرم میں واپس نہیں جائیں گے۔ مجھے اب ان پہاڑوں کو کبھی نہیں دیکھنا جنہوں نے مجھ سے میرے بہترین دوست چھین لیے۔"

اور پھر اس نے افق ارسلان کے ترکی میں ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھی تھی۔ اب وہ محض ایک جیولوجیکل انجینئر تھا اور دنیا کے بہت سے نارمل لوگوں کی طرح نائن ٹو فائیو جاب کرتا تھا' پہاڑوں سے وہ دونوں اس حد تک خائف تھے کہ وہ تو ماؤنٹ ارارت دیکھنے بھی نہیں گئے تھے۔ یہ شاید پہلی دفعہ تھا جب افق نے سیاحت اور کوہ پیمائی ترک کر کے مسلسل پانچ مہینے لگاتار آفس جا کر زندگی کو انقرہ کی گلیوں تک محدود کر دیا تھا۔ وہ دونوں کوہ پیما نہیں' بلکہ ڈاکٹر اور انجینئر بن کر اس محدود زندگی میں بھی خوش تھے۔ ان کو اب کسی اور شے کی تمنا نہیں تھی۔ افق کی شدتوں بھری محبت اس کے لیے کافی تھی۔

ہاں بس پچھلے پانچ ماہ میں ایک بے کلی سی' ایک نارسائی سی اس کے وجود سے چھلکتی تھی۔ کہیں کوئی تشنگی رہ گئی تھی۔ وہ بہت غور بھی کرتی تو بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا' سیف اور پھپھو لوگوں نے شروع میں بہت شور مچایا' مگر پریشے نے سیف کے خون نہ دینے کی بات کو ایشو بنا کر منگنی توڑ دی تھی۔ ان لوگوں نے باتیں بھی بہت بنائیں' مگر اسے پروا نہ تھی۔ وہ پاپا کے تمام اثاثوں کا نگران ماموں کو بنا کر ترکی چلی آئی تھی۔ اب تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ نشاء کی بھی شادی ہو چکی تھی' حسیب اور اس کا وہ دوست مزید تعلیم کے لیے لندن جا چکے تھے۔ ہاں سب کچھ ٹھیک ہی تو تھا' پھر بھی اسے لگتا کہ کہیں کچھ نامکمل' ادھورا سا ہے۔

اپنی سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر اس نے ساتھ بیٹھے افق کے بائیں جوتے پر نگاہ ڈالی۔ اصل حقیقت سے لاعلم کوئی شخص اس کا جوتا دیکھنے پر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اندر موجود پاؤں مصنوعی ہے۔ پریشے نے جوتے سے نگاہیں ہٹا کر اس کے خاموش چہرے کو دیکھا۔

وہ ابھی تک سامنے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں جھلملاتی پرانے دنوں کی یادیں دیکھ سکتی تھی' وہ سنہرے پرانے دن' جب وہ تینوں انقرہ کی گلیوں میں بارش میں بھیگا کرتے تھے۔ جب تینوں کلاس ٹیسٹ میں چیٹنگ کرتے پکڑے جاتے اور ٹیچر احمت کی معصوم شکل اور بھولپن کے باعث اسے چھوڑ دیا کرتی تھی اور افق اور جہنیک کو سزا ملتی۔ بعد میں وہ اس سے خوب لڑتے تھے...... اور وہ دن جب افق اور جہنیک نے اپنا بھانڈا پھوڑنے پر احمت کو یخ پانی سے بھرے پول میں پھینک دیا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی میں ہاتھ پاؤں مارتا' چیخ رہا تھا' انہیں گالیاں دے رہا تھا اور وہ دونوں کھڑے ہنس رہے تھے اور پھر ہنستے ہنستے افق نے جہنیک کو بھی اندر دھکا دے دیا تھا۔ اب وہ دونوں پول کے اندر تھے اور وہ باہر ہنستے ہوئے اکیلا کھڑا تھا۔

آج پھر وہ اکیلا تھا۔

احمت نہیں تھا۔

جہنیک نہیں تھا۔

زندگی کے ہر سفر میں وہ اور جہنیک اکٹھے جاتے تھے۔ پہلی دفعہ جہنیک اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

روسٹرم پر کھڑا کمپیئر احمت دوران کی بیوہ کو بلا رہا تھا۔

سلمٰی بہت آہستگی سے اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دو فٹ اونچے پلیٹ فارم پر کھڑے صدر تک آئی اور احمت کا "ستارۂ ایثار بعد از شہادت" وصول کیا

پھر آنکھیں رگڑتی بمشکل خود پر ضبط کرتی واپس آئی۔
پھر افق حسین ارسلان کا نام پکارا گیا۔
وہ اپنی نشست سے اٹھا اور آہستہ سے چلتا ہوا اوپر اسٹیج تک آیا۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے صدر سے ہاتھ ملایا۔ صدر نے چند تعریفی کلمات کہتے ہوئے اس کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ افق نے سر جھکا کر اپنے بائیں پاؤں کو دیکھا' ہال میں موجود تمام مہمانوں کی نگاہیں اس کے قدموں میں جھک گئیں۔
افق نے بایاں پاؤں ہلکا سا اوپر کیا' پھر واپس زمین پر رکھتے ہوئے شانے اچکا دیے جیسے کہہ رہا ہو "میں کیا کر سکتا ہوں ؟" اس کے چہرے پر بے حد اداس مسکراہٹ رقصاں تھی۔
پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ صدر افق کے کوٹ پر ستارۂ ایثار لگا رہے تھے اور تمام سامعین و حاضرین اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر ایک بہادر ترک کے لیے تالیاں بجا رہے تھے۔ ان تالیاں بجانے والوں میں پریشے جہاں زیب بھی تھی جو آنکھوں میں نمی لیے بہت فخر سے افق کو دیکھ رہی تھی۔
"ہم مظفر آباد جا رہے ہیں۔" سہ پہر میں جب وہ مری میں اس بل کھاتی سڑک پر آگے پیچھے چلتے ہوئے اپنے ریسٹ ہاؤس کی جانب جا رہے تھے جہاں وہ سرکاری مہمان کے طور پر مقیم تھے' عروہ نے اپنی زبان میں سلمٰی کو بتایا اور آگے بھاگ گئی۔
ریسٹ ہاؤس پہاڑ کی چوٹی پر تھا' اس تک جاتی سڑک دیکھتے ہی دیکھتے بلند ہو جاتی۔ یہاں تک کہ ریسٹ ہاؤس کی خوب صورت عمارت تک پہنچ جاتی۔ پریشے کو سلمٰی کے ساتھ اس پتھریلی سڑک پر چلتے ہوئے بے اختیار مری مال روڈ یاد آئی جو اس سے بے حد مشابہت رکھتی تھی۔
"میں آ رہی ہوں۔" سلمٰی نے بھاگتی عروہ کو بلند آواز میں کہا۔ عروہ اب دوڑتے ہوئے افق سے بھی آگے نکل چکی تھی جو ان دونوں سے کافی اوپر ڈھلوان پر سر جھکائے' جیبوں میں ہاتھ ڈالے چڑھ رہا تھا۔
"تم مظفر آباد جا رہی ہو ؟" دونوں خاموشی سے چھوٹے چھوٹے قدموں سے اوپر چڑھ رہی تھیں' جب پریشے نے اداسی سے پوچھا۔ یہ بارش سے چند منٹ پہلے کا موسم تھا جو اسے ہمیشہ اداس کر دیا کرتا تھا۔
سلمٰی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
"مسٹر اینڈ مسز اور ہن یقین' اور عروہ کی فیملی' بمع ایک ترک مترجم اور ترک سفیر کے' مظفر آباد جا رہے ہیں۔ تمہارے سرکاری ٹی وی کا crew بھی ہو گا' وہ ستارۂ ایثار حاصل کرنے والے ترکوں پر ڈاکو منٹری بنا رہے ہیں جو آج شاید تمہارے سرکاری ٹی وی سے دکھائی جائے گی۔"
وہ دونوں سڑک کے کنارے سفید پتھروں کی باڑ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ افق ان سے کافی آگے' سڑک کے بلند ترین مقام پر کھڑا ہو گیا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ سر اٹھا کر اوپر سیاہ بادلوں سے ڈھکے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔
"لگتا ہے۔ بارش ہونے والی ہے۔" الفاظ اس کے لبوں میں ہی تھے کہ بادلوں نے برسنا شروع کر دیا۔
سلمٰی نے ہاتھ میں پکڑی گلابی چھتری کھول دی۔ پریشے رم جھم سے بچنے کو چھتری تلے سمٹ آئی۔
"تم آؤ گی مظفر آباد ؟" دونوں تیز ہوتی بوندا باندی میں اوپر چڑھ رہی تھیں۔
"اونہوں۔"
"کیوں ؟" سلمٰی یونہی بیچ سڑک میں رک کر اسے دیکھنے لگی۔ چھتری اس نے پکڑ رکھی تھی' پریشے بارش کے باعث اس کے اور قریب کھسک آئی۔
"میں پہاڑوں میں واپس نہیں جانا چاہتی۔"
"اور..... افق ؟" سلمٰی نے کہتے ہوئے گردن گھما کر سڑک کی بلندی پر دیکھا جہاں وہ اسی طرح کھڑا بارش میں بھیگ رہا تھا۔
"وہ بھی واپس نہیں جانا چاہتا۔"

سلمٰی نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم سب اپنی زندگیوں کی بہت بڑے نقصانات سے گزر چکے ہیں۔" پھر وہ اضطراری انداز میں لب کچلنے لگی۔
"جانتی ہو پری! یہ سب مظفر آباد کیوں جا رہے ہیں ؟" یہ سب نیلم اسٹیڈیم میں آرمی کے کیمپ کا وہ آخری خیمہ دیکھنا چاہتے ہیں' جہاں احمت اور جینیک نے اپنی آخری رات گزاری تھی۔ مگر میں..... میں مظفر آباد کی فضاؤں اور نیلم کے پانی سے پوچھنا چاہتی ہو کہ ہم سے بچھڑنے سے قبل وہ کیسا لگ رہا تھا؟ میں اس بچی کی قبر دیکھنا چاہتی ہوں جس کی لاش نکالتے ہوئے احمت خود لاش بن گیا۔ میں اس آخری خیمے کی مٹی پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رونا چاہتی ہوں' مجھے اس سرخ مٹی اور نیلم کے پانی میں اپنے آنسو گرانے ہیں۔"
چھتری ابھی تک ان کے سروں پر تنی تھی مگر سلمٰی کا چہرہ بھیگ چکا تھا۔
"افق' جینیک' کینین سمیت احمت کو جاننے والا ہر شخص یہ کہا کرتا تھا کہ وہ صرف شکل سے معصوم لگتا ہے' اور اندر سے بہت خبیث ہے۔ مگر میں تمہیں بتاؤں پریشے! میں نے اس کے ساتھ آٹھ سال گزارے ہیں'..... وہ..... وہ شخص اندر سے بھی بچوں کی طرح معصوم تھا۔" وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ چھتری اس کے ہاتھ سے پھسلنے لگی' پریشے نے فوراً" چھتری پکڑ لی۔
"میں چلتی ہوں۔" کچھ دیر بعد اس نے بھیگا چہرہ صاف کیا۔ "مجھے ایک آخری بار ہمالیہ کے آسمان تلے رونا ہے' ان تمام دوستوں کے لیے جو چوٹیوں سے لوٹ کر نہیں آئے۔ احمت دوران کے لیے..... ارسہ بخاری کے لیے..... جینیک یقین کے لیے۔"
"آج آخری دفعہ رو لو' پھر ہم ان ظالم پہاڑوں میں کبھی نہیں آئیں گے۔ آج شام ہم اپنا ماضی یہاں دفن کر کے جائیں گے۔"
سلمٰی کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "میں کوشش کروں گی۔" پھر وہ گردن گھما کر دور کھڑے افق کو دیکھنے لگی جس کا سیاہ کوٹ مکمل طور پر بھیگ چکا تھا۔
"افق !" سلمٰی نے پکارا۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ ہوائیں زور سے چل رہی تھیں۔ آواز اوپر تک نہیں گئی۔
"افق !" سلمٰی نے پھر آواز دی۔
افق نے گردن ترچھی کر کے نیچے ان دونوں کو دیکھا' پھر جیبوں میں ہاتھ ڈالے ڈھلوان سے نیچے اترنے لگا۔
"تم بارش میں کیوں بھیگ رہے تھے ؟ چلو چھتری کے نیچے آؤ۔" وہ مکمل طور پر بھیگ چکا تھا' بھورے بال ماتھے پر چپکے تھے۔ سلمٰی کی بات پر وہ ہولے سے مسکرا کر چھتری تلے آیا اور پریشے کے ہاتھ سے وہ لے لی۔
"میں چلتی ہوں۔" سلمٰی چھتری کے نیچے سے نکل کر برستی بارش میں اوپر سڑک پر چڑھنے لگی۔
وہ دونوں چھتری تلے کھڑے خاموشی سے اسے موسلا دھار بارش میں اوپر جاتے دیکھتے رہے۔ جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو افق نے چہرہ اس کی طرف کیا۔
"اب تم بیس سال بعد اپنے سفرنامے میں یہ لکھ سکتے ہو کہ جب تم اسلامی دنیا کے سب سے طاقتور ملک گئے تو اس کے "بادشاہ" نے تمہاری خوب آؤ بھگت کی وغیرہ وغیرہ۔"

وہ دھیرے سے مسکرایا اور گردن گھما کر دور دور تک پھیلی مارگلہ کی پہاڑیوں کو دیکھنے لگا۔ پریشے نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں ان پہاڑی سلسلوں کو دیکھا۔ ان تمام پہاڑوں سے دور' بہت دور' ہمالیہ' ہندوکش اور قراقرم کے پہاڑ شروع ہوتے تھے..... وہ ان کو وہاں سے نظر نہ آنے کے باوجود دیکھ سکتی تھی۔ وہ ان میں پھیلی دلکش وادیوں کو بھی دیکھ سکتی تھی' جہاں وائٹ پیلس کی سیڑھیوں کے ساتھ نصب پنجرے میں مقید وہ موروں کا جوڑا اس ترک گیت کو یاد کرتا تھا جو کبھی ایک شہد رنگ آنکھوں والا سیاح انہیں سنایا کرتا تھا۔ ماہو ڈھنڈ کے کنارے اگا سبزہ زار آج بھی اس گھوڑے کو یاد کرتا تھا جس سے کبھی قراقرم کی ایک پری اتری تھی۔

وہاں دور دور تک پھیلے پہاڑ تھے۔ پراسرار سیاہ پہاڑ جو اپنے ظالم چہروں پر سفید چادر کی بکّل مارے اپنے اندر ڈھیروں راز دفن کیے بہت تمکنت سے کئی صدیوں سے زمین پر سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان تمام پہاڑوں کے بیچ ایک ایسا پہاڑ بھی تھا' جس کی برف ابھی تک نہیں پگھلی تھی۔ وہ آج بھی بہت غرور سے' بہت تمسخر سے دنیا والوں کو دیکھ رہا تھا۔

لوگ اس پہاڑ کو کئی ناموں سے پکارتے تھے۔

راکاپوشی۔۔ The shining wall

دومانی۔

The mother of mist۔

پربتوں کی دیوی۔

قراقرم کا تاج محل

اس پہاڑ کا NW رج آج تک ناقابل تسخیر تھا۔ اسے 2005ء کے بعد پھر کسی نے سر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس نے گردن پھیر کر افق کو دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

"افق حسین ارسلان' ستارۂ ایثار' آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

اس کے اندازِ تخاطب پر وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"مجھے کافی عرصے سے اپنی زندگی میں ایک ادھورا پن محسوس ہوتا تھا۔ آج مجھے اس ادھورے پن کا راز مل گیا ہے پری!" وہ دونوں ابھی تک تیز بارش میں چھتری تلے کھڑے تھے۔

"ابھی تم سلمٰی کو کہہ رہی تھیں کہ ہم لوگ اب کبھی پہاڑوں میں نہیں جائیں گے۔" وہ کہتے کہتے رک گیا اور پریشے کو علم تھا کہ آگے وہ کیا کہنے والا تھا' وہ وہی کہنے والا تھا جس کا ادراک اس پر بھی بالکل ابھی ہوا تھا۔

"یاد ہے میں نے تمہیں راکاپوشی پر' ایورسٹ کی چوٹی پر اترتی سنہری پریوں کا قصہ سنایا تھا اور شاید تم نے یقین نہیں کیا تھا۔ مگر میں تمہیں بتاؤں پری! اساگرماتا کی چوٹی پر واقعی سونے کی بنی پریاں اترتی ہیں۔ میں نے انہیں دیکھا ہے اور میں نے تمہیں وہ دکھانی ہیں۔ میں ایک دفعہ پھر ایورسٹ جانا چاہتا ہوں' میں نہیں جانتا میں اس دفعہ بچ کر آؤں گا یا نہیں' مگر مجھے ایک دفعہ پھر چھومولنگما کی چوٹی پر کھڑے ہو کر نیپال اور تبت کو دیکھنا ہے۔ میں پھر سے پہاڑوں میں جانا چاہتا ہوں۔"

سرد ہوا کا تیز جھونکا چھتری اڑا کر لے گیا' مگر وہ چھتری کے پیچھے نہیں گئی۔ وہ اسی طرح بارش میں بھیگتی بہت غور سے افق کو دیکھ رہی تھی۔

"مگر ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم کبھی قراقرم نہیں جائیں گے اور اچھے بچوں کی طرح گھر میں رہیں گے۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم کوہ پیمائی چھوڑ دیں گے۔"

پریشے کی بات پر وہ مسکرا دیا۔ شہد رنگ آنکھیں چھوٹی ہو گئیں۔ اس نے ماتھے پر آئے' گیلے بھورے بال پیچھے کیے اور اس کو دونوں شانوں سے تھام کر خود سے قریب کیا' پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے بہت آہستہ آواز میں پچھلے کئی گھنٹوں سے سوچی جانے والی وہ بات کہی' جو بارش کے قطروں نے اور سیاہ بادلوں نے بھی سن لی تھی۔

"کیا کوہ پیمائی بھی کوئی چھوڑنے والی چیز ہے؟"

☆